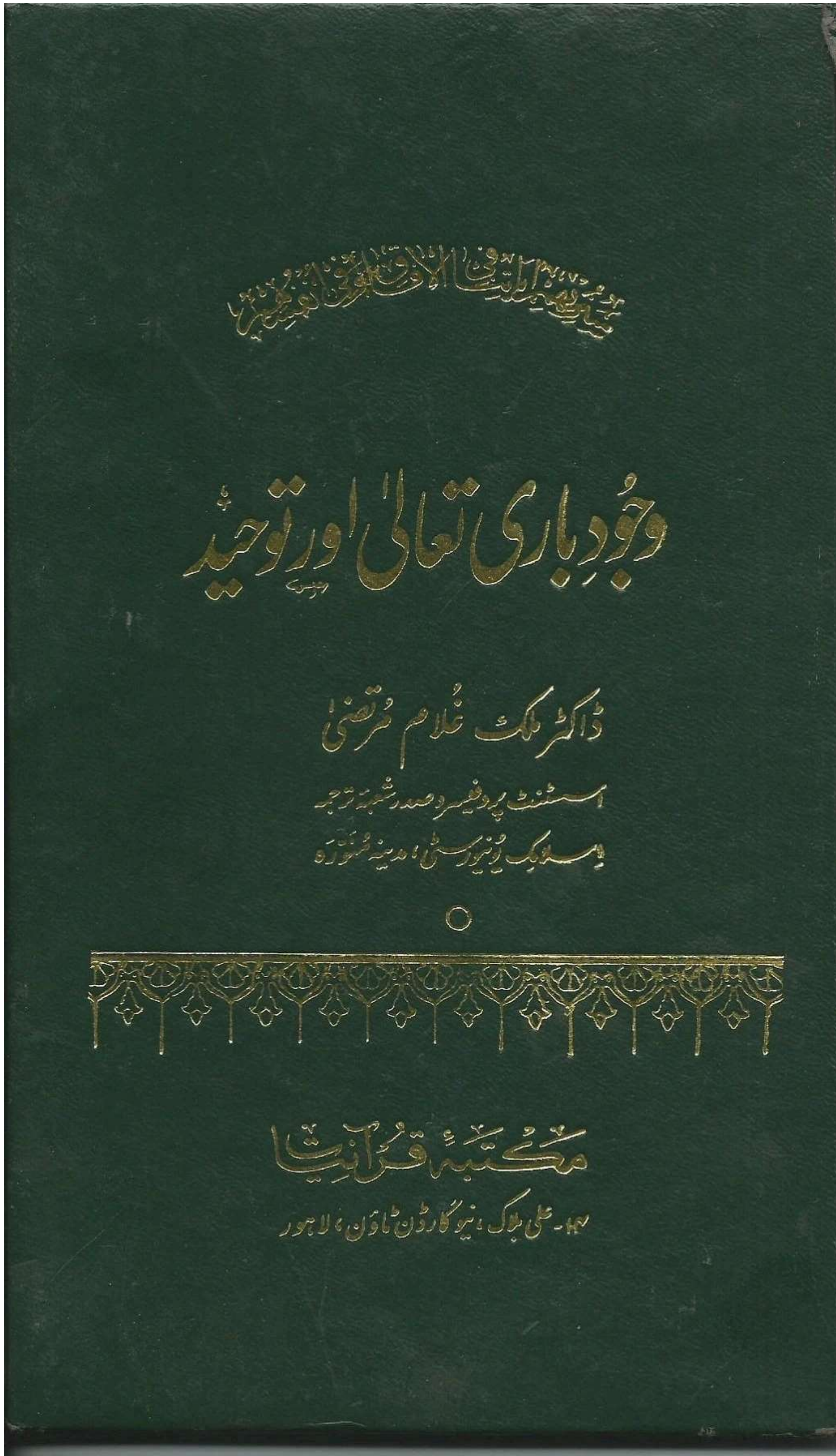

سنريهم آياتنا في الآفاق وفي أنفسهم
وجودِ باری تعالیٰ اور توحید
ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ
اسسٹنٹ پروفیسر و صدر شعبۂ ترجمہ
اسلامک یونیورسٹی، مدینہ منورہ
مکتبہ قرآنیات
علی بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

اِنتساب

اللہ جلّ جلالہٗ کے نام



؎

مری انتہائے نگارش یہی ہے
ترے نام سے ابتدا کر رہا ہوں



سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ

وجودِ باری تعالیٰ اور توحید

ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ

اسسٹنٹ پروفیسر و صدر شعبہ ترجمہ

اسلامک یونیورسٹی، مدینہ منورہ





مکتبہ قرآنیات

۱۴- علی بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

نام کتاب : ——— وجودِ باری تعالیٰ اور توحید

مصنّف : ——— ڈاکٹر ملک غلام مُرتضیٰ
پروفیسر جامعہ اسلامیہ، مدینہ مُنوّرہ

ناشر : ——— مکتبۂ قرآنیات، ۱۴۰-علی بلاک
نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور

مطبع : ——— رزقو پرنٹرز ۱۳/۱۹ ریٹیگن روڈ۔ لاہور

فوٹوآفسٹ : ——— اورئینٹ پروسیس لاہور



اشاعتِ ثانی (ترمیم و اضافہ شدہ) ——— اگست ۱۹۸۶ء

صفحات : ——— ۳۷۹

قیمت : روپے

کتابت : ——— محمد صدیق، چاہ میراں لاہور

فہرستِ مضامین

حوالہ جات کے بارے میں طریقِ کار

آئندہ صفحہ پر "کتابیات" کے تحت تمام متعلقہ کتب اور حوالہ جات کے تفصیلی کوائف درج کر دیئے گئے ہیں۔ ان کوائف میں ہر حوالے سے متعلق نام مُصنّف، نام کتاب، شہر، نام ناشر اور سنِ طباعت درج کر دیئے گئے ہیں۔ ہر کتاب کے لیے الگ اور مستقل سلسلہ نمبر مقرر کیا گیا ہے۔

چنانچہ جہاں کہیں کسی کتاب کا حوالہ دینے کی ضرورت پیش آئی ہے تو اس کتاب کے تمام کوائف بار بار نہیں درج کیے گئے بلکہ اس کتاب کا سلسلہ نمبر لکھ دیا گیا ہے اور اس کے بعد اس کتاب کا صفحہ نمبر دے دیا گیا ہے۔ اس سے وقت اور جگہ کی بہت بچت ہو گئی ہے۔ حوالہ جات کا یہ طریقِ کار تقریباً جدید ترین ہے اور مغربی ممالک کے تحقیقی اداروں میں مستعمل ہے۔

ایک مثال ملاحظہ ہو، حاشیہ میں حوالہ اس طرح سے درج ہوگا :

۷ : ص ۳۸

اس کا مطلب ہوگا کہ وہ کتاب یا حوالہ جو کتابیات کے سیریل نمبر ۷ پر درج ہے، اس کا صفحہ نمبر ۳۸ ملاحظہ ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

پیش لفظ

سیّدی و مولائی حضرت سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلسل اصرار بلکہ حکم پر میں نے یہ کتاب لکھی اس کا اکثر مواد اُنہی کی زیرِ نگرانی ترتیب دیا گیا تھا۔ بہاولپور میں قیام کے دوران موصوف نے اس کی تصحیح بھی فرمائی اور اسے جامعہ اسلامیہ کی طرف سے شائع کرنا چاہتے تھے مگر عمر نے اُن سے وفا نہ کی۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شُد
رُوئے گُل سیر ندیدیم و بہار آخر شُد

سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ چاہتے تھے کہ وجودِ باری تعالیٰ پر ایک ایسی کتاب جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے آنی چاہیے جس میں سابقہ کتب کی طرح منطقی خشکی نہ ہو اور نہ ہی فلسفیانہ مُصطلحات کی بھرمار۔ بلکہ خالص قرآنی انداز میں اس دَور کے جدید نیم خواندہ نوجوانوں کی تشکیک کا علاج کیا گیا ہو۔ قرآن مجید نے اپنا انداز اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ (حٰم سجدہ: ۵۳)

"عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ اُن پر یہ بات کھُل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔"

چنانچہ زیرِ نظر کتاب میں اَنفُس و آفاق سے وجودِ باری تعالیٰ پر دلائل دیئے گئے ہیں اور پُرانے منطقی اندازِ گفتگو کو یکسر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اس موضوع پر لکھی گئی اکثر کتابوں میں منطق استخراجیہ کا سہارا لیا گیا ہے اور کبریٰ وصغریٰ کی مدد سے نتائج تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ طرزِ استدلال نہ صرف ناقص ہے بلکہ نامانوس بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید میں یہ طرزِ استدلال کہیں بھی اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ فطرت اور عقلِ سلیم کو سیدھے سادے عام فہم انداز میں اپیل کیا گیا ہے۔ کائنات کو بطور ایک کھلی کتاب کے پیش کیا گیا اپنے اندر جھانکنے اور غور وفکر کی دعوت دی گئی اور اس انداز سے دنیا میں نظام، ترتیب، کمالِ خلاقی اور حسن وجمال کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ صاحبِ عقل انسان یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ :

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔ (المؤمنون : ۱۴)

ساتھ ہی ساتھ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ اندازِ گفتگو خشک ہونے کی بجائے دلچسپ ہو، اُسلوب فلسفیانہ اور منطقیانہ نہ ہو بلکہ ادبی اور شیریں ہو تاکہ بات ذہن کی تنگنائے سے ٹکرا کر واپس نہ آئے بلکہ دل کے اتھاہ سمندر میں جاگزیں ہو جائے۔

مجھے سعادت حاصل ہے کہ اس کتاب کو اصلاح ومشورہ کی خاطر پاکستان کے بعض اکابر علماء نے پڑھا اور میری مدد فرمائی۔ خدا کرے میری یہ کاوش خالصتاً اسی کی رضا کے لیے ہو اور وہ قبول فرمائے۔ اگر اس کتاب کے مُطالعہ سے نسلِ انسانی کا ایک فرد بھی اللہ تعالیٰ پر حقیقی ایمان سے بہرہ ور ہو گیا تو میری محنت بر آئی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الامی محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ

پیش لفظ طبع ثانی

وجودِ باری تعالیٰ کے طبعِ اوّل میں بعض اہم ابواب شامل نہ ہو سکے۔ ان کا مواد میرے پاس غیر مرتّب حالت میں مدینہ منوّرہ میں تھا۔ کتاب سامنے آئی تو شدّت سے احساس ہوا کہ کئی جگہوں پر تشنگی رہ گئی۔

ہر چند کہ کتاب میں تقریباً تیس مزید ابواب کا اضافہ کر رہا ہوں لیکن اب بھی یہی احساس ہے

ع ماہمچناں دراوّل وصفِ تو ماندہ ایم

وجودِ باری تعالیٰ کے ساتھ توحید کے اہم مبحث کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ دوستوں نے شدّت سے احساس دلایا کہ خدا کے وجود پر دلائل اپنی جگہ ضروری ہیں لیکن وہ لوگ جو وجودِ باری تعالیٰ کے قائل ہیں مگر توحید کے بارے میں ان کا ذہن صاف نہیں، کسی طرح سے بھی کم توجہ کے مستحق نہیں۔ یہ بات خاص طور پر جدید دَور کے مسلمان پر صادق آتی ہے۔

اب مجموعی طور پر کتاب مندرجۂ ذیل حصّوں پر مشتمل ہے:

۱۔ تخلیقِ کائنات

۲۔ نظامِ کائنات

۳۔ دلائلِ عقلیہ

۴۔ استدلالِ قرآنی

۵۔ کائنات کا تصوّرِ جدید

۶۔ دلائلِ متفرقہ

۷۔ التوحید

جن مباحث پر خصوصی زور دیا گیا ہے ان کا اجمالی خاکہ کچھ اس طرح کا ہے:

وجودِ باری تعالیٰ اور توحید پر قرآنی دلائل کا استقصاء کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آیاتِ انفس و آفاق کے ذریعہ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وجودِ خدا اور توحید انسانی فطرت کا تقاضا اور اس کے ضمیر اور عقلِ سلیم کی آواز ہے۔ خدا کا تصوّر اور بندے کے ساتھ اس کے تعلق کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ اسی حصہ میں قرآن مجید میں موجود ایسے حیران کُن سائنسی انکشافات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو وحی کی زبان میں چودہ سو سال پہلے بیان کیے گئے مگر آج جدید سائنسی تحقیقات نے انہیں حقائق ثابت کر دیا۔ اس طرح سے آج کے دورِ جدید سے متعلق چند ایسی اہم پیشین گوئیاں بھی شامل کر دی گئی ہیں جو محمد عربی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زبان مبارک پر آئیں اور دورِ جدید میں حیران کُن طور پر حرف بحرف پوری ہو گئیں۔ یہ سچّی پیش گوئیاں جہاں محمد عربی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے رسولِ صادق ہونے کا ثبوت ہیں وہاں یہ وجودِ خدا اور آخرت پر بھی دلائلِ قطعیہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

کائنات، خدا اور آخرت سے متعلق جدید سائنس کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ کائنات کا وجود ایک اتفاقی امر ہے، کسی حادثہ کا نتیجہ ہے یا کسی مُدبّر و حکیم خالق کا منصوبہ؟ یہ عالم ازلی و ابدی ہے، یا عارضی اور رُو بہ فنا؟ حادث ہے یا قدیم؟ جمادات، نباتات، حیوانات اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کیسے وجود میں آتے؟ کیا مادہ میں تخلیقی صلاحیت ہے؟ کیا دُنیا کی تمام چیزیں ازخود پیدا ہو گئیں؟ عدم میں ہونے کے باوجود اپنی خالق بن گئیں؟ کیا انسان نے اپنے آپ کو خود پیدا کیا ہے اور اپنے جسم کا سارا داخلی نظام وہ اپنی مرضی سے خود ہی چلا رہا ہے؟ اس کا کنٹرول ٹاور کہیں باہر تو نہیں؟ کیا کائنات میں نظم و ترتیب، تنوّع، حُسن و جمال، مظاہرِ ربُوبیّت، نعمتوں کا خوانِ کرم، مودّت و رحمت، جبلّت اور ہر طرف بکھرے ہُوئے تخلیقی فن پارے یُوں ہی وجود میں آ گئے۔ اس میں کسی کی تدبیرِ حکیمانہ اور حسنِ تخلیق کو دخل نہیں ہے؟ پھر دُنیا کے نظام میں وحدت، یکسانیت اور عمومیتِ قوانینِ فطرت کس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں؟ یہ کئی جہات سے تیز گردش کرتی ہوئی زمین، طویل سفر پر رواں نظام ہائے شمسی، یہ کانپتی ہوئی منظّم کائنات کروڑہا کروڑ سال سے کسی بے قاعدگی، بے ضابطگی کے بغیر کیوں چل رہی ہے اور تباہی

کے حادثہ کا شکار کیوں نہیں ہوتی؟ انتہائی پیچیدہ تخلیقی مراحل، انتہائی پیچیدہ نظام وضبط سیاروں کی انتہائی تیز گردشیں، ہر سیارہ اپنے اپنے مدار پر اپنی منزل کو رواں، کوئی بھی بال برابر اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا، کوئی بھی سیکنڈ برابر طلوع ہونے میں دیر سویر نہیں کرتا! یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ اس موضوع پر بہت سے معروف سائنسدانوں کی شہادتیں بھی اس حصہ میں شامل کی گئی ہیں۔

کتاب میں معروف عقلی دلائل شامل کیے گئے ہیں مگر حتی الوسع سادگی اور اختصار کے ساتھ فلسفہ اور علم الکلام کی مصطلحات کے بغیر بات کی گئی ہے۔ اس میں بُرہانِ تکوینی، بُرہانِ غائی اور بُرہانِ اخلاقی کچھ تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ شر کے وجود کی مصلحت بھی قوی دلائل و امثلہ سے بیان کر دی گئی۔ فلسفہ سے ہٹ کر وجودِ خدا پر بعض دل میں جاگزیں ہونے والی آسان و سادہ براہین بھی پیش کر دی گئی ہیں تاکہ عام قاری فائدہ اٹھا سکے۔ اس موضوع پر بعض ملاحدہ سے کچھ اہم گفتگوئیں بھی مختصراً درج کر دی گئی ہیں۔ قاری خود فیصلہ کرے گا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ وہ نیم خواندہ لوگ جو سائنس اور عقل کے نام پر غیر سائنٹفک اور بے عقلی کی باتیں کرتے ہیں اور اپنے جہلِ مرکب کو بڑے بڑے غلافوں میں چھپاتے ہیں، ان کا طلسم توڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کا آخری حصہ توحید سے متعلق ہے۔ توحیدِ ربُوبیت، توحیدِ اسماء وصفات اور توحیدِ الُوہیت تینوں پر الگ الگ بحث کی گئی ہے۔ طاغوت اور شرک کی حقیقت اور اسبابِ شرک تفصیلاً بیان کیے گئے ہیں۔ کلمۂ توحید لاالٰہ الا اللہ کی تفصیلی شرح کی گئی ہے۔ کلمۂ توحید کی علمی و عملی اہمیت بیان کی گئی ہے، وہ امُور بھی تفصیلاً لکھ دیئے گئے ہیں جن کے ہوتے ہوئے کوئی شخص بھی مسلمان نہیں رہ سکتا بلکہ وہ دائرۂ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے، خواہ اسے مسلمان بنے رہنے یا مسلمان کہلوانے پر کتنا ہی اِصرار کیوں نہ ہو۔

میں نے اس کتاب میں، جہاں بھی ضرورت محسوس کی، اہلِ علم کی طویل عبارتیں حوالوں سمیت جُوں کی تُوں نقل کر دی ہیں۔ اصل مقصد بھٹکے ہوئے نیم خواندہ لوگوں کو صحیح راستہ پر لانا ہے، اپنی علمی دھاک بٹھانا نہیں ہے۔ وجہ معلوم ہے کہ نہ مجھ میں علم ہے اور نہ ہی علمی دھاک کی توقع - ہاں وہ

ہستی جو اس کتاب کا موضوع ہے، اس کا قرب اور اسی کی رضا اصل مقصود ہے۔ اس کی نظرِ کرم ہی ساحلِ اُمّید ہے۔ وہ جانِ تمنّا ہے۔ اس کی محبّت حاصلِ زندگانی ہے۔ وہ رحمان و رحیم ہے، وہ رحمت و محبت کا مصدر و منبع ہے۔ وہ عفو و کرم اور محبّت کا سراپا ہے۔ اس نے کسی حال میں بھی اپنے آپ سے مایوس نہیں ہونے دیا۔ بس اس کی نظر چاہیے۔ میرے محبوب استاذ پروفیسر جلیل احمد صاحب (صدر شعبہ انگریزی، گورنمنٹ کالج ملتان) کا ایک خوبصورت شعر مناسب حال ہے:

امید کہتی ہے اک دم ادھر کو اُٹھے گی
خیال دیکھ رہا ہے تری نظر کا خرام!

بہر حال یہ ایک ادنیٰ طالب علم کی ادنیٰ سی کوشش ہے۔ اہلِ علم حضرات سے استفادہ کی توقع ہے۔

اس کتاب میں بہت سے غیر مسلم سائنسدانوں کی طویل عبارتیں نقل کی گئی ہیں۔ یہ درحقیقت جدید سائنس کی طرف سے وجودِ خدا پر شہادتیں ہیں اور وہ آفاقی دلائل ہیں جن کی طرف خود قرآن مجید مطالعہ و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ان عبارتوں کے نقل کرنے کا سبب ذہنی مرعوبیت نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں مغرب سے مرعوب ذہنوں کا علاج موجود ہے۔ یُوں سمجھیے کہ بزمِ مغرب سے چند جدید ترین آلاتِ موسیقی درآمد کیے ہیں اور کچھ صاحبِ دل غزل سرا بھی۔ مگر جب راگ چھیڑا گیا تو یُوں صدا آئی:

بشنو از نَے چوں حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کُند

اہلِ علم کے سامنے معذرت ہے کہ اس کتاب میں انہیں کہیں کہیں بعض دلائل کا تکرار محسوس ہوگا یہ مَیں نے جان بُوجھ کر کیا ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ یہ کتاب مَیں نے دراصل ان نوجوانوں کے لیے لکھی ہے جو علومِ جدیدہ کے چند گھونٹ پیتے ہی بہک اُٹھتے ہیں، دین سے ناواقف ہیں، تیراکی نہیں جانتے لیکن فلسفہ اور جدید عمرانی علوم کے سمندر میں جا گھُستے ہیں۔ ذرا سا گہرا پانی آتا ہے تو ڈبکیاں لینے

لگتے ہیں۔اس کتاب میں جہاں اُن ڈوبتے ہوؤں کو سہارا دینے کی کوشش کی گئی ہے وہاں قرآن وحدیث کی روشنی میں وجودِ خدا اور توحید پر دلائل و براہین کے ذریعے انہیں "تیراکی کا فن" سکھانے کی بھی کوشش کی گئی ہے تاکہ اپنے ساتھیوں کو بھی ڈوبنے سے بچاسکیں۔اس کام کے لیے کئی مرتبہ بعض اہم اور مؤثر دلائل کو مختلف اسالیب سے بار بار پیش کیا گیا ہے۔تکرار کا یہ اُسلوب قرآن مجید میں بھی نظر آتا ہے کہ ایک مشکل مگر اہم بات کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا جاتا ہے تاکہ وہ دل میں اُتر جائے۔

مجھے سعادت حاصل ہے کہ اس کتاب کے مسودہ کو پاکستان کے بعض اکابر علماء نے پڑھا اور میری مساعدت فرمائی۔میں خاص طور پر مندرجۂ ذیل حضرات کا بے حد ممنون ہوں۔

۱۔استاذی المکرّم حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب دامت برکاتہم سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ بہاول پور۔

۲۔استاذی المکرّم حضرت مولانا محمد ناظم ندوی صاحب مدّظلّہ العالی سابق شیخ الجامعہ بہاول پور، و شیخ الادب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ۔

۳۔استاذی المکرّم پروفیسر ایم سعید شیخ صاحب مدظلہم، ڈائرکٹر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔لاہور

۴۔الاستاذ المکرّم حضرت مولانا پروفیسر عبدالحفیظ چوہدری صاحب، چیئرمین شعبۂ علومِ اسلامیہ انجینئرنگ یونیورسٹی۔لاہور

میں اپنے سٹینوگرافر جناب شوکت صاحب، بیٹی صفیہ، بیٹی میمونہ اور بیٹے حافظ محمد زید کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے کتاب کے مسودے کی کتابت و تصحیح کا کام کیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائیں اور اس کام کو خالص اپنی رضا کے لیے قبول فرمالیں۔وما توفیقی الّا باللہ العلیّ العظیم وآخر دعوانا انِ الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسّلام علیٰ خاتم المرسلین محمد وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ

اسلامک یونیورسٹی۔مدینہ منورہ ——— ۲۶ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ

حصّہ اوّل

تخلیقِ کائنات

یہ کائنات کس طرح وجود میں آگئی؟ کیا یہ ہمیشہ سے موجود ہے یا اس کی کوئی ابتدا بھی ہے؟ اگر یہ عدم سے وجود میں آئی ہے تو کیا اتفاقاً وجود میں آگئی ہے یا کسی طے شدہ منصوبے کے تحت وجود میں آئی ہے؟

یہ سوالات سوچنے سمجھنے والے انسان کے ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ ایک انسان کی اس کائنات میں کیا حیثیت ہے؟ اسے کس ڈھب سے زندگی گذارنی ہے؟ ان باتوں کا مندرجہ بالا سوالات سے گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی فکر کی تاریخ میں وجودِ باری تعالیٰ سے زیادہ اہم اور زیادہ دلچسپ موضوع اور کوئی نہیں رہا ہے۔

بعض لوگ جو خدا کے وجود سے انکار کرتے ہیں، تخلیقِ کائنات کے بارے میں کچھ اِس قسم کے نظریات رکھتے ہیں:۔

"یہ کائنات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ ازلی ہے۔ اس کی کوئی ابتدا نہیں۔ ہر لمحہ اس میں ارتقائی اور تخلیقی عمل ہو رہا ہے اور اس ارتقائی اور تخلیقی عمل کی صلاحیت خود مادّہ میں موجود ہے۔

بعض لوگوں کے نزدیک اس کائنات کی ابتدا تو یقینی ہے لیکن ان کے خیال میں یہ خودبخود کسی حادثہ یا اتفاق کے طور پر وجود میں آگئی ہے۔ کسی مدبّر حکیم اور خالق کا اس کے بنانے میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اسی طرح اس کائنات کا جو نظام چل رہا ہے وہ بھی محض اتفاقات پر مبنی ہے۔

ان دونوں نظریات کے برخلاف انسانوں کی عظیم اکثریت ہر زمانے میں ایک خدا کے وجود کو مانتی چلی آئی ہے اور اسی کو اس کائنات کا خالق، مالک، منتظم اور مدبّر قرار دیتی ہے۔ تمام انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام وحیِ الٰہی کی بنیاد پر اسی عقیدہ کی تبلیغ کرتے چلے آئے ہیں۔

باب اوّل:

حادثہ یا منصوبہ؟

کسی بے آب و گیاہ جنگل میں اگر ایک کٹیا نظر آجائے تو مسافر فوراً یقین کر لیتا ہے کہ اس کٹیا کو آباد کرنے والا ضرور موجود ہے۔ رابنسن کروسو نے جب ایک غیر آباد جزیرے میں انسان کے قدموں کے نشانات دیکھے تو اسے ایک لمحے کے لیے بھی شک نہ گذرا کہ یہ نشان آپ سے آپ وجود میں آگئے ہونگے اور اس غیر آباد جزیرے میں کوئی انسان نہیں ہوگا بلکہ اس کا دل ایک آدم زاد ساتھی کے مل جانے کی توقع پر بے حد مسرور و شاداں تھا۔

تہ بہ تہ آسمان، اس میں سورج، چاند اور تارے ایک لگے بندھے نظام میں مدت سے اس طرح چل رہے ہیں کہ کہیں کسی حادثہ کی نوبت نہیں آتی۔ اگر اس انتظام میں کہیں معمولی سی خرابی بھی ہو جاتے تو تمام سیارگانِ فلک آپس میں ٹکرا جائیں اور ساری کائنات پاش پاش ہو جائے۔

سورۂ یٰس میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے:

وَآيَةٌ لَّهُمُ اللَّيْلُ ۔ نَسْلَخُ مِنْهُ
النَّهَارَ فَإِذَا هُم مُّظْلِمُونَ ۔ وَالشَّمْسُ
تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۔ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ
الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۔ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ
مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ۔
لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ
الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ
وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۔

ان کے لیے ایک نشانی رات ہے، ہم اس
میں سے دن نکالتے ہیں جبکہ وہ اندھیروں میں
گم ہوتے ہیں۔ سورج اپنے مدار پر رواں دواں
ہے۔ یہ منصوبہ ہے ایک زبردست اور باخبر
ہستی کا۔ اور چاند کی ہم نے منزلیں مقرر کی ہیں
یہاں تک کہ کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح باریک
رہ جاتا ہے۔ نہ سورج سے یہ ہو سکتا ہے کہ چاند
سے جا ٹکرائے اور نہ رات دن سے سبقت کر

(یٰسٓ: ۳۷تا۴۰) سکتی ہے (اپنے مقررہ وقت سے آگے پیچھے نہیں ہوسکتے، تمام سیارگان فلک اپنے مقررہ راستوں پر چل رہے ہیں (اس سے سرمُو انحراف نہیں کرسکتے)۔

سُورج، چاند اور ستاروں کا ایک مقررہ راستہ ہے اور وہ اس سے سرِمُو اِدھر اُدھر نہیں ہوسکتے۔ نہ سُورج چاند کے مدار میں داخل ہوسکتا ہے، اور نہ چاند سُورج کے مقررہ راستے کو اختیار کرسکتا ہے۔ نہ کبھی دن اپنے مقررہ وقت سے پہلے شروع ہوتا ہے اور نہ رات کبھی اپنے وقت سے پہلے یا بعد شروع ہوتی ہے۔ ہر کام ایک خاص پروگرام کے تحت، ایک عظیم منصوبہ کے تحت چل رہا ہے۔

ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۔ یہ ایک بہت ہی زبردست اور بہت ہی باعلم ذات کا منصوبہ ہے۔ (یٰسٓ: ۳۸)

دنیا میں کہیں بھی ہمیں اچھی عمارت، خوبصورت باغ، عمدہ فیکٹری، یا کوئی اور قسم کا عمدہ خاکہ یا نقشہ یا منصوبہ دیکھنے میں آتے تو سب سے پہلے خیال اسی بات کی طرف جاتا ہے کہ "عمدہ انجینئر ہے"۔ "قابل مالی ہے"۔ "بہت ہی لائق نقشہ ساز اور منصوبہ ساز ہے"۔ یہ ہمیں کیا ہوگیا کہ آسمان اور زمین کے درمیان ہر طرف انتہائی عمدہ خاکے اور تخلیقی شاہکار بکھرے ہوتے ہیں اور ہمارے دل کی گہرائیوں سے یہ نغمہ نہیں اُبھرتا:

"تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ" بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔

نقشہ یا منصوبہ یہ جو کچھ بھی ہے، دو ہی اسباب سے معرضِ وجود میں آسکتا ہے: اتفاق سے یا منصوبہ بندی سے۔ اس کی تخلیق و ترتیب اور اس کے نظم و ربط میں جس قدر باریکی، پیچیدگی اور صحت ہوگی اسی قدر اس میں اتفاق یا حادثہ کا عمل دخل کم سے کم ہوگا اور منصوبہ بندی میں ایک منصوبہ ساز

کے ارادہ و فکر کی جھلک نمایاں ہوتی چلی جائے گی۔

ہمارے اردگرد کائنات کا جو عظیم نقشہ موجود ہے اس پر ایک نظر ڈالیے اور پھر اپنے دل کی گہرائیوں سے پوچھیے کہ آیا یہ محض اتفاق سے وجود میں آسکتا ہے؟ کیا یہ ایک حادثہ کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ فطرت کے اتنے اٹل اور پیچیدہ قوانین کیا بغیر کسی قانون ساز کے وجود میں آ گئے؟

کائنات کی تخلیق کو فقط ایک اتفاق یا حادثہ قرار دینا تو ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی یہ کہے کہ چھاپہ خانہ میں دھماکہ ہوا اور ایک ڈکشنری تیار ہو کر باہر آ گئی۔ یا یہ کہ فرش پر پانی گر گیا اور وہاں زمین کا جغرافیائی نقشہ تیار ہو گیا۔ اس قدر طویل و عریض اور منظّم و مربوط کائنات کی تخلیق کیا از خود ہو گئی؟

یہ کائنات اگر محض اتفاق سے وجود میں آئی ہے تو کیا واقعات لازمی طور پر وہی رُخ اختیار کرنے پر مجبور تھے جو انہوں نے اختیار کیا، کیا اس کے سوا کچھ اور نہ ہو سکتا تھا؟ کیا ایسا ممکن نہیں کہ ستارے آپس میں ٹکرا ٹکرا کر تباہ ہو جائیں۔ مادّہ میں حرکت پیدا ہونے کے بعد کیا ضروری تھا کہ یہ محض حرکت نہ رہے بلکہ ارتقائی حرکت بن جائے؟

کائنات کی پیدائش ایک حادثہ ..... پھر زندگی کی پیدائش ایک اور حادثہ؟ اور پھر زندگی کے لیے تمام سازگار حالات کی پیدائش کیا محض حادثات ہی حادثات ہیں؟ کیا اس بھونڈی طرز کے فرار کے سوا کوئی اور توجیہ ممکن نہیں۔ اگر انسانی عقل صحت و سلامتی سے کچھ بھی آشنا ہے اور کسی حادثے کا شکار نہیں ہو گئی ہے تو اسے ضرور ایک ایسی توجیہ تلاش کرنی چاہیے جس میں کوئی جھول نہ ہو۔ "حادثہ" کا تصوّر تو بذاتِ خود ایک بہت بڑا جھول ہے۔

اتفاق سے آنے والے تمام واقعات میں لزوم کیسے ممکن ہے؟ یعنی یہ سارے واقعات اس قدر حُسنِ ترتیب کے ساتھ اربوں اور کھربوں سالوں تک تسلسل کے ساتھ کیسے جاری ہیں؟ اتفاقِ محض یا اصولِ تعلیل، کیا اس کی کافی توجیہ دے سکتے ہیں؟

اس سلسلہ میں ایک مغربی سائنس دان اور مفکّر اے کریسی مارلیں نے بہت عمدہ مثال دی ہے وہ کہتا ہے: "فرض کیجیے آپ دس اکنیاں لے کر ان پر نمبر ا سے نمبر ۱۰ تک ہندسوں کے نشان لگا دیتے

ہیں اور انہیں اپنی جیب میں ڈال کر خوب ہلا بھی دیتے ہیں۔ اب آپ انہیں دیکھے بغیر ایک سے دس تک سلسلہ وار باہر نکالنے کی کوشش کیجیے اور ہر بار ایک سکّہ نکال کر اسے دیکھنے کے بعد پھر سے جیب میں ڈالیے۔

پہلی بار نمبر ایک والی اکنّی ہاتھ میں آجانے کا امکان ظاہر ہے کہ دس میں سے ایک کے برابر ہے لیکن اس بات کا امکان کہ آپ نمبر ایک اور نمبر دو والی اکنّیاں ساتھ ساتھ نکال لیں (۱۰۰) میں سے ایک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح نمبر ایک دو اور تین والی اکنّیاں اس سلسلے میں نکالنے کا امکان ایک ہزار امکانات میں سے صرف ایک ہے اور چار تک کا سلسلہ برابر قائم رکھنا دس ہزار صورتوں میں سے صرف ایک صورت میں اغلب ہے۔ اگر ایک سے دس تک کی اکنّیوں کے سلسلہ وار برآمد ہونے کے امکانات کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسی صورت میں دس ارب صورتوں میں سے فطری طور پر صرف ایک بار پیش آسکتی ہے۔

اس سادہ سے حسابی مسئلہ کو آپ کے سامنے پیش کرنے کا مقصد محض یہ ہے کہ آپ اعداد کی اس افزونی کا کچھ اندازہ کر سکیں جو انہیں اتفاقات اور امکانات پر عائد کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

باب ۲

اِتّفاق ؟

ہماری اس دنیا میں زندگی کے لیے لازمی صورتوں کا بہت بڑی تعداد میں موجود ہونا ضروری ہے اور حسابی طور پر یہ اندازہ تک نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ سب صورتیں بیک وقت محض اتفاق سے جمع ہو سکتی ہیں پس قیاس چاہتا ہے کہ فطرت کے کاموں میں کسی نوع کی ذہانت ضرور کارفرما ہوگی۔ اس سلسلہ میں اے کریسی ماریسن کا ایک اہم اقتباس درج ذیل ہے :۔

"ظاہر طور پر "اتفاق" ایک مستقل، غیر متوقع اور حساب و شمار سے ماوراء شے معلوم ہوتا ہے، اور اگرچہ اس کے عجائب ہمارے لیے خاصے حیرت آفریں ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اتفاق بھی ایک سخت گیر اور ناقابلِ شکست قانون کی متابعت پر مجبور ہے۔ ایک پیسہ لے کر اگر ہوا میں اُچھالا جائے تو زمین پر گرتے وقت اس کے پیش رُخ کے سامنے آنے کا امکان دو میں سے ایک کی کیفیت رکھتا ہے۔ لیکن دس دفعہ اُچھالنے پر اس کے دسویں دفعہ سامنے آنے کا امکان بے حد خفیف ہوتا ہے۔ اس طرح اگر آپ ایک تھیلی میں کانچ کی ایک سو گولیاں بھر لیں جن میں سے ۹۹ سیاہ اور صرف ایک سفید ہو اور پھر اس میں دیکھے بغیر ہاتھ ڈال کر ایک گولی نکالیں تو سفید گولی نکلنے کا امکان ایک سو میں سے ایک ضرور ہوتا ہے لیکن اگر آپ چاہیں کہ ایک بار برآمد ہونے کے بعد یہ دوبارہ آپ کے ہاتھ آ جائے تو اس اتفاق کا امکان دس ہزار میں صرف ایک ہوگا۔ سو (۱۰۰) کو ایک سو سے ضرب دیجیے : حاصل دس ہزار۔ اب اگر آپ تیسری بار بھی سفید

گولی ہی نکالنا چاہیں تو اس کا امکان دس لاکھ میں سے ایک ہوگا (دس ہزار کو ایک سو سے ضرب دیجیے حاصل ضرب دس لاکھ) اسی طرح چار، پانچ، چھ اور سات مرتبہ کے لیے حاصل ضرب کروڑوں سے لے کر کھربوں تک پہنچ جائے گی اور سفید گولی کے مسلسل برآمد ہونے کا امکان اسی نسبت سے کم ہوتا چلا جائے گا۔"

امکان و اتفاق کے نتائج بھی اپنے قانون کے ہاتھوں اسی طرح بے بس ہیں، جس طرح دو اور دو کا حاصل جمع چار ہونے پر ابداً مجبور ہے۔

"تاش کی کسی بازی میں جسے چار افراد کھیل رہے ہوں، اگر پہلے ہاتھ میں سب کو ایک ایک یکہ مل جائے اور ایک ایک بادشاہ، ایک ایک بیگم، ایک ایک غلام اور اسی طرح دہلا، نہلا حتیٰ کہ دُکی تک اسی طرح برابر تقسیم ہوتی چلی جائے تو کون ایسا بے وقوف ہے جو یہ نہ سمجھے گا کہ بانٹنے والے نے یہ تاش کے پتے پہلے ہی سے ایک ترتیب میں لگا رکھے ہیں۔ لیکن اس قسم کی قدرتی تقسیم کے خلاف امکانات اس قدر زیادہ ہیں کہ غالباً جب سے تاش ایجاد ہوئی ہے، آج تک ایسا نہیں ہوا اگرچہ بظاہر اس سے انکار نہیں کیا جاتا کہ ایسا ہونا ممکن ضرور ہے۔"

"ایسا ہونا ممکن ہے، عین اسی طرح جیسے کوئی اعلیٰ درجے کا شاطر شطرنج کی بساط اپنے سامنے بچھا کر کسی بچے سے کہے کہ ایک طرف کے مُہروں کی اپنی مرضی سے ۴۳ بار خانہ بخانہ بڑھاتے جاؤ، اور پھر بچہ اپنے مُہرے محض اتفاقاً اس انداز سے بڑھاتا جائے کہ شاطر کی ہر چال ناکام ہوتی چلی جائے، یہاں تک کہ ۴۳ حرکتوں میں اسے مکمل مات ہو جائے۔ اس مات کھانے کے بعد شاطر غالباً یہ سمجھے گا کہ یا تو میں خواب دیکھ رہا ہوں، یا پاگل ہو چکا ہوں لیکن ہمارے بعض سائنس دانوں کے نظریات کے مطابق "ایسا ہونا ممکن ہے"، ہاں صاحب یہ بالکل ممکن اور عین ممکن ہے۔

اتفاقات اور امکانات کی اس بحث سے ہمارا مدعا اپنے ناظر کو اس حقیقت کی جانب متوجہ کرنا ہے کہ اس کتاب کا مقصدِ نگارش زیادہ تر یہ ہے کہ تنگ حدود کی واضح اور حکیمانہ توضیح کرنے کے بعد جن کے اندر رہ کر زندگی اس کرّے پر قائم رہ سکتی ہے ٹھوس اور حقیقی شواہد سے یہ ثابت

کیا جاتے کہ اس زندگی کے تمام اور عین میں شرائط اور کیفیات پوری صحت کے ساتھ ایک ہی کرہ پر ایک ہی وقت میں محض اتفاق سے جمع نہیں ہو سکتی تھیں۔ زمین کا حجم، سُورج سے اس کا فاصلہ، اس کا عام درجۂ حرارت، سُورج کی حیات افروز شعاعیں، زمین کے چھلکے کی موٹائی، یہاں پاتے جانے والے پانی اور کاربن ڈائی اوکسائڈ کی مقدار، نائٹروجن کی ضخامت اور پھر انسان کا ظہور اور اس کی بقا، یہ سب امور ایک خلفشار میں سے نظم اور قاعدے کی تخلیق، ایک باقاعدہ منصوبے اور مقصد کے قیام اور اس حقیقت کے اثبات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ریاضیات کے ناقابلِ تردید اصول و قوانین کے بموجب ان تمام عناصر کا محض ایک سیّارے پر اور اربوں امکانات سے محض ایک امکان کے بل بوتے پر ایک وقت جمع ہو جانا ہرگز لائقِ تسلیم نہیں، ایسا ہو سکتا تھا، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہُوا جب حقائق اس قدر زوردار ہوں اور جب ہم اپنی عقول کی ان خصوصیات کا بھی اعتراف کرتے ہیں جو یقیناً سراسر مادّی نہیں ہیں، تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ شواہد و دلائل کے اس ناقابلِ تردید سلسلے کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں اور اربوں دوسرے اتفاقات میں سے فقط ایک امکان اور محض ایک اتفاق پر اس نظریے کی بنیاد رکھ دی جائے کہ ہمارا اور ہماری اس دنیا کا وجود کائنات میں واقع ہونے والے فقط ایک اتفاق کا مرہُونِ منّت ہے۔

اب ہم اپنی استعداد کے مطابق یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ کروڑوں امکانات اس بات کے خلاف اور صرف ایک امکان اس کے حق میں ہے کہ یہ ساری تکوینِ عالم فقط ایک اتفاق کا نتیجہ ہے۔ سائنس ہمارے بیان کردہ حقائق کی تردید کی ہمت نہیں رکھتی اور ریاضی ہمارے اعداد و شمار کی تائید کرتی ہے۔ اب ہمیں انسان کے اس ضدّی ذہن سے مقابلہ درپیش ہے جو جامد تصوّرات کو بڑی مشکل سے ترک کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ قدیم یونانی یہ جانتے اور محسوس کرتے تھے کہ زمین گیند کی صورت رکھتی ہے لیکن اہلِ علم کو اس سچائی کا یقین دلانے میں پورے دو ہزار برس لگ گئے۔" (۷: ص ۱۶۴)

پیڑوں پر لگے ہُوئے پھل.... کھانے کے لیے نہیں؟ کیا کسی مُدبّر و حکیم نے انہیں اس لیے پیدا

نہیں کیا کہ غذا کا کام دے سکیں؟ کیا یہ محض اتفاقاً انسان کے لیے قابلِ انتفاع ہو گئے ہیں؟

کیا آنکھ محض اتفاقی طور پر دیکھنے کا کام کرنے لگی ہے۔ کیا یہ بنائی نہیں گئی؟ خود بخود بن گئی ہے اور اتنا باریک عملِ بصارت از خود کرنے لگ گئی ہے۔

ایسی کائنات جس میں حکمتوں اور مصلحتوں کے خلاف یا ان کے بغیر کسی ایک چیز کی بھی نشاندہی نہیں کی جا سکتی، کیا محض اتفاق سے ہی وجود میں آگئی ہے؟ اور کیا محض اتفاق کے بل پر قائم بھی رہ سکتی ہے؟ اور پھر محض اتفاق کے بل پر روز افزوں ارتقاء کی جانب بھی مائل ہے؟

کیا سیسے کے ڈھلے ہوئے حرفوں کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر دینے سے خود بخود کوئی عمدہ افسانہ ترتیب پا سکتا ہے؟ کیا کروڑوں الفاظ کو کروڑوں سالوں تک ایک دوسرے کے ساتھ ملانے اور بکھیرنے کے عمل سے "دیوان غالب" مُرتّب ہو سکتا ہے؟ تو پھر کیا انسانی وجود، ہاں خود کائنات کا وجود، اس کا نظم و بقا، ایک افسانہ یا نظم سے بھی کم حیثیت رکھتا ہے؟

مسٹر فرینک ایلن پروفیسر حیاتی طبیعیات، مینی ٹوبا یونیورسٹی کینیڈا اپنے مضمون "تخلیقِ کائنات۔ ایک حادثہ یا ایک منصوبہ" میں لکھتے ہیں:-

"صرف ایک پروٹینی سالمے کے اتفاقاً وجود میں آنے سے اس پوری کائنات کے موجود مادّے سے کروڑوں گنا زیادہ مقدار مادّہ مطلوب ہو گی جسے یکجا کر کے ہلایا جائے گا اور اس عمل سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا امکان اربوں سال کے بعد پیدا ہو گا۔ پروٹین "امینو ایسڈز" کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقے کی ہے جس سے یہ سلسلے باہم ملیں۔ اگر یہ غلط شکل میں یک جا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کی بجائے مہلک زہر بن جاتے ہیں۔ انگلستان کے پروفیسر جے۔ بی لیذر نے حساب لگایا ہے کہ ایک سادہ سے پروٹین کے سلسلوں کو لاکھوں طریقے سے یک جا کیا جا سکتا ہے۔ یہ کسی طرح عقل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ ایک پروٹینی سالمے کو وجود میں لانے کے لیے اتنے بہت سے بعید از امکان اتفاقات بیک وقت صادر ہو جائیں۔

پھر پروٹین خود ایک کیمیاوی شے ہے جس میں زندگی موجود نہیں ہوتی، اس میں زندگی کی حرارت تو اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس کے اندر روح پھونکی جاتے۔ صرف ایک عقل کُل ایک بے حد و نہایت ذہن یعنی خدا ہی یہ سوچ سکتا ہے کہ زندگی کی آماجگاہ بننے کے لیے اس طرح کا سالمہ موزوں ہو سکتا ہے۔ وہی اس سالمے کی تخلیق کر سکتا ہے اور وہی اسے زندگی بخش سکتا ہے۔"

(۳: ص ۳۳)

باب ۳

حادث یا قدیم؟

دَورِ جدید میں کائنات کے حادث یا قدیم ہونے کی پرانی بحث کا بھی قریب قریب حتمی فیصلہ ہو گیا ہے۔ سائنس نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ یہ کائنات ازلی نہیں ہے بلکہ اس کی ابتدا و انتہا بھی ہے (فلسفہ کی اصطلاح میں یہ عالم قدیم نہیں بلکہ حادث ہے)۔ دہریوں اور خدا پرستوں کے درمیان اس بحث کا فیصلہ دَورِ جدید کے ایٹمی توانائی (Atomic Energy) کے تخیّل نے کر دیا ہے دہریے اب تک یہی کہتے چلے آتے تھے کہ یہ کائنات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، نہ اس کی ابتدا ہے نہ اس کی انتہا۔ زمانہ ہی ہمیں زندگی بخشتا ہے اور اس کائنات میں زمانہ ہی ہمیں موت کی نیند سُلا دیتا ہے۔ بالکل یہی بات آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کا عرب بدو بھی کہا کرتا تھا قرآن کی زبان میں:

وَ مَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ (الجاثیہ ۲۴) "ہمیں تو زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے۔"

لیکن جدید سائنس کے نقطۂ نظر سے اب مادّہ قوّت میں تبدیل ہوتا ہے اور قوت مادّے میں۔ اب حرکیاتِ حرارت (Thermo-Dynamics) کے دوسرے قانون نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ یہ مادّی جہان نہ ازلی ہو سکتا ہے اور نہ ابدی۔ اس کی لازماً ابتدا ہونی چاہیے اور اس کو لازماً ایک موقع پر فنا بھی ہونا چاہیے۔ اب مختلف علومِ طبیعی کی مدد سے اس کائنات کے وقتِ آغاز کا تعیّن تک کیا جا رہا ہے کہ یہ کائنات اندازاً ساٹھ کھرب سال سے وجود میں آئی تھی۔ اب سائنس، زمین، سُورج، چاند، حتیٰ کہ نظامِ شمسی کی عمر کا تعیّن کرنے لگی ہے۔

سائنسدانوں میں کائنات سے متعلق جو نظریہ آج کل مقبول ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہ کائنات

یک لخت ایک تخلیقی انفجار یا دھماکہ (Explosion) سے وجود میں آگئی۔ اس کا مادّہ تخلیق یک جا، انتہائی کثافت اور انتہائی حرارت کی کیفیت میں تھا کہ ایک دھماکہ سے وہ پھٹی اور تیس منٹ کے اندر اندر تمام کیمیاوی عناصر پیدا ہو گئے اور پھر اس سے تمام فلکی نظام وجود میں آگئے۔

آئیے اس بارے میں دَورِ جدید کے انتہائی بلند پایہ سائنس دانوں کی شہادتوں پر غور کریں۔ فرینک ایلن۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ پروفیسر حیاتی طبیعیات مینی ٹوبا یونیورسٹی کینیڈا اپنے مضمون "تخلیقِ کائنات۔ ایک حادثہ یا ایک منصوبہ" میں لکھتے ہیں:۔

"زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے اس کرۂ ارض پر اتنے انتظامات نظر آتے ہیں کہ یہ کسی طرح باور نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب محض کسی اتفاق کا نتیجہ ہیں۔ اوّلاً یہ کہ کرۂ ارض ایک گولے کی شکل میں خلاء میں معلّق ہے اور اپنے قطبی محور پر اس طرح گردش کر رہا ہے کہ اس سے دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن آتا ہے پھر یہ کُرہ سُورج کے گرد بھی گھوم رہا ہے اور سال کی معیّن مدّت کے اندر اپنا ایک چکّر پورا کرتا ہے۔ یہ حرکات خلاء میں اس کو صحیح سمت میں قائم رکھتی ہیں۔ قطبی محور پر اپنے مدار کی جانب اس کا ۲۳ درجہ جھکاؤ موسموں میں باقاعدگی پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصّہ آبادکاری کے قابل ہو جاتا ہے اور مختلف انواع و اقسام کی رنگارنگ روئیدگی زمین کی رونق و افادیت دوبالا کر دیتی ہے۔ اگر یہ کُرۂ زمین گردش کرنے کی بجائے ساکن و جامد ہوتا تو نباتات اور پیداوار میں اتنی تنوّع اور گوناگوں اقسام ممکن نہ ہوتیں۔

دوم ایسی گیسیں جو بقائے حیات کے لیے ضروری ہیں فضا میں تقریباً پانچسو میل کی بلندی تک محیط ہیں اور اُن کا نہایت دبیز پردہ کُرۂ زمین کو ان شہابوں کی تباہ کُن بارش سے محفوظ رکھتا ہے جو روزانہ دو کروڑ کی تعداد میں تیس میل فی سیکنڈ کی رفتار سے کُرۂ ارض میں داخل ہوتے ہیں۔ دوسرے اثرات کے علاوہ اسی ہوا کا درجۂ حرارت ان کو حدود اعتدال کے اندر رکھتا ہے جو زندگی کی بقا کے لیے ناگزیر ہیں۔ ہوائیں بادلوں کی صورت میں سمندروں

کے تازہ پانی کی بھاپ کو اُڑا کر خشکی کی طرف لے جاتی ہیں اور دُور دُور تک خشک اور پیاسی زمینوں کو سیراب کرتی ہیں ورنہ یہ زمین بے آب و گیاہ صحرا میں تبدیل ہو جاتے۔ گویا دوسرے لفظوں میں فطرت نے سمندروں اور ہواؤں کی ہم آہنگی کو اس کُرۂ ارض میں بقائے زیست کا ذریعہ بنا دیا ہے۔"

(۳: ص ۲۷)

جان کلیوی لینڈ پی۔ ایچ۔ ڈی، ماہر ریاضی و کیمیا اپنے مضمون "ایک ناگزیر فیصلہ" میں لکھتے ہیں:-

"اب مادّے کو اس حیثیت سے لیجیے کہ یہ سالموں (Molecules) اور ذرّات (Atoms) کا مجموعہ ہے۔ خود سالمے اور ذرّات ان کے ترکیبی پروٹون، الیکٹرون اور نیوٹرون، کہربائی قوت حتّٰی کہ توانائی (Energy) بھی سب کے سب اپنے اپنے دائرے میں ایک مقرر ضابطے کے پابند نظر آتے ہیں اور ان کے عمل میں کہیں اتفاقات و حوادث کارفرما نہیں معلوم ہوتے۔ نظم و ترتیب کی اس سے بہتر مثال کیا ہو سکتی ہے کہ کیمیائی عنصر نمبر ۱۰۱ کی شناخت و امتیاز اس کے محض ۱۷ ذرات کے مطالعے سے کر لی گئی۔ یہ اس حقیقت کا ایک ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ یہ عالمِ رنگ و بُو ایک سوچے سمجھے نظام اور ایک مقررہ نقشے کے مطابق چل رہا ہے۔ اس میں انتشار اور لامرکزیت نہیں، یہاں ہر شے کے لیے قوانین و ضوابط مقرر ہیں اور اس کارخانۂ قدرت کو حادثات و اتفاقات نہیں چلاتے۔

کیا کوئی باخبر اور استدلالی ذہن یہ باور کر سکتا ہے کہ جامد و بے شعور مادّہ کسی حادثے کے نتیجے میں از خود وجود میں آ گیا، کسی ارادے اور کارفرما قوت کے بغیر خود بخود ایک نظام میں ڈھل گیا، محض اتفاق ہی سے اُس نے اِس نظام کی پابندی شروع کر دی اور اس کے بعد اس نظم کا اسی طرح قائم و دائم رہنا ایک حُسنِ اتفاق کے سوا کچھ نہیں۔

یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ جب توانائی کسی نئے مادّے میں تبدیل ہوتی ہے تو یہ عمل تغیّر ایک سوچے سمجھے اور متعیّن ضابطے کے مطابق ہوتا ہے اور اس عمل سے وجود

میں آنے والا نیا مادّہ بھی انہیں قواعد و ضوابط اور اس نظام کی پابندی کرتا ہے جو اس سے پہلے موجود مادّے پر نافذ ہیں۔ علم کیمیا یہ بتاتا ہے کہ مادّہ بتدریج فنا ہو رہا ہے۔ اس کی بعض انواع کے معدوم ہونے کی رفتار انتہائی سُست ہے اور بعض کی انتہائی تیز، اور اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مادّہ اپنی ذات میں ازلی و ابدی نہیں ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر لامحالہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مادّے کی کوئی ابتدا اور اس کا کوئی نقطۂ آغاز بھی ضرور ہو گا۔ نہ صرف علم کیمیا بلکہ دوسرے علومِ عقلی بھی اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ مادہ کسی طویل تدریجی عمل کے نتیجے میں وجود میں نہیں آیا بلکہ یک لخت اور اچانک وجود میں آیا اور مختلف آثار و شواہد سے یہ بھی متعین کیا جاتا ہے کہ اندازاً یہ واقعہ کب ہُوا۔ گویا ثابت ہو گیا کہ یہ بزمِ کائنات ایک مقرر گھڑی پر یکبارگی سجائی گئی۔ یہ کسی دانا و بینا ہستی کی قوتِ تخلیق کا کرشمہ ہے اور جب سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے اسی وقت سے یہ مقررہ قوانین کی پابندی کر رہی ہے۔ حادثات و اتفاقات اس کائنات کی زندگی اور رونق کا سرچشمہ نہیں ہیں۔"

(۳: ص ۵۶)

ایڈورڈ لوتھر کیسل، ماہر حیوانیات و حشرات ایم۔ ایس سی۔ پی ایچ ڈی اپنے مضمون "آیئے کسی تعصّب کے بغیر حقائق کا مطالعہ کریں" میں لکھتے ہیں:

"سائنس کارخانہ قدرت کے نظام کی تفصیلات سے بحث کرتی ہے اور اس بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اس کارخانہ کو بنایا اور چلایا کس نے ہے لیکن ہر شخص تھوڑا بہت فلسفی ضرور ہوتا ہے اور اس چیز سے سائنس دان بھی مستثنیٰ نہیں، یہ الگ بات ہے کہ اچھے سائنس دان ہمیشہ اچھے فلسفی نہیں ہوتے۔ ان میں سے کچھ تو کائنات کے آغاز کے بارے میں ذہنی انتشار اور پراگندہ خیالی میں مبتلا ہیں اور کچھ لوگ اس لغویت کا شکار ہیں کہ وہ ازلی و ابدی ہے تو آخر یہ کیوں نہ مان لیا جائے کہ یہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آگئی ہے اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کا کہنا یہ ہے کہ اگر خدا کے بارے میں یہ جانا جا سکتا ہے کہ وہ ازلی و ابدی ہے تو

آخر یہ کیوں نہ مان لیا جائے کہ یہ کائنات ہی ازلی و ابدی ہے۔ حرکیاتِ حوادث کا دوسرا قانون جسے ضابطۂ ناکارگی (Law of Entropy) کہا جاتا ہے، اس آخری تصور کی نفی کرتا ہے۔ یہ حقیقت سائنس نے ثابت کر دی ہے کہ کائنات ہمیشہ سے نہیں ہے۔ ضابطۂ ناکارگی بتاتا ہے کہ حرارت ہمیشہ باحرارت وجود سے بے حرارت وجود میں منتقل ہوتی رہتی ہے لیکن اس چکر کو اُلٹا نہیں چلایا جا سکتا کہ یہ حرارت خود بخود کم حرارت وجود سے زیادہ حرارت کے وجود میں منتقل ہونے لگے۔ ناکارگی ممکن الحصول اور ناممکن الحصول توانائی کے درمیان تناسب کا نام ہے اور اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اِس کائنات کی ناکارگی برابر بڑھ رہی ہے۔ اور ایک وقت آنے والا ہے جب تمام موجودات کی حرارت یکساں ہو جائے گی اور کوئی کارآمد توانائی باقی نہیں رہے گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کیمیائی اور طبیعی عمل کا کوئی میدان باقی نہ رہے گا، زندگی ناپید ہو جائے گی اور ایک ہمہ جہتی جمود طاری ہو جائے گا۔ لیکن اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ کیمیائی اور طبیعی عمل جاری ہے اور زندگی کے ہنگامے قائم ہیں، یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کائنات کا وجود ازلی نہیں ہے ورنہ اس کی توانائی کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی اور یہاں زندگی کی ہلکی سی رمق بھی موجود نہ ہوتی۔ اس طرح غیر ارادی طور پر سائنس کی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کائنات کا کوئی نقطۂ آغاز ضرور ہے اور اگر یہ بات ثابت ہو جائے تو پھر خدا کا وجود آپ سے آپ ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ ہر وہ چیز جو اپنی ذات میں ازلی نہیں ہے اس کا وجود یقیناً کسی محرکِ اوّل اور کسی خالق یعنی خدا کے کرشمۂ قدرت کا رہینِ منّت ہے۔

سائنس کی تحقیق نے صرف یہی ثابت نہیں کیا کہ یہ کائنات ازلی نہیں اور اس کی ایک ابتدا یا آغاز ہے بلکہ تازہ انکشافات یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اب سے تقریباً پچاس کھرب سال پہلے ایک تخلیقی دھماکے کے نتیجے میں یہ کائنات وجود میں آگئی اور آج بھی اس میں توسیع کا عمل جاری ہے۔ جو لوگ سائنس کی تحقیقات کو کوئی وزن دیتے ہیں وہ یہ حقیقت

تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ کائنات تخلیق کی گئی ہے اور یہ عملِ تخلیق لگے بندھے قوانینِ فطرت سے ماورا کسی طاقت کا کرشمہ ہے۔ کیونکہ یہ قواعدِ فطرت تو خود کسی کی تخلیق کا نتیجہ ہیں اسی ذاتِ خالق کو ہم خدا کہتے ہیں۔ اس خالقِ حقیقی نے جب قدرتی مادّے کو وجود بخشا اور مادّے کے عمل کے لیے قواعد و ضوابط معیّن کر دیئے تو پھر اس نے اس مادّے کو اس مقررہ عمل کے ذریعہ تخلیقِ مسلسل میں لگا دیا۔"

(۳ : ص ۷۰)

پیٹر ڈبلیو سٹونر ماہر ریاضی و فلکیات اپنے مضمون "کتابِ پیدائش کا پہلا باب جدید فلکیات کی روشنی میں" لکھتے ہیں۔

"لیکن اب ایٹمی طاقت وجود میں آچکی ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ مادّے کو ایک خوفناک قوّت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور طاقت کو پھر سے مادے کا ایک طومار بنایا جا سکتا ہے۔ اب تخلیق کا خیال زیادہ قابلِ یقین معلوم ہونے لگا ہے۔ سائنس نے کچھ اَدوار مقرر کر لیے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں :-

۱۔ دَورِ ارض

۲۔ دَورِ سیّارگان

۳۔ دَورِ قمر و زمین

۴۔ دَورِ آفتاب

۵۔ دَورِ کہکشاں

۶۔ دَورِ کائنات

۷۔ دَورِ ارتقاء و ترقی و تقسیم

یہ اَدوار تقریباً ساڑھے کھرب سال تک جاتے ہیں یہ صورتِ حال اتنی خیال انگیز ہے کہ بہت سے سائنسدان خود یومِ تخلیق کا اقرار کرنے لگے ہیں اور اس کا نقطہ آغاز ساڑھے کھرب سال پہلے بتاتے ہیں۔"

(۳ : ص ۱۸۷)

باب ۴

عدم سے وُجود تک

یہاں تک یہ بات سمجھ میں آگئی کہ یہ کائنات ازلی و ابدی نہیں بلکہ اس کی ابتدا و انتہا بھی ہے۔ ایک وقت ایسا گزرا ہے جب یہ بالکل موجود نہیں تھی۔ کوئی شے موجود نہ تھی۔ ہر چیز عدم سے وجود میں آئی۔ مگر سوال یہ ہے کہ کائنات کو وجود کیسے ملا؟ کیا یہ خود بخود ظہور میں آگئی؟ کیا مادہ اپنا خالق خود آپ ہے؟ کیا عدم سے وجود میں لانے کے لیے کسی مُوجد کی ضرورت نہیں؟ کیا تخلیق بغیر کسی خالق کے ممکن ہے؟

قرآن مجید کی اس دلیل پر غور کیجیے۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۔ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۔

"کیا وہ بغیر کسی شے کے پیدا کیے گئے یا وہ خود پیدا کرنے والے ہیں؛ کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؛ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ وہ کسی خالق کے وجود پر یقین نہیں رکھتے۔" (الطّور: ۳۵، ۳۶)

جب کچھ بھی موجود نہیں تھا تو یہ آسمان، سُورج، چاند، تارے، یہ زمین، سمندر اور پہاڑ کہاں سے آگئے؟ کیا کوئی شے خود بخود عدم سے وجود میں آسکتی ہے؟ انسانی عقل صاف گواہی دیتی ہے کہ کسی موجود کا وجود بغیر مُوجد کے پایا جانا عقلاً محال ہے اس لیے کہ ہر ممکن الموجود پہلے عدم میں تھا، پھر وجود میں لایا گیا، تو لازم ہے کہ کوئی اس کا لانے والا ہو۔

انسانی عقل صاف گواہی دیتی ہے کہ کسی موجود شے کا خود ہی اپنا موجود ہونا عقلاً محال ہے کیونکہ اس سے شئے کا وجود اس کی ذات سے پہلے آنا لازم ہوتا ہے جو عقلاً باطل ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایک شئے جو ابھی تک موجود ہی نہیں ہے، حالتِ عدم میں ہے، لاشئے ہے، خالق نہیں بن سکتی۔ یعنی ابھی تو وہ سرے سے موجود ہی نہیں، کجا یہ کہ وہ وجود میں آنے والی شئے کی مُوجد بن جائے۔

تو ثابت ہُوا کہ ایک شے کا بیک وقت مخلوق و خالق ہونا ناممکن ہے کیونکہ وجود میں آنے سے پہلے تو اس کا کسی طرح سے وجود ہی نہیں کجا کہ وہ اپنی تخلیق کا سامان پیدا کرے۔

چنانچہ تخلیق کائنات کی اس کے علاوہ اور کوئی توجیہ ممکن نہیں کہ ایک خالق و مدبر کے وجود کو مانا جائے۔ فلسفۂ قدیم میں خدا کے وجود پر یہی دلیل کچھ اس انداز سے بیان کی گئی ہے:۔

ہمارے حواسِ خمسہ پُورے یقین کے ساتھ ہمیں اس فیصلہ پر پہنچا دیتے ہیں کہ اس دنیا میں کچھ چیزیں حرکت کر رہی ہیں (یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو رہی ہیں یا گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں یا ان میں کسی اور قسم کا تغیّر و تبدّل ہوتا رہتا ہے)۔ دوسری یقینی بات یہ ہے کہ کوئی چیز اس وقت تک حرکت نہیں کرتی جب تک کہ کوئی دوسری قوّت یا کوئی دوسری چیز اسے حرکت میں نہ لائے۔ ایک چیز خود اپنے آپ کو حرکت نہیں دے سکتی کیونکہ اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ وہ ایک ہی وقت میں خود ساکن بھی ہے اور مُتحرک بھی جو عقلاً محال ہے۔

چنانچہ یہ بات طے ہوتی کہ جو چیز بھی حرکت کر رہی ہے اس کو کوئی اور چیز حرکت میں لاتی ہے۔ اور اس حرکت میں لانے والی چیز کو بھی کوئی اور چیز حرکت میں لائی تھی۔ اب اس حرکت میں لانے والی چیز کو بھی کوئی اور چیز حرکت میں لائی۔ یونہی اوپر کی طرف بڑھتے جائیے، ہر مُحرّک کا ضرور کوئی نہ کوئی مُحرّک ہونا چاہیے۔ لیکن محرکوں (حرکت میں لانے والی اشیاء) کا یہ سلسلہ لامتناہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر مُحرّکوں کا یہ سلسلہ لامتناہی مان لیا جائے تو یہ بات لازم آئے گی کہ کوئی بھی مُحرّکِ اوّل نہیں ہے یعنی ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس نے سب سے پہلے حرکت پیدا کی ہو۔ اور اگر یہ مان لیا جائے کہ کوئی محرّکِ اوّل نہیں ہے اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس نے سب سے پہلے حرکت دی ہو تو لازماً یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حرکت کا وجود ناپید ہے۔ جب محرّکِ اوّل ہی نہیں ہے تو حرکت کہاں سے آگئی۔ لازماً حرکت کی نفی کرنا پڑے گی۔

لیکن حرکت کے وجود کے انکار کی قطعاً گنجائش نہیں۔ اس کے وجود کا فیصلہ تو شروع ہی میں ہمارے حواسِ خمسہ دے چکے ہیں۔ چنانچہ ہمیں لازماً محرکِ اوّل کا وجود ماننا پڑے گا۔ ایسا مُحرّک جس

نے حرکت دے تو دی لیکن وہ خود حرکت کا محتاج نہیں تھا۔ بالفاظِ دیگر ایسا خالق جس نے دوسری اشیاء کی تخلیق تو کی لیکن خود اس کی کسی نے تخلیق نہ کی۔"

دیکھیے سورۂ اخلاص میں ایسے ہی خالق کی صفات بیان کی گئی ہیں :-

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ۔ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔ (الاخلاص)

کہہ دیجیے کہ وہ اللہ ایک ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں، بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی سے جنا گیا اور نہ کوئی اس کا ہمسر و شریک ہے۔

اب قرآنِ مجید کی ان آیات پر غور کیجیے۔ بات واضح ہو جائے گی :-

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى۔ (نجم-۴۲)

اور یہ کہ تیرے رب کی طرف ہے سب کی انتہا۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ۔ (هُود-۱۲۳)

اور خدا کے پاس ہی آسمانوں اور زمین کی چھپی بات ہے اور اسی کی طرف ہر بات لوٹائی جاتی ہے تو اس کی عبادت کر اور اسی پر بھروسہ رکھ۔

خلاصۂ بحث یہ ہُوا کہ خدا کے وجود کے علاوہ تخلیقِ کائنات کی کوئی اور توجیہ ممکن نہیں حضرت امام ابو حنیفہؒ کی خدمت میں کچھ منکرینِ خدا نے اس مسئلہ پر آکر بحث کرنا چاہی تو آپ نے مندرجۂ ذیل حکیمانہ انداز میں ان کی تشفّی فرمائی :-

فرمایا "چھوڑو چھوڑو، مَیں ایک فکر میں مستغرق ہُوں۔ لوگوں نے مجھ سے ذکر کیا ہے کہ سمندر میں ایک کشتی کھڑی ہے جس میں قسما قسم کے سامانِ تجارت ہیں، کوئی اس کا محافظ یا چلانے والا نہیں ہے اور وہ خود بخود آتی جاتی ہے، خود بخود تُند و تیز موجوں کا مقابلہ کرتے ہُوئے جہاں جاتی ہے صاف بچ کر نکل جاتی ہے اور ساحل پر پہنچ جاتی ہے۔ اس کا کوئی چلانے

والا نہیں ہے"۔

زندیق کہنے لگے "یہ ایسی بات ہے جو کوئی عقلمند انسان نہیں کہہ سکتا"۔

فرمایا "ظالمو! پھر یہ نظام شمسی، یہ عالم بالا اور عالم سفلی اور اس میں جس قدر مضبوط حکم و مصالح سے پُر اشیاء موجود ہیں ان کا خالق و مدبّر کوئی نہیں ہے؟ کیا یہ بات کسی کے عقل و تصور میں آسکتی ہے"؟

اسی طرح سے ایک بدو گنوار سے کسی نے خدا کی ہستی کی دلیل دریافت کی تو اس نے اپنے سادہ اُسلوب میں خوب جواب دیا:۔

البعرة تدل علی البعیر و آثار الاقدام لتدلّ علی المسیر فالسماء ذات ابراج والارض ذات فجاج و بحار ذات امواج کیف لاتدل علی وجود اللطیف الخبیر۔

مینگنی اُونٹ کے وجود پر دلالت کرتی ہے (یعنی مینگنی کا نظر آجانا اس بات کی دلیل ہے کہ ضرور اُونٹ یہاں سے گزرا ہے) اور قدموں کے نشان کسی چلنے والے کا پتہ دیتے ہیں۔ پھر یہ کیا بات ہوئی کہ بڑے بڑے برجوں والا آسمان اور بڑی بڑی گھاٹیوں والی زمین اور موجوں والے سمندر کسی لطیف و خبیر ذات کے وجود پر دلالت نہ کریں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ کوئی مادّی شے خود اپنی تخلیق پر قادر نہیں ہو سکتی۔ یہ کائنات از خود اپنے آپ کو پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر کائنات از خود پیدا ہو سکتی ہے اور تخلیق کی قوت سے مُتّصف ہے جسے ہم خدا کی صفت قرار دیتے ہیں تو پھر ہم اس کائنات کو ہی خالق یا خدا قرار دے رہے ہیں مگر یہ بہت عجیب قسم کا خدا ہوگا جو مادّہ بھی ہوگا اور مادّہ سے بلند تر بھی۔ جو خود فطرت بھی ہوگا اور مافوق الفطرت بھی، جو خود خالق بھی ہوگا اور مخلوق بھی، ایسا خدا خود حاکم بھی ہوگا اور محکوم بھی۔ آخر ایسے مہمل تصوّرِ خدا کو قبول کرنے کی بجائے ایک سیدھے سادے تصوّرِ خدا کو کیوں نہ مان لیا جائے جس میں کوئی عقلی و منطقی جھول نہ ہو۔ ایسا خدا جس نے ایک عالمِ مادّی کی تخلیق کی ہے، وہ خود اس کا جزو نہیں بلکہ اس کا خالق اور حاکم ہے۔

تخلیقِ کائنات کی مادّی توجیہہ سے ایک اور غیر منطقی صورت بھی پیش آجاتی ہے۔اگر یہ مان لیا جائے کہ کائنات ازخود پیدا ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے تو کائنات کے ایک ایک ذرّہ کو تخلیق کی خدائی صفت سے مُتّصف ماننا پڑے گا۔ہر ہر ذرّہ اپنی اپنی جگہ پر خالق، ہر ہر ایٹم اپنی جگہ پر خدا۔لیکن جدید دَور کی سائنس تو بڑے وثوق سے ہمیں بتلا رہی ہے کہ کوئی ذرّہ خود مکتفی اکائی نہیں ہے، کوئی ذرّہ تن تنہا اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔ہر ذرّہ اپنے وجود کے لیے دوسرے ذرّے کا محتاج ہے۔ہر ذرّہ خارجی مدد کا محتاج ہے تو وہ ذرّۂ کائنات جو اپنے تئیں اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتا، تخلیق کا عمل کس طرح نباہ کر سکتا ہے؟

پھر جدید دَور کی سائنسی تحقیقات نے حتمی طور پر بتلا دیا ہے کہ ان ذرّات کا آپس میں بہت ہی گہرا نظم و ربط ہے۔اس نظم و ربط کے بغیر کائنات کی تخلیق، اس کا وجود اور اس کا ارتقاء سب کچھ ناممکن ہے۔سائنسی تحقیق کہتی ہے کہ ان نہایت مختصر سے ذرّات نے جن کی حقیقت و ماہیت کو ہمارے لیے دیکھنا بھی مشکل ہے کروڑ ہا بلکہ ارب ہا ایسے ستاروں اور سیّاروں کو وجود بخشا ہے جن کی ہیئت متعیّن اور ان کی ہیئت کا بیان ممکن ہے، جو اٹل قوانین کے تحت قائم و متحرک ہیں۔ان ستاروں اور سیّاروں کی ترکیب و ترتیب کمالِ حکمت سے، جو مادّی فہم و ادراک سے بلند تر ہے، انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرّات سے کی گئی ہے۔اور پھر ان ذرّات کے اندر خود بھی وہی نظام چھوٹے پیمانے پر قائم اور جاری ہے۔یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان ارب ہا ذرّات میں یہ ہم آہنگی اور نظم و ربط کہاں سے آگیا؟

پھر انہی ذرّات سے نہ صرف ستارے اور سیّارے وجود میں آتے ہیں بلکہ کروڑ ہا ذی رُوح ہستیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ایک زندہ انسان کس طرح سے عالمِ وجود میں آگیا؟ اگر کائنات کا ہر بے بس اور بے جا ذرّہ اپنے آپ کو پیدا کر سکتا ہے تو مَیں تو ایک زندہ اور باشعور ہستی ہوں، ایک بے بس ذرّے سے زیادہ طاقتور، زیادہ باشعور، زیادہ تخلیقی قوّتوں کا مالک، مَیں اپنے آپ سے پُورے خلوص اور دیانت کے ساتھ پوچھتا ہوں کہ کیا مَیں نے اپنے آپ کو خود پیدا کیا ہے؟ اور اپنے

آپ کو از خود پیدا کر لینے کے بعد مَیں اپنے نظامِ جسم کو اپنی مرضی کے مطابق چلا رہا ہوں؟ کیا دل کی دھڑکن میرے حکم کے مطابق ہو رہی ہے؟ کیا جگر، پھیپھڑے، گُردے اور دیگر تمام اعضائے جسمانی کوئی کام کرنے سے پہلے میرے حکم کے منتظر رہتے ہیں اور میری مرضی کو پُورا کرتے ہیں، کیا میرے سر کے بال میری مرضی سے گرتے ہیں، میری ڈاڑھی کے بال میری مرضی کے مطابق سفید ہو رہے ہیں۔ میرے چہرے پر جُھریاں میری اجازت سے پڑ رہی ہیں؟ —— دل صاف گواہی دے رہا ہے کہ یہ سب کچھ مَیں نے خود نہیں کیا اور مَیں نہیں کر سکتا۔ ایک قُوّت، ایک ہستی جو میرے علاوہ کوئی اور ہے —— کم از کم مَیں خود نہیں ہوں —— جو میرے پُورے نظامِ جسمانی کو سنبھالے ہُوئے اور اس قدر چابکدستی اور صحت کے ساتھ سنبھالے ہُوئے ہے کہ مَیں اس کے نظام کو اور اس کی حکمتوں کو پُوری طرح سے سمجھ بھی نہیں سکتا۔ اور عام انسانوں کی اکثریت تو اتنی بات سے بھی واقف نہیں کہ ان کے جسم کا سارا نظام کس طرح سے وجود میں آگیا اور اب کس طرح سے چل رہا ہے؟ جگر کہاں واقع ہے، دل کہاں ہے پھیپھڑے کس طرف ہیں؟ وہ کیا کر رہے اور کس طرح سے کر رہے ہیں؟ اُف! انسان کی بے بسی! اُس انسان کی بے بسی جو اس کائنات کی مضبوط ترین اور ذہین ترین ہستی ہے! ہائے انسان کی بے بسی خود اپنے جسم کے بارے میں، خود اپنے جسم کی تخلیق اور نظامِ عمل کے بارے میں اور خود اس نظام کو سمجھ سکنے کے بارے میں!

قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب انسان اپنی تخلیق اور اپنے جسمانی نظام کو چلانے کے بارے میں بے بس ہے تو ایک بے جان، بے شعور اور بے بس ذرّہ کائنات اپنی تخلیق خود کس طرح سے کر سکتا ہے؟ پھر کس طرح سے مادّہ خود اپنا خالق اور اپنا ناظم بن گیا؟ پھر کس طرح سے یہ کائنات از خود پیدا بھی ہو گئی، از خود ارتقاء پذیر بھی ہو گئی اور از خود پُورا نظامِ کائنات نظم و ضبط کی تمام باریکیوں سمیت خود بخود صحت سے جاری و ساری ہے؟ اب تک تو ان نشانیوں کا ذکر کیا گیا جو مجموعی طور پر اس پُوری کائنات میں نظر آتی ہیں۔ آیئے اب کچھ ان نشانیوں کا تذکرہ کریں جو جمادات، نباتات، حیوانات بلکہ خود انسان کی شکل میں اس زمین پر بکھری ہوئی ہیں۔

فصل ا

جمادات :-

قرآن مجید میں ہے :-

وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ ۔	اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے۔
هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ	ایک لذیذ شیریں، اور دوسرا تلخ و شور اور دونوں کے
اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ	درمیان ایک پردہ حائل ہے، ایک رکاوٹ
حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۔ (الفرقان۔ ۵۳)	ہے جو انہیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔

"یہ کیفیت ہر اُس جگہ رُونما ہوتی ہے جہاں کوئی بڑا دریا سمندر میں آگرتا ہے۔ اس کے علاوہ خود سمندر میں بھی مختلف مقامات پر میٹھے پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں جن کا پانی سمندر کے نہایت تلخ پانی کے درمیان بھی اپنی مٹھاس پر قائم رہتا ہے۔ ترکی امیر البحر سیدی علی رئیس (کاتب رُومی) اپنی کتاب مرآۃ الممالک میں جو سولھویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے، خلیج فارس کے اندر ایسے ہی ایک مقام کی نشان دہی کرتا ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ وہاں آبِ شور کے نیچے آبِ شیریں کے چشمے ہیں جن سے مَیں خود اپنے بیڑے کے لیے پینے کا پانی حاصل کرتا رہا ہُوں۔ موجودہ زمانے میں جب امریکن کمپنی نے سعودی عرب میں تیل نکالنے کا کام شروع کیا تو ابتداءً وہ بھی خلیج فارس کے انہی چشموں سے پانی حاصل کرتی تھی بعد میں ظہران کے پاس کنوئیں کھود لیے گئے اور ان سے پانی لیا جانے لگا۔"

——— تفہیم القرآن جلد سوم ص ۴۵۸

تلخ و شور پانی کے عین درمیان میٹھے پانی کا وجود سوائے ایک خلّاقِ عظیم کے تخلیقی شاہکار کے اور کیا ہو سکتا ہے جسے اپنی مخلوق کی تکلیف و پیاس گوارا نہیں۔ اس نے اپنے عظیم منصوبہ کے تحت اس جگہ بھی میٹھے پانی کا انتظام فرما دیا جہاں عام حالات میں میٹھے پانی کا وجود ممکن نہیں۔

پھر سمندر کے اس تلخ و شور پانی میں سے انتہائی احتیاط کے ساتھ پانی کشید کیا جاتا ہے اور

انتہائی صاف، شفاف اور شیریں پانی بادلوں کی پیٹھ پر سوار کر کے بالائی علاقوں تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اتنے کڑوے پانی میں سے میٹھا پانی نکال لانا اگر تخلیقی فن پارہ نہیں ہے تو اور کیا ہے، کیا اس خلّاقِ عظیم کے لیے یہ زیادہ آسانی سے ممکن نہ تھا کہ کڑوے کا کڑوا پانی ہی بادلوں میں بھر دیا جاتا، نہ یہ پانی پینے کے کام آسکتا اور نہ آبپاشی کے۔ بلکہ جس جس زمین تک یہ پہنچ جاتا اس کی زرعی استعداد بھی تباہ ہو جاتی؛

اَفَرَاَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِىْ تَشْرَبُوْنَ	کیا تم نے اس پانی کو (غور سے) دیکھا ہے جسے
ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ	تم پیتے ہو۔ کیا تم نے اسے بارش کے ذریعہ اُتارا
اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۔ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ	ہے یا اس کے اُتارنے والے ہم ہیں؟ اگر
اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۔	ہم چاہیں تو اسے (میٹھے پانی کو) کھاری بنا دیں
(الواقعہ: ۶۸-۷۰)	پس تم شکر کیوں نہیں کرتے۔

بارش کے یہ چھینٹے اتفاقاً ہی زمین پر نہیں گر جاتے بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک زبردست قسم کا نظام ہے جس سے انسانی زندگی رواں دواں ہے۔ اگر بارش کے چھینٹے محض اتفاق کا نتیجہ ہوتے تو کبھی تو ایسا ہوتا کہ کسی علاقے میں خوب بارش ہو جاتی اور کبھی ایسا ہوتا کہ کئی کئی سال تک وہاں ایک چھینٹا بھی نہ پڑتا۔ اس کے برعکس صورتِ حال یہ ہے کہ بارش کا زمین کے تمام خطّوں کے لیے ایک مخصوص کوٹہ (Quota) مقرر ہے جو ہر سال صحیح وقت پر مل جاتا ہے۔ انسانی آبادی شروع سے لے کر اب تک بارش کے اس مخصوص کوٹے سے وابستہ چلی آ رہی ہے اور پھر ایسا نہیں ہوتا کہ ایک مرتبہ بارش ہو گئی اور سال بھر پانی کو ترستے رہے بلکہ بارش کا پانی پہاڑوں پر کہیں جھیلوں کی شکل میں اور کہیں برف کی شکل میں سٹاک کر دیا جاتا ہے اور یہ سٹاک اربوں من برف کی شکل میں سال بھر تھوڑا تھوڑا نشیبی علاقوں کی طرف سپلائی ہوتا رہتا ہے۔ بارش کا ایک اور کمال دیکھیے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ	اور اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ

خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيِ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ (الروم : ۲۴)

کہ وہ تمہیں بجلی دکھاتا ہے جس میں ڈر بھی ہے اور لالچ بھی۔ اور آسمان سے پانی اتارتا ہے جس سے زمین موت کے بعد زندہ ہو جاتی ہے۔ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔"

یہ بجلی بھی خوب رہی، اس میں خوف بھی ہے اور طمع بھی خوف تو بجلی کے گر جانے سے تباہی کا، اور طمع اس بات کی کہ پانی سے زمین سیراب ہو گی۔ جدید سائنس نے ایک اور انکشاف بھی بجلی کے بارے میں کیا ہے کہ اس کی کڑک سے بارش کے پانی میں کثیر مقدار میں نائٹروجن ملا دی جاتی ہے وہی نائٹروجن جو کھاد کا جزوِ عظیم ہے۔ نائٹروجن سے ملا ہوا یہ پانی جب زمین پر گرتا ہے تو زمین کی زرعی قوّت کو کئی گُنا بڑھا دیتا ہے۔

یہ پہاڑ جو ہمارے لیے برف اور پانی کا ذخیرہ ہیں ایک اور اہم کام انجام دیتے ہیں وہ یہ کہ پہاڑ زمین کے توازن کو برقرار رکھتے ہیں، وہ زمین جس کے پیٹ میں کھولتے ہوئے آتش فشاں، انتہائی گرم سیّال مادّے اور گیسیں موجود ہیں، کبھی سکون سے اپنی سطح ایک سی برقرار نہیں رکھ سکتی تھی، اگر پہاڑوں کی لمبی لمبی میخیں اس کے پیٹ میں نہ گاڑ دی جاتیں۔ یہ بات قرآن مجید میں یوں بیان کی گئی:

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَّ الْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝ (النبا: ۶، ۷)

کیا ہم نے زمین کو بچھونا اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنا دیا۔

نیز فرمایا:

وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ۔ (لقمان۔ ۱۰)

ہم نے زمین پر پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تاکہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔

آگ کے وجود کو بھی قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے۔

أَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۔ أَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ۔ (الواقعہ۔ ۷۱،۷۲)

"کیا تم نے آگ کو دیکھا ہے جسے تم تاپتے ہو کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم اسے پیدا کرنے والے ہیں؟"

ہوا، پانی اور زمین کی نعمتوں کی طرح آگ بھی انسانی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ یہ بات سوچنے کی ہے کہ یہ سب چیزیں کس نے پیدا کی ہیں؟ کیا یہ خود بخود وجود میں آگئیں؟ کیا انسان نے ان کو پیدا کیا؟ کیا ان کو پیدا کرنے کے بعد ان کا نظام انسان چلا رہا ہے؟ کیا آگ اور پانی میں کوئی ایسا سمجھوتہ ہے جس کے تحت یہ دونوں اپنے وجود کو اور ایک بہترین نظام کو برقرار رکھے ہوئے ہیں؟

اگر انسان کی عقل سلامت ہے تو وہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ فطرت کی یہ بے پناہ اور بے حد و حساب پھیلی ہوئی اندھی بہری قوتیں خود کو پیدا کرنے اور پھر آپس میں نظم و ربط قائم رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں، ان کی تخلیق و تنظیم کے لیے ایک قدیر و بصیر خالق کا وجود ماننے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں۔

فصل (ب)

نباتات

نباتات کی پیدائش میں بھی اللہ تعالیٰ کے وجود کی بے شمار نشانیاں ہیں۔

وَآيَةٌ لَّهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ أَحْيَيْنَاهَا وَأَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَأْكُلُونَ ۔ وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ وَفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ ۔ لِيَأْكُلُوا مِن ثَمَرِهِ وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ۔ (یٰسٓ: ۳۳ تا ۳۵)

"ان کے لیے ایک نشانی مُردہ زمین ہے جسے ہم نے زندہ کیا اور اس میں سے ایک دانہ نکالا جسے وہ کھاتے ہیں۔ ہم نے اس میں کھجور اور انگور کے باغ پیدا کیے اور اس میں چشمے جاری کر دیئے تاکہ لوگ زمین کے پھل کھائیں اور یہ سب کچھ انسان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا پس کیا یہ لوگ شکر نہیں کرتے؟"

ایسے ہی ایک اور جگہ یوں فرمایا :

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ ۔ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۔ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ۔ (انعام - ۹۵)

"بے شک اللہ تعالیٰ ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے وہ مُردہ میں سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ میں سے مُردہ نکال لاتا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے تو پھر تم لوگ کہاں پلٹے کے جاتے ہو۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ زمین میں سے اناج اور پھلوں کے باغات کا پیدا ہونا آتنا آسان کام نہیں ہے۔ اس زمین سے گندم کا ایک دانہ بھی اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ کائنات کی بے شمار چیزیں مل کر پورے تعاون اور نظم وضبط کے ساتھ اپنی قوتیں ایک بیج کے دانے پر مرکوز نہ کر دیں۔ زمین کی زرعی قوت، پانی، خاص قسم کا درجہ حرارت، بروقت بارش، سورج کی گرمی، آکسیجن اور نائٹروجن کا عمل غرض یہ کہ بے شمار عوامل اپنی اپنی جگہ سے ایک بیج کے دانے پر اپنی قوتیں صرف کر رہے ہیں، اگر سورج کی گرمی کم یا زیادہ ہو جاتے، اگر زمین کی زرخیزی کم یا زیادہ ہو جاتے، اگر سمندر سے بادل آکر بارش نہ برسائیں اور موسم ٹھیک ٹھیک وقت پر اس بیج کی چاکری نہ کریں تو اناج کا یہ دانہ اور کسی بیج کا کوئی پودا کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ معلوم یہ ہوا کہ سمندر، ہوا، بارش، سورج، زمین مختلف گیسیں اور اسی طرح بے شمار مختلف قوتیں کسی ایسی بڑی قوت کے ماتحت ہیں جو انہیں ایک نظام میں باندھے ہوئے ہے جس نظام کے تحت یہ ٹھیک ٹھیک وقت پر ٹھیک ٹھیک نسبت سے باہمی تعاون کرتے ہوئے اس بیج کی چاکری کرتی ہیں اور وہ بیج پودے کی شکل میں زمین سے بڑھتا ہے، بیچارے کسان کا کام تو صرف اتنا ہی ہے کہ زمین کو نرم کرنے کے بعد اس میں بیج ڈال دے اور پھر اناج کے لیے خدا کی رحمت کا منتظر رہے۔ یہ بات قرآن مجید میں یوں بیان کی گئی ہے :-

أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۔ أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ۔ لَوْ

"کیا تم نے دیکھا ہے جو تم کاشت کرتے ہو، کیا تم اگاتے ہو؟ یا اسے اگانے والے ہم ہیں؟

نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ - اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ - (الواقعہ: ۶۳ تا ۶۷)

اگر ہم چاہیں تو ہم اسے خاک کر ڈالیں اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ۔ اور یوں کہو کہ ہم پہ تو تاوان پڑ گیا بلکہ ہم تو محروم ہیں۔"

تو معلوم ہُوا کہ کاشت کرنا تو انسان کے بس میں ہے لیکن کھیتی کا اُگانا اور پودے کو بڑھانا انسان کے بس میں نہیں ہے۔

پھر نباتات میں بھی زندگی کا پُورا انتظام موجود ہے۔ قرآن مجید نے آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے اِس نظام کی نشان دہی کی بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ ان میں بھی نر و مادّہ موجود ہیں۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ - (لقمان - ۱۰)

"ہم نے آسمان سے پانی برسایا اور اس زمین میں نباتات اُگائے جس میں کہ ہر قسم کا عمدہ جوڑا موجود ہے۔"

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند | تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
همه از بهرِ تو سرگشته و فرماں بردار | شرطِ انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نہ بری

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ ٥ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ٥ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ٥ (عبس: ۲۴ تا ۲۶)

"انسان اپنی خوراک کی طرف تو دیکھے (کہ کہاں سے آئی)، ہم ہی نے پانی برسایا (جی بھر کر) —— پھر زمین کو پھاڑ دیا (بیج کے اندر سے پودا زمین کو چیرتا ہُوا باہر نکلا)۔

فصل ج

حیوانات

یُوں معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز انسان کی خدمت کے لیے بنائی گئی ہے۔ زمین پر بے شمار قسم کے جانور پیدا کیے گئے اور ان کی ساخت بتاتی ہے کہ یا تو یہ سواری کے لیے بنائے گئے ہیں یا باربرداری کے لیے۔ اور یا پھر خوراک کا کام دے سکتے ہیں۔

قرآن مجید میں ہے :

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً	"یقیناً تمہارے لیے چوپایوں میں عبرت ہے۔
نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا مِنْ بَيْنِ	ان کے پیٹوں میں گوبر اور خون کے درمیان سے
فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا	خالص دُودھ ہم تمہیں پلاتے ہیں جو پینے
لِلشّٰرِبِيْنَ ۝ (النحل : ۶۶)	والوں کے لیے خوشگوار ہے۔"

سچّی بات یہ ہے کہ اگر دُودھ کی پیدائش کے نظام پر ہی غور کیا جائے تو انسان ششدر رہ جاتا ہے۔ پیٹ میں ایک طرف ناپاک اور غلیظ گوبر اور دوسری طرف بدبُودار خون۔ لیکن ان دونوں کے درمیان جو چیز پیدا ہو رہی ہے وہ انتہائی صاف، خوشگوار اور خوشبودار ہے اور انسانی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اگر انسانی عقل ضد کی وجہ سے اندھی نہ ہو گئی ہو تو ایک ایسی ہستی کا وجود جو ماؤں میں مامتا پیدا کر دیتا ہے اور مامتا کے ذریعے دُودھ پلا دیتا ہے، سُورج کی روشنی سے زیادہ عیاں نظر آتا ہے۔

انسان کی بساط تو فقط اتنی ہے کہ وہ ایک مکھّی تک پیدا نہیں کر سکتا۔ پیدا تو کیا کرے گا اگر مکھّی اس کے کھانے میں سے کچھ چھین کر لے جائے تو وہ بھی واپس نہیں لا سکتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ	"وہ لوگ جو اللہ کے علاوہ اُن دُوسروں کو
اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا	پکارتے ہیں مکھّی بھی کبھی پیدا نہیں کر سکتے۔

لَهٗ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۔ (الحج - ۷۳)

چاہے سارے اس کام کے لیے اکٹھے کیوں نہ ہو جائیں۔ اور اگر کوئی مکھّی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ واپس نہیں لے سکتے ۔"

باب ۵

تخلیقِ انسانی

اللہ تعالیٰ کے وجود کی نشانیوں میں سے ایک بہت اہم نشانی خود انسان کا اپنا وجود ہے چنانچہ قرآن مجید میں ہے :

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ۔ ''اور زمین میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں۔

وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ اور خود تمہاری اپنی ذات میں اللہ کے وجود کی نشانیاں ہیں کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟''

(الذّاریات: ۲۰ تا ۲۱)

قرآن مجید میں کئی جگہ یہ دلیل دی گئی ہے کہ انسان سرے سے موجود ہی نہیں تھا، یہ ناچیز تھا اس کو پیدا کیا گیا :

وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا۔ (مریم: ۹) ''مَیں نے تجھے پیدا کیا اور تُو تو کچھ بھی نہیں تھا (سرے سے موجود ہی نہیں تھا)۔''

ایک اور جگہ یوں بیان کیا گیا :

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ○ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا۔

''کیا انسان پر زمانے میں ایسا لمحہ بھی آیا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں تھا، ہم نے اُسے ایک بُوند سے پیدا کیا تاکہ اُسے آزمائیں۔ چنانچہ ہم نے اُس ایک بُوند کو سمیع و بصیر بنا دیا۔''

(الدّہر: ۱ تا ۲)

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مادّہ پرست لوگوں کا یہ نظریہ کہ مادّہ (Matter) اپنے آپ کو

پیدا بھی کرتا ہے، اپنے آپ کو سنبھالتا بھی ہے اور اپنے حال اور مستقبل کا انتظام بھی خود ہی کر لیتا ہے۔ یہ نظریہ قرآن کی اس دلیل کے سامنے کس حد تک ٹھہر سکتا ہے؟ قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ اپنے اندر جھانک کے دیکھو۔ اگر مادّے میں اپنے آپ کو پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے تو تم تو مادّہ ہی ہو تمہارا وجود بھی تو مادّی اشیا ہی سے بنا ہوا ہے۔ ذرا سوچو کیا تم نے اپنے آپ کو خود پیدا کیا ہے اور اپنے آپ کو خود ہی نشوونما دی ہے؟ تمہارے جسم میں اعضائے رئیسہ یعنی دل، دماغ، جگر اور پھیپھڑے ایک مسلسل عمل میں مشغول ہیں۔ کیا ان سب کو تم حرکت دیتے ہو؟ تم مادہ ہو، تم اس خون کو جو کہ شریانوں میں دوڑ رہا ہے کیا خود دوڑا رہے ہو؟ ذرا انصاف سے اپنے اندر جھانک کے دیکھو کہ تمہارے بدن کا یہ سارے کا سارا انتہائی پیچیدہ نظام کیا صرف داخلی طور پر خود بخود چل رہا ہے؟ کیا کہیں کوئی باہر کی قوت تو اس پر اثر انداز نہیں ہو رہی؟ تمہارے چہرے پر تمہاری مرضی کے خلاف پسینہ آ جاتا ہے۔ روکنے کی کوشش کرتے ہو لیکن آنکھوں میں آنسو آ ہی جاتے ہیں۔ تمہارے بس سے باہر ہے کہ اپنے بالوں کو سفید نہ ہونے دو۔ تم خود مادّہ ہو تمہارا اختیار تو تمہارے جسم کے ایک بال پر بھی نہیں ہے۔ تم کہتے ہو کہ مادہ اپنے آپ کو خود ہی پیدا کر لیتا ہے لیکن اپنی پیدائش کا وقت تو تمہیں یاد بھی نہیں ہو گا اور یہ پیدائش جن مرحلوں سے اور جن مرحلوں سے گزر کر آتی ہے اگر ان پر غور کرنے لگو تو بہت ہی شرما جاؤ۔ قرآن مجید سوالیہ انداز میں دعویٰ کرتا ہے:

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ	"ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے پس کیا تم اس کی
اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ـ ءَاَنْتُمْ	تصدیق نہیں کرتے؟ کیا تم نے دیکھا ہے وہ قطرہ
تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ـ	جو تم عورت کے رحم میں ٹپکاتے ہو؟ کیا ان قطروں
(الواقعہ: ۵۸، ۵۹)	کو تم پیدا کرتے ہو یا انہیں پیدا کرنے والے
	ہم ہیں؟"

قرآن مجید کی دلیل یہ ہے کہ مادّے کے بارے میں یہ دعوے کہ اس میں تخلیقی صلاحیت موجود ہے مادّے کے قریبی مطالعے کے بعد رد ہو جاتا ہے۔ مادّے کا انتہائی قریبی مطالعہ صرف اس طرح سے

کیا جا سکتا ہے کہ انسان اپنے قریب ترین مادّے کو دیکھ لے۔ مادہ کا اس سے زیادہ صحیح اور قریبی مطالعہ ہرگز ممکن ہے کہ انسان خود اپنے ہی مادّے پر غور کرے اور اپنے نفس سے ہی یہ فیصلہ لے لے کہ کہیں وہ تخلیق میں کسی بیرونی قوت کا محتاج تو نہیں ہے۔

اگر ہر چیز اپنے آپ کو خود پیدا کر سکتی، اپنے آپ کو خود ہی چلا سکتی اور اپنے آپ کو خود ہی سنبھال سکتی تو پھر انسان سے تو بہتر کوئی مادی چیز اس دنیا میں نظر نہیں آتی۔ انسان اپنے آپ کو پیدائش کے ابتدائی مراحل سے لے کر آخری منازل تک خود ہی اپنے آپ کو گزارلاتا، خود ہی قطرہ بن کے ٹپکتا۔ خود ہی خون کا لوتھڑا بن جاتا۔ اپنی مرضی سے ہی گوشت کا لوتھڑا بن جاتا پھر اپنی مرضی سے ہی ہڈیاں پیدا کر لیتا، چاہتا تو عورت بننے کی بجائے مرد بن جاتا۔ مرد کی بجائے عورت بن جاتا۔ سیاہ فام بننے کی بجائے انتہائی سُرخ و سفید رنگ کا بن جاتا۔ اپنی آنکھیں اور ناک نقشہ اپنی مرضی سے انتہائی خوبصورت بناتا۔ دنیا میں کوئی چپٹی ناک والا انسان نظر نہ آتا، کوئی سیاہ رنگ کا انسان نظر نہ آتا، کوئی شخص بھی کُند ذہن کمزور اور کسی صلاحیت سے عاری نہ ہوتا۔ ہر شخص دُنیا میں بیک وقت حُسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ اور یدِ بیضا سے آراستہ ہوتا، ارسطو کی سی ذہانت اور رُستم کی سی طاقت کا مظہر بن کر پیدا ہوتا پھر پیدائش کے بعد بڑھتا ہی چلا جاتا۔ کوئی شخص ٹھگنا نہ رہتا اور چونکہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی اہلیت کا دعویٰ رکھتا ہے اس لیے کبھی بیمار نہ ہوتا۔ جسم پر کوئی سفید بال نہ اُگنے دیتا۔ اس کا دل اس کی مرضی سے حرکت کرتا، اس کے پھیپھڑے اُس کی اجازت سے خون صاف کرتے۔ جس چیز کو چاہتا کھا لیتا اور ہضم کر ڈالتا، بڑھاپے کے آثار کبھی اُس کے چہرے پر نمایاں نہ ہوتے، ضعف اور کاہلی کو قریب بھی نہ پھٹکنے دیتا اور موت تو بہت تکلیف دہ چیز ہے اس کا عمل دخل زندگی سے ختم کر دیتا۔

لیکن انسان اگر آنکھیں کھول کر دیکھے تو حالات کا رُخ کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ انسان خود مادّہ ہے اور یہ مادّہ اپنے آپ سے باغی ہے اس کا کنٹرول ٹاور (Control Tower) اس کے جسم سے کہیں باہر ہی معلوم ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں اس دلیل کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے:-

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ   "کیا یہ لوگ بغیر کسی چیز کے پیدا کیے گئے ہیں

هُمُ الْخَالِقُوْنَ ۔ (الطور: ۳۵) یا یہ لوگ اپنے پیدا کرنے والے خود ہیں"؟

پھر انسان یہ بھی تو سوچے کہ جس مادّے سے وہ بنا ہُوا ہے وہ انتہائی بے جان مادّہ ہے۔ اگر انسان کے جسم کا کیمیائی تجزیہ کیا جائے تو انسانی جسم کچھ دھاتوں، کچھ نمکیات اور کچھ پانی پر مشتمل ہے یہ دھاتیں، یہ نمکیات اور یہ پانی ہر جگہ سے عام مل سکتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ انسانی جسم میں یہ سب اجزا کس تناسب اور کس ترکیب سے پائے جاتے ہیں۔ ان سب اجزا میں کہیں بھی زندگی کی رمق نظر نہیں آتی۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ انہیں بے جان اجزاء کو ایسی ترتیب، ایسی ترکیب اور ایسے مرحلوں سے گزارا جاتا ہے کہ یہ بے جان مادہ ایک خود شناس اور عقل مند انسان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ وہ انسان جو زندگی اور زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور ہے۔ اس کی توجیہ قرآن مجید کے اس دعوے کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۔ (البقرہ - ۲۸)

"تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم تو مُردہ تھے (مُردہ اجزا پر مشتمل تھے) چنانچہ اُس نے تمہیں زندہ کیا"۔

بے جان مادّے میں زندگی کیسے پیدا ہو گئی، یہ ایک اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ فلسفے کی تاریخ اور جدید ترین سائنس کی تحقیق اس مسئلہ کے حل سے ابھی تک عاجز ہے۔

آئیے اب تخلیقِ انسانی کے مراحل کو قرآنِ مجید کی نظر سے کچھ تفصیلاً دیکھیں۔ اللہ فرماتے ہیں:۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۔ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا

"ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے بنایا پھر ہم نے اسے نطفہ کی شکل میں ایک مدتِ معینہ تک ایک محفوظ مقام میں رکھا پھر ہم نے نطفہ سے خون کا لوتھڑا پیدا کیا پھر ہم نے خون کے لوتھڑے سے گوشت کی بوٹی کو پیدا کیا پھر اس بوٹی (کے بعض اجزا) سے ہڈیاں پیدا کیں۔

آخَرَ۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔ (المومنون: ۱۲ تا ۱۴)	پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا پھر ہم نے (اس میں رُوح ڈال کر) اس کو ایک دوسری ہی طرح کی مخلوق بنا دیا۔ سو کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام صنّاعوں سے بڑھ کر ہے!
قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ۔ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ، مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ۔ (عبس ۱۷ تا ۱۹)	"مارا جائے انسان، کیسا ناشکرا ہے کس چیز سے بنایا اس کو؟ ایک بُوند سے! اسے پیدا کیا اور پھر اسے خاص اندازہ پر رکھا۔"
مَالَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا۔ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا۔ (نوح: ۱۳، ۱۴)	"تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے لیے کسی وقار کی توقع نہیں رکھتے حالانکہ اُس نے طرح طرح سے تمہیں بنایا ہے۔"

پُورے نظامِ کائنات کو چھوڑ کر آدمی صرف اپنی ہی پیدائش پر غور کرے تو معلوم ہو جائے کہ ایک ایک انسان کی ہستی میں اللہ کی حقیقی اور واقعی تدبیر ہر وقت بالفعل کارفرما ہے اور ہر ایک کے وجود اور نشوونما کا ایک ایک مرحلہ اس کے ارادی فیصلے پر ہی طے ہوتا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک لگے بندھے قانون پر ہو رہا ہے جس کو ایک اندھی بہری بے علم و بے ارادہ فطرت چلا رہی ہے۔ لیکن وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انہیں نظر آئے کہ ایک ایک فردِ انسانی جس طرح وجود میں آتا ہے اور پھر جس طرح وہ وجود کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے اس میں ایک حکیم و قادرِ مطلق ہستی کا ارادی فیصلہ کس شان سے کام کر رہا ہے۔ آدمی جو غذا کھاتا ہے اس میں کہیں انسانی تخم موجود نہیں ہوتا، نہ اُس میں کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جو نفسِ انسانی کے خواص پیدا کرتی ہو۔ یہ غذا جسم میں جا کر کہیں بال، کہیں گوشت اور کہیں ہڈی بنتی ہے، اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر یہی اُس نطفے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس کے اندر انسان بننے کی استعداد رکھنے والے تخم موجود ہوتے ہیں۔ ان تُخموں کی کثرت کا حال یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک مرد سے جتنا نطفہ خارج ہوتا ہے اُس کے اندر کئی کروڑ تخم پائے جاتے ہیں اور ان

میں سے ہر ایک بیضہ انثیٰ سے مل کر انسان بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر یہ کسی حکیم و قدیر اور حاکمِ مُطلق کا فیصلہ ہے جو اِن بے شمار اُمیدواروں میں سے کسی ایک کو کسی خاص وقت پر چھانٹ کر بیضۂ اُنثیٰ سے ملنے کا موقع دیتا ہے اور اس طرح استقرارِ حمل رونما ہوتا ہے۔ پھر استقرار کے وقت مرد کے تخم اور عورت کے بیضی خلیے (Egg Cell) کے ملنے سے جو چیز ابتداءً بنتی ہے وہ اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ خُوردبین کے بغیر نہیں دیکھی جا سکتی۔ یہ حقیر سی چیز ۹ مہینے اور چند روز میں رحم کے اندر پرورش پا کر جن بے شمار مرحلوں سے گزرتی ہوئی ایک جیتے جاگتے انسان کی شکل اختیار کرتی ہے اُن میں سے ہر مرحلے پر غور کرو تو تمہارا دل گواہی دے گا کہ یہاں ہر آن ایک حکیمِ فعّال کا ارادی فیصلہ کام کرتا رہا ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کس کو زندہ نکالنا ہے اور کس کو مُردہ۔ کس کو معمولی انسان کی صورت و ہیئت میں نکالنا ہے اور کسے اَن گنت غیر معمولی صورتوں میں سے کوئی صورت دے دینی ہے۔ کس کو صحیح و سالم نکالنا ہے اور کسے اندھا، بہرا، گونگا یا ٹنڈا اور لُنجا بنا کر پھینک دینا ہے۔ کس کو خوبصورت بنانا ہے اور کسے بدصورت۔ کس کو مرد بنانا ہے اور کس کو عورت۔ کس کو اعلیٰ درجے کی قوّتیں اور صلاحیّتیں دے کر بھیجنا ہے اور کسے کودن اور کُند ذہن پیدا کرنا ہے۔ یہ تخلیق و تشکیل کا عمل، جو ہر روز کروڑوں رحموں میں ہو رہا ہے، اس کے دوران میں کسی وقت کسی مرحلے پر بھی ایک خدا کے سوا دُنیا کی کوئی طاقت ذرّہ برابر اثر انداز نہیں ہو سکتی، بلکہ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کس پیٹ میں کیا چیز بن رہی ہے اور کیا بن کر نکلنے والی ہے۔ حالانکہ انسانی آبادیوں کی قسمت کے کم از کم ۹۰ فیصدی فیصلے انہی مراحل میں ہو جاتے ہیں، افراد ہی کے نہیں، قوموں کے، بلکہ پوری نوعِ انسانی کے مستقبل کی شکل بناتی اور بگاڑی جاتی ہے۔ اس کے بعد جو بچّے دنیا میں آتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ فیصلہ کون کرتا ہے کہ کسے زندگی کا پہلا سانس لیتے ہی ختم ہو جانا ہے، کسے بڑھ کر جوان ہونا ہے؟ یہاں بھی ایک غالب ارادہ کارفرما نظر آتا ہے اور غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی کارفرمائی کسی عالمگیر تدبیر و حکمت پر مبنی ہے جس کے مطابق وہ افراد ہی کی نہیں، قوموں اور ملکوں کی قسمت کے بھی فیصلے کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کسی کو

اس امر میں شک ہے کہ اللہ "حق" ہے اور صرف اللہ ہی "حق" ہے تو بے شک وہ عقل کا اندھا ہے۔

"کوئی خالی الذہن آدمی بچے کو ماں کے رحم میں پرورش پاتے دیکھ کر یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ یہاں وہ انسان تیار ہو رہا ہے جو باہر جا کر عقل، دانائی اور حکمت وصنعت کے یہ کچھ کمالات دکھائے گا اور ایسی ایسی حیرت انگیز قوتیں اور صلاحیتیں اس سے ظاہر ہونگی۔ وہ ہڈیوں اور گوشت پوست کا ایک پلندا سا ہوتا ہے جس میں وضعِ حمل کے آغاز تک زندگی کی ابتدائی خصوصیات کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ نہ سماعت، نہ بصارت، نہ گویائی، نہ عقل وخرد، نہ کوئی خوبی۔ مگر باہر آکر وہ چند ہی روز میں کچھ اور بن جاتا ہے جس کو پیٹ والے جنین سے کچھ مناسبت نہیں ہوتی۔ اب وہ ایک سمیع وبصیر اور ناطق وجود ہوتا ہے۔ اب وہ تجربے اور مشاہدے سے علم حاصل کرتا ہے۔ اب اس کے اندر ایک ایسی خودی اُبھرنی شروع ہوتی ہے جو بیداری کے پہلے ہی لمحہ سے اپنی دسترس کی ہر چیز پر حکم جتاتی اور اپنا زور منوانے کی کوشش کرتی ہے۔ پھر وہ جوں جوں بڑھتا جاتا ہے، اُس کی ذات میں یہ "چیزے دیگر" ہونے کی کیفیت نمایاں تر اور افزوں تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ جوان ہوتا ہے تو بچپن کی بہ نسبت کچھ اور ہوتا ہے۔ ادھیڑ ہوتا ہے تو جوانی کے مقابلے میں کچھ اور چیز ثابت ہوتا ہے۔ بڑھاپے کو پہنچتا ہے تو نئی نسلوں کے لیے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کا بچپن کیا تھا اور جوانی کیسی تھی؟ اتنا بڑا "تغیر" کم از کم اِس دنیا کی دوسری مخلوق میں واقع نہیں ہوتا۔ کوئی شخص ایک طرف کسی پختہ عمر کے انسان کی طاقتیں اور قابلیتیں اور کام دیکھے اور دوسری طرف یہ تصوّر کرے کہ پچاس ساٹھ برس پہلے ایک روز جو بوند ٹپک کر رحمِ مادر میں گری تھی اس کے اندر یہ کچھ بھرا ہوا تھا، تو بے اختیار اس کی زبان سے وہی بات نکلے گی۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔"

(تفہیم القرآن، ج ۳: ص ۲۶۹)

انسانی تخلیق سے متعلق قرآن مجید میں ایک اور اہم نکتہ کی طرف بھی اشارہ موجود ہے:

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ

"اس کی بادشاہی ہے آسمانوں اور زمین پر۔ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ کسی کو بچیاں عطا فرما دیتا ہے

إِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَاءُ الذُّكُوْرَ ۙ	اور کسی کو لڑکے عطا فرما دیتا ہے کسی کو لڑکے
أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّإِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ	اور لڑکیاں دونوں عطا فرما دیتا ہے اور چاہتا
مَنْ يَّشَاءُ عَقِيْمًا ۭ إِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ۔	ہے تو کسی کو بانجھ بنا دیتا ہے۔ بے شک وہ
(الشوریٰ: ۴۹، ۵۰)	خوب جاننے والا اور خوب قدرت رکھنے والا ہے"۔

یہ بات کہ ماں کے پیٹ میں نر پیدا ہو یا مادّہ سوائے خدا کے کسی اور کے بس میں نہیں ہے ورنہ دنیا میں کوئی عورت نظر نہ آتی۔ پھر انسانوں کی تعداد میں ایک خاص قسم کا تناسب اور توازن نظر آتا ہے۔ ہر زمانے میں اور ہر خطّے میں جتنے مرد پیدا ہوتے ہیں قریب قریب اتنی ہی تعداد میں عورتیں پیدا ہوتی ہیں، کبھی ایسا نہیں ہُوا کہ کسی علاقے میں صرف مرد ہی مرد پیدا ہو گئے ہوں، یا عورتیں ہی عورتیں پیدا ہو گئی ہوں اور نہ کبھی ایسا ہُوا ہے کہ مردوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہو کہ انہیں عورتیں کسی باہر ہی کے خطّے سے درآمد کرنا پڑیں اور نہ کبھی عورتوں کی تعداد اس قدر بڑھی ہے کہ انہیں مرد باہر سے درآمد کرنا پڑیں اور یہ بس آج کل ہی کی بات نہیں ہزار ہا سال سے عورتوں اور مردوں کی تعداد ٹھیک ٹھیک توازن اور تناسب سے چلی آ رہی ہے۔ یہ توازن اور تناسب کہاں سے آ گیا۔ اگر یہ توازن اور تناسب انسان کے بس میں ہے تو لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ مرد یا عورت بن جانا انسان کے اپنے بس کی بات ہوتی اور اگر یہ سب کچھ انسان کی اپنی مرضی سے ہوتا تو دنیا میں کوئی شخص عورت بن کر پیدا نہ ہوتا، سب مرد ہی مرد پیدا ہوتے اور عورت کا وجود ہی ختم ہو جاتا۔ اور اگر عورت کا وجود نہ ہوتا تو انسانی نسل ہی ختم ہو جاتی پس اگر انسان کی تخلیق اس کی مرضی پر چھوڑ دی جاتی تو انسان ختم ہو جاتا۔

چنانچہ ثابت ہُوا کہ انسان کی تخلیق اُس کی اپنی مرضی سے نہیں ہوتی بلکہ کسی اور کی مرضی سے ہوتی ہے۔ اُس ذات کی مرضی سے، اُس خالق کی مرضی سے، جو کروڑوں ہزاروں مردوں اور عورتوں کی تعداد میں توازن اور تناسب رکھتا ہے اور ایک بہترین منصوبہ ساز ہے۔ یہاں سے یہ بات بھی

ثابت ہوئی کہ مردوں اور عورتوں کی پیدائش کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں اور نہ کسی حادثہ کا کرشمہ ہے ورنہ ان کی باہمی تعداد میں ایسا توازن اور تناسب جو دنیا کے ہر خطے میں پایا جاتا ہے اور ہزار ہا سال سے پایا جاتا ہے، نظر نہ آتا۔

اولاد کی خاطر لوگ کس قسم کے پاپڑ بیلتے ہیں مگر جب تک اللہ کا حکم نہ ہو یہ امر ناممکن ہے —— وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا —— اگر مادے میں اپنے آپ تخلیقی قوت ہونے کا عنصر ہے تو ہر جوڑے کے ہاں بچہ پیدا کیوں نہیں ہوتا ؟

باب ۶

تنوّع

اللہ تعالیٰ کے وجود کی ایک بہت بڑی نشانی اس کائنات کی تمام اشیاء میں تنوّع ہے۔ ہر چیز ایک ذاتی حُسن لیے ہُوتے ہے۔ وہ حُسن جو اس سے پہلے کسی چیز کو نصیب نہیں ہُوا۔ مختلف اقسام کے جمادات، نباتات، حیوانات موجود ہیں۔ پھر ان نباتات میں کوئی ایک قسم دوسری قسم سے نہیں ملتی۔ ایک ہی زمین ہے۔ ایک ہی آب و ہوا، ایک ہی موسم، لیکن مختلف رنگوں، مختلف ذائقوں اور مختلف شکلوں کی نباتات اُگ رہی ہیں۔

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ قف وَنُفَضِّلُ بَعْضَھَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُکُلِ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔ (الرعد: ۴)

"اور زمین میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ٹکڑے (جزیرے) ہیں، اور انگوروں کے باغ ہیں جن میں بعض تو ایسے ہیں کہ ایک تنہ سے اوپر جاکر دو تنے ہو جاتے ہیں اور بعض میں دو تنے نہیں ہوتے۔ اور سب کو ایک ہی طرح کا پانی دیا جاتا ہے اور ہم ایک کو دوسرے پر پھلوں میں فوقیت دیتے ہیں۔ ان باتوں میں سمجھداروں کے لیے (توحید کے) دلائل موجود ہیں۔

یہی حال حیوانات کا ہے۔ ہر علاقے میں مختلف قسم کے حیوانات اور پھر ایک ہی علاقہ میں ایک ہی قسم کے حیوانات کی شکلیں بھی آپس میں نہیں ملتیں۔ ہر جاندار اپنی جگہ پر تخلیق و تسویہ کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک ہرن اپنی جگہ پر نہایت خوبصورت ہے لیکن خوبصورتی کا یہ ڈیزائن اس کی ذات پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے ہم جنس جتنے بھی ہرن ہونگے سب الگ الگ ڈیزائن اور الگ الگ

شکل وصورت لے کر پیدا ہونگے۔کسی کی شکل دوسرے ہرن سے نہیں ملتی ہوگی اور سبھی حسن و رعنائی کا نمونہ ہوں گے۔

عام طریقہ یہ ہے کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی یا بڑی سے بڑی فیکٹری کیوں نہ ہو اس میں تخلیقی اعتبار سے بہت بڑا مسئلہ نقش آرائی (Designing) کا ہوتا ہے۔فیکٹری جتنی معمولی سطح کی ہوگی اس کی تیار کردہ اشیاء کے ڈیزائن اسی قدر کم ہونگے، اور فیکٹری جس قدر اعلیٰ درجہ کی ہوگی اس کی مصنوعات کے ڈیزائن اسی قدر زیادہ اور متنوّع ہونگے لیکن ہر فیکٹری محدود تعداد میں ڈیزائن رکھنے پر مجبور ہے۔اس کے آرٹسٹوں کی صلاحیتیں اس قدر محدود ہیں کہ چند ڈیزائن بنا لینے کے بعد وہ بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔بس آخر میں یہی ہوتا ہے کہ ایک ڈیزائن چل نکلا اور تمام اشیاء اسی ڈیزائن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تیار ہو رہی ہیں۔تمام اشیاء بالکل ایک جیسی شکل کی، دو اشیاء کو بغیر خاص نشان لگاتے رکھ دیجیے، ان میں پہچان کرنا مشکل ہوگا۔آخر کار تخلیق کے عمل میں اس قدر ہم رنگی (Monotony) پیدا ہو جاتی ہے کہ خود فیکٹری کے مالک و منتظم اسی ڈیزائن کو دیکھ دیکھ کر تنگ آجاتے ہیں اور نئے ڈیزائن کی تیاری کے لیے بھاری رقمیں پیش کرتے ہیں۔

اب فطرت کے خلاقِ اعظم کی تخلیقی فن کاریوں کا تماشہ دیکھیے، دنیا میں جتنی اشیاء بنائیں سب الگ الگ ڈیزائن کی کوئی بڑے پیمانے پر تیاری (Mass Production) کا کاروبار نہیں ہے کہ سب اشیاء مجبوراً ایک ہی ڈیزائن کی بنانا پڑیں اور نئے ڈیزائن بنانے سے تخلیقی قوت عاجز آگئی ہو۔اس تنوّع کو قرآن مجید وجودِ خدا کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ	اور اس کی نشانیوں میں آسمانوں اور زمین کی
الْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ	پیدائش اور زبانوں اور رنگوں کا اختلاف
اَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ	بھی ہے۔بے شک اس میں جاننے والوں
لِّلْعٰلِمِيْنَ ۔ (الروم: ۲۲)	کے لیے دلائل توحید ہیں۔

یعنی زبانوں اور رنگوں کا اختلاف اس کے وجود کی نشانی ہے۔دنیا میں ہزاروں سال سے

کروڑہا انسان پیدا ہو رہے ہیں۔ ہر انسان علیحدہ شکل، علیحدہ بناوٹ رنگت لیے ہوتے ہے۔ کسی انسان کی آواز دوسرے سے نہیں ملتی۔ وہی گلا ہے، ایک ہی قسم کی کیمیائی اجزاء سے مرکب، بناوٹ میں بھی ایک ہی ترتیب لیکن آواز ہمیشہ مختلف۔ بولیاں ہیں تو مختلف، زبانیں ہیں تو مختلف، گفتگو کا انداز ہے تو مختلف۔ ہر چیز نئے انداز پر، نیا حسن و رعنائی لیے ہوتے پیدا ہوتی ہے۔ نئے سے نیا ڈیزائن۔ کوئی درخت اپنی شکل میں دوسرے درخت سے نہیں ملتا۔ کوئی پھول دوسرے پھول سے نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ ایک ہی پھول کی کوئی پتّی کسی دوسری پتّی کی ہم شکل اور ہم صورت نہیں۔

وہ کائنات جس میں کھربوں پتّوں میں سے کوئی پتّا صحیح طور پر دوسرے سے نہ ملتا ہو اور تخلیقی تنوّع کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہر طرف موجزن ہو، کیا خود اس بات کی نشانی نہیں ہے کہ اس رنگا رنگ کائنات کا ایک ایسا خالق ہے جس کی تخلیقی قوّت بے حد و بے کنار ہے اور جس کے بارے میں ہر صحیح العقل انسان یہ کہنے پر مجبور ہو:

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔ (المؤمنون: ۱۴) پس بڑی شان والا ہے وہ اللہ جو تمام صنّاعوں سے زیادہ بڑھ کر صنّاع ہے۔

؎ برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

تنوّع میں نظم

حیوانات اور نباتات کے اس عظیم تنوّع میں کمال نظم و ضبط بھی موجود ہے۔ ایک ماہر حیوانات رسل لوپل مائکٹر کے محتاط اندازے کے مطابق تقریباً دو لاکھ اقسام پودوں کی ہیں اور دس لاکھ اقسام حیوانات کی ہیں۔ ان دس لاکھ اقسام میں سے صرف ایک صنف ہی کو لے لیں تو اسے بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور ہر صنف کی خصوصیات اس کے ہر فرد میں ملیں گی۔ ایک بلّی میں جو اوصاف ہیں وہ تمام دنیا کی بلّیوں میں پائے جائیں گے۔

نظریّہ جین

دورِ جدید میں جین سے متعلق تحقیقات نے تو انسان کو حیرت میں ہی ڈال دیا ہے۔

رجین تمام زندہ اشیاء کے خلیوں میں موجود اور ان کے جوہری ذرّات کی ان ترتیبوں پر مشتمل ہوتے ہیں جنہیں خوردبین تک سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہی جین اشیا کی ساخت، ان کی صفات اور ان کی وراثتی خصوصیات کے امین ہوتے ہیں۔ یہ انتہائی چھوٹے جراثیم جنہیں ہم جین کہتے ہیں اس دُنیا کی تمام انسانی، حیوانی اور نباتاتی خصوصیات کے سرچشمے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کے اربوں انسانوں کی انفرادی خصوصیات کے یہ بنیادی پیکر حجم میں اس قدر باریک ہیں کہ اگر ان سب کا اجتماع ممکن ہو تو ان کے لیے اُنگلی بھر جگہ کافی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ جین اپنے اَن گنت اسلاف کی تمام جسمانی وراثت، ان کی ذہنی، روحانی اور نفسیاتی خصوصیات اپنے وجود میں بحفاظت برقرار رکھتے اور انہیں پروان چڑھانے کی ناقابلِ یقین صلاحیت رکھتے ہیں۔

مگر وہ کیا چیز ہے جو محفوظ رکھی جاتی ہے اور وراثت کی شکل میں آگے کی نسلوں کو منتقل کر دی جاتی ہے؟ وراثت سے متعلق اتنی صحیح ہدایت جراثیم خصوصیات کس طرح اپنے اندر محفوظ رکھ لیتے ہیں؟ ایک جین بے شمار نسلوں میں سفر کرتے ہُوئے اپنی خصوصیات اور صفات کو بحفاظت برقرار رکھتا ہے اور ہر نسل میں اور ہر پیدائش کے عمل میں وہ اپنی سابقہ تاریخ دُہراتا چلا جاتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جین جراثیم کو اتنی باریکی اور صحت کے ساتھ تخلیقی عمل پروان چڑھانے کی ہدایات کہاں سے ملتی ہیں؟ وہ کون سی قوّت ہے کہ اس کے احکام ان جراثیم کے ذریعے خلیّوں تک پُوری صحّت اور وفاداری سے تخلیقی جامہ پہنتے اور اپنے نتائج کی صحت اور تخلیقِ ثانی کی باریکیوں میں ریاضی کی باریک ترین اشکال کو آنکھیں دکھاتے ہیں۔

بیچارے ڈارون اور اس کے ساتھیوں کو جین سے متعلق جدید تحقیقات کا کوئی علم نہ تھا یہی وجہ ہے کہ نظریۂ ارتقاء سے متعلق وہ اس مقام سے آگے نہ بڑھ سکے جہاں سے دراصل ارتقاء کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ وہ مقام خلیّے کی معرفت کا ہے اور خلیہ ہی وہ مسکن ہے جہاں جین قیام کرتا اور فروغ پاتا ہے۔ خلیّہ کی ساخت اور پھر جین کے عمل پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمارا ذہن مادّے کے اندھے بہرے ارتقاء کی طرف نہیں جاتا بلکہ ایک خلّاقِ عظیم کی طرف جاتا ہے

جس نے ارب ہا جراثیمِ خصوصیات کو ایک مثبت، باریک اور انتہائی صحیح نظام کا پابند بنایا ہوُا ہے۔ خلیوّں کی ساخت اور جِین کے عمل کا مطالعہ کرتے ہوُئے یہ سوال بار بار ذہن میں اُبھرتا ہے کہ اگر ارتقاء ایک اوّل اوّل اور اندھی بہری قُوّت ہی کا نام ہے تو اِتنے عظیم اجتماعِ مخلوقات، اتنے وسیع تنوّع میں اس قدر باریک اور صحیح ترین تقسیم اور نظم وضبط کہاں سے آگیا؟

ع "گندم از گندم بروید جو ز جو"

(گندم کے بیج سے گندم ہی پیدا ہوگی اور جَو کے بیج سے جَو)

اور ہر گندم کا بیج اپنی خصوصیات کو اپنے جراثیم خصوصیات کے ذریعے گندم کی اگلی فصل تک ٹھیک ٹھیک پہنچا دیتا ہے ورنہ گندم کی اتنی اقسام نہ ہوتیں اور بیج کی اقسام اوران کی صفات کا اعتبار نہ کیا جاسکتا۔

باب ۷

رُبُوبیّت

اللہ تعالیٰ نے اِس کائنات کو صرف پیدا ہی نہیں فرمایا ہے بلکہ وہی اِس کا پروردگار بھی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں فائدہ مند چیزوں کی موجودگی کے ساتھ ان کی بخشش اور تقسیم کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہر وجود کو اپنی بقا کے لیے جس جس چیز کی ضرورت تھی وہ چیز ٹھیک مقدار میں ٹھیک وقت میں اور ٹھیک ترتیب کے ساتھ اسے مل رہی ہے۔

اِس سلسلہ میں انسان کی پرورش کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے یقینی معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے لیے پیدا کی گئی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے :-

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ (البقرہ : ۲۹)	"وہی ذات ہے جس نے زمین کی ہر چیز کو تمہارے لیے پیدا کیا۔"
اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (لقمان : ۲۰)	"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر اُس چیز کو جو آسمانوں اور زمین میں ہے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے؟ اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں مکمل فرما دی ہیں۔"
يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ۔ (فاطر : ۳)	"اے لوگو، اللہ نے جو نعمتیں تمہیں دی ہیں، انہیں یاد تو کرو۔ کیا اللہ کے علاوہ کوئی اور پیدا کرنے والا بھی ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق پہنچا رہا ہے۔ کوئی معبود نہیں ہے سوائے اُس کے پس تم کہاں اُلٹے پھرے جاتے ہو۔"

قرآن مجید میں یہ بات بار بار دُہرائی گئی ہے کہ کائنات کی ہر چیز کو انسان کے لیے پیدا فرمایا گیا اور ہر چیز کو انسان کے قابو میں دے دیا گیا ہے۔ اپنے اردگرد نگاہ دوڑانے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کائنات کی ہر چیز کوئی نہ کوئی خاصیت ضرور رکھتی ہے اور اُس خاصیت میں انسان کے لیے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہے۔ گویا کائنات کی تمام اشیاء فقط انسان کی چاکری کر رہی ہیں۔

یہ بات اور بھی کھُل کر سامنے آجاتی ہے جب ہم اس انداز میں سوچیں کہ اگر کائنات کی کوئی خاص چیز موجود نہ ہو تو انسان کو کہیں نہ کہیں ضرور کوئی تکلیف ہوتی ہے کیونکہ کائنات کی ہر چیز انسان کی کوئی نہ کوئی ضرورت پُوری کر رہی ہے۔ اگر وہ چیز خدانخواستہ موجود نہ ہو تو انسان کی کوئی نہ کوئی ضرورت ضرور تشنۂ تکمیل رہ جاتے۔ اس کے برعکس اگر انسان موجود نہ ہوتا تو یہ سُورج، یہ چاند، یہ ستارے، یہ سمندر، یہ پہاڑ غرضیکہ کائنات کی کوئی چیز بھی اپنی کسی ضرورت سے بھی محروم نہ رہ جاتی۔ گویا انسان کائنات کی کسی چیز کی کوئی ضرورت پُوری نہیں کر رہا بلکہ کائنات کی ہر چیز انسان کی کوئی نہ کوئی ضرورت پُوری کر رہی ہے، تو معلوم یہ ہُوا کہ انسان قدرت کا تخلیقی شاہکار ہے اور کائنات کو اس انداز سے اور اس ترتیب سے پیدا کیا گیا ہے کہ اُس کی ایک ایک چیز سے اللہ تعالیٰ کی رُبُوبیّت اور پروردگاری جھلک رہی ہے۔ قرآنِ مجید میں اسی لیے ان بے شمار نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اس کے اِردگرد پھیلی ہوئی ہیں اور جن کے بغیر اس کی زندگی اور بقا ناممکن تھی۔

یہ نعمتیں اس ترتیب کے ساتھ دی گئی ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے لیے جن چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی وہ سب سے زیادہ مقدار میں عنایت کی گئیں اور عام کر دی گئیں اور جن چیزوں کی ضرورت جتنی کم تھی وہ اسی طرح پیدا کی گئیں۔ دیکھیے انسانی زندگی کے لیے ہَوا سب سے زیادہ ضروری ہے یہ اتنی زیادہ اور عام ہے کہ کسی وقت بھی کوئی جگہ ہوا کے وجود سے خالی نہیں ہے۔ ہوا کے بعد پانی سب سے زیادہ ضروری تھا تو پانی ترتیب کے اعتبار سے ہوا سے کم مگر دیگر ہر چیز سے زیادہ ہے۔ زمین کے نیچے بھی میٹھے پانی کی نہریں، زمین کے اُوپر بھی دریا اور سمندر کی فضا میں بھی بادل!

پانی کے بعد سب سے زیادہ ضروری چیز غذا تھی۔ چنانچہ ہوا اور پانی سے کم باقی تمام چیزوں سے زیادہ اس کے خوانِ نعمت خشکی اور تری میں بچھے ہوئے ہیں۔

قرآنِ مجید میں اس خوانِ نعمت کی طرف اشارہ ہے:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۙ	"انسان کو اپنی غذا کی طرف تو دیکھنا چاہیے
اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۙ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ	ہم نے بارش کا پانی اُتارا، پھر زمین کو شق کیا
شَقًّا ۙ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۙ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۙ وَّ	اور اس میں ہم نے دانے اُگا دیئے۔ دانے،
زَيْتُوْنًا ۙ وَّنَخْلًا ۙ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ	انگور، سبزیاں، زیتون، کھجور اور باغات کے
وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَ	جُھنڈ کے جُھنڈ اور پھل اور گھاس پھوس جو تمہاری
لِاَنْعَامِكُمْ ۭ	غذا کا سامان بھی ہے اور تمہارے
(عبس ۲۴ تا ۳۲)	چوپائیوں کے لیے بھی"

ایک اور جگہ فرمایا ہے:

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّ	"کیا ہم نے زمین کو بچھونا اور پہاڑوں کو
الْجِبَالَ اَوْتَادًا ۙ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۙ	میخیں نہیں بنا دیا اور ہم نے تمہیں جوڑا جوڑا
وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ وَّجَعَلْنَا	پیدا کیا۔ تمہارے لیے نیند کو باعثِ آرام بنایا۔
الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ	رات کو تمہارے لیے پوشیدگی کا سامان بنایا۔
مَعَاشًا ۠ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا	دن کو روزی کمانے کا سبب بنایا اور تمہارے
شِدَادًا ۙ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۙ	اوپر سات مضبوط آسمان بنا دیئے۔ ایک
وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً	چمکتا ہوا چراغ بنایا اور بادلوں سے موسلا دھار
ثَجَّاجًا ۙ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ	بارش نازل کی تاکہ اس سے ہم اناج، سبزیاں
وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۭ (النّبا: ۶ تا ۱۶)	اور گھنے باغات اُگائیں"

اللہ تعالیٰ کے اس خوانِ کرم کی طرف نگاہ ڈالیے اور پھر بیچارے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی طرف

آیتے۔نظریۂ ارتقا زیادہ سے زیادہ یہی تو کہتا ہے کہ ہر چیز اپنے آپ کو اپنے ماحول میں ڈھالتی چلی جاتی ہے لیکن کیا نظریۂ ارتقاء میں کائنات کے ہر سمت بچھے ہوئے اِس خوانِ کرم کی بھی کوئی توجیہ ہے۔کیا سورج، چاند، تارے، سمندر، پہاڑ ان سب نے اپنے آپ کو ایک ایسے انداز سے ڈھال لیا ہے کہ اپنے آپ کو ختم کر کے انسان کی چاکری کرتے رہیں اور انسانی زندگی اور اس کی بقا کا ہر گھڑی سامان کرتے رہیں۔کائنات میں اس پھیلی ہوئی ربوبیت اور ان خارجی عوامل میں نمایاں ربوبیت آخر نظریۂ ارتقا سے کہاں کہاں میل کھاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی ایک بہت بڑی نشانی یہ بھی ہے کہ اُس نے اوّل تو ہر چیز کا جوڑا جوڑا بنایا۔پھر جانداروں میں بھی جوڑے جوڑے بنائے اور سب سے اہم یہ کہ انسانوں میں بھی جوڑا جوڑا بنایا اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور رحمت ڈال دی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (الروم: ۲۱)

"اُس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اُس نے تم میں سے بیویوں کو پیدا کیا تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان آپس میں محبت اور رحمت ڈال دی۔یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔"

مرد اور عورت کی باہمی محبت ہر معاشرے کی اکائی ہے، ہر خاندان کی ابتدا ہے اور اس میں انسانی نسل کی بقا ہے۔یہ تعلق کچھ ایسا عجیب ہے کہ انسان اس کے لیے ہر قربانی کرنے کو تیار ہوتا ہے۔مرد بیچارہ صبح سے شام تک محنت مزدوری کرتا ہے۔اس محنت مزدوری کا مشکل سے دسواں حصہ وہ اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے باقی ۹ حصے وہ اپنے بیوی بچوں پر نچھاور کر دیتا ہے یہ قربانی کرتے ہوئے کبھی اُس کی پیشانی پر بَل نہیں آتا۔ہر شخص اپنے سینے میں جھانک کر دیکھے کہ

قربانی کا یہ جذبہ جس محبّت کی وجہ سے اس کے دل میں پیدا ہوا ہے وہ اُس کا اپنا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ کہیں باہر سے اس کے دل میں ڈالا گیا ہے ورنہ اس طرح کی قربانی وہ دنیا میں اُن لوگوں کے لیے بھی جو اس کے قریب ترین رشتہ دار ہیں، نہیں کر سکتا تھا۔

اسی طرح سے ماں کی ماتما کا حال بھی بہت عجیب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصٰلُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا۔

"اُس کی ماں نے اُسے تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا اور حمل اور دُودھ چھڑانے کی مدّت کم از کم تیس مہینوں کی ہے" (احقاف: ۱۵)

وہ کونسا آرام ہے جو ماں اپنے لختِ جگر کے لیے قربان نہیں کرتی؟ وہ کون سی تکلیف ہے جو ماں اپنی اولاد کی راحت کے لیے نہیں اُٹھاتی؟ سچّی بات یہ ہے کہ ماتما سے زیادہ پُر جوش اور ناقابلِ تسخیر جذبہ اور کوئی نہیں ہے۔

ماں کے دل میں ماتما کا یہ جذبہ کہاں سے آگیا؟ کسی ماں سے پوچھیے کہ یہ جذبہ کیا اُس نے خود ہی اپنے دل میں پیدا کر لیا ہے یا یہ جذبہ کہیں باہر سے اس کے دل میں ڈالا گیا ہے؟

باپ کی قربانی اور ماں کی ماتما کی توجیہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس رحمٰن و رحیم نے اپنی صفتِ رحمت کا عکس اس کائنات کے جانداروں پر ڈالا اور جہاں وہ معمولی سا عکس ہر ماں کی ماتما کی صورت میں نمودار ہوا وہاں ہر باپ کے ایثار میں ڈھل گیا۔

پھر دیکھیے کہ یہ ماتما کا کوئی بے سر و سامان جذبہ ہی نہیں بلکہ ربُوبیّت کا مکمل مظہر ہے۔ بچّہ پیدا ہوتے ہی ماں نے جس محبّت سے اسے جس سینے سے لگایا وہیں پر بچّے کی غذا کا سرچشمہ موجود ہے۔ بچّہ پستانوں سے دُودھ پینا شروع کر دیتا ہے پھر اس میں بھی نظم و ترتیب ملاحظہ فرمائیے کہ ابتدا میں بچّے کا معدہ کمزور ہوتا ہے تو اسی مناسبت سے دُودھ کا قوام بھی شروع میں پتلا سا ہوتا ہے۔ پھر جُوں جُوں بچّہ بڑھتا جاتا ہے اور اس کا معدہ مضبوط ہوتا جاتا ہے دُودھ کا قوام بھی گاڑھا ہوتا چلا جاتا ہے

اور اس میں چکنائی دار اور مقوی عناصر بڑھتے چلے جاتے ہیں اور جونہی بچہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ دُودھ کے علاوہ بھی کچھ اور غذائیں ہضم کر سکے ماں کا دُودھ بھی خشک ہونے لگتا ہے۔

ماں کی اس قدر منظّم اور مُرتّب مامتا! حالانکہ محبت عام طور پر منظّم اور مُرتّب نہیں ہُوا کرتی، کہاں سے ماں کے وجود میں آئی؟ ماں کے پستانوں میں دُودھ لانے میں ماں کی مرضی کا کس حد تک ہاتھ ہے؟ دُودھ کیا ہُوا کہ مہمان کی آمد کا استقبال ہُوا۔ اِدھر سے بچّہ پیدا ہُوا اُدھر سے دُودھ جاری ہُوا پروردگار کا یہ سارا انتظام اگر پروردگار کی ذات کے بغیر کسی کی سمجھ میں آتا ہے تو بلاشبہ اس شخص کو اپنی سمجھ کا علاج کرانا چاہیے۔ پروردگار کی شان کا ایک اور کرشمہ دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو پیدا فرمانے کے بعد انہیں بغیر کسی رہبر کے یُونہی چھوڑ نہیں دیا بلکہ اُن کے دل میں زندگی گزارنے کا سلیقہ پیدائش کے ساتھ ہی الہام فرما دیا۔ اگر زندگی گزارنے کا یہ سلیقہ اُن کے دل میں نہ ڈالا جاتا تو کوئی بچہ کبھی جوان نہ ہوتا۔ بچّہ پیدا ہوتے ہی ماں کے پستانوں کو چُوسنا شروع کر دیتا ہے۔ اگر چُوسنے کا یہ فن اللہ تعالیٰ اس کے دل میں الہام نہ فرماتا تو دُنیا کی کوئی طاقت بچّے کو دُودھ نہ پلا سکتی۔ صرف انسانوں پر ہی بس نہیں بلکہ تمام جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے ان کی ضرورت کے مطابق ابتدائی ہدایت ان کے دل میں ڈال دی:

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی۔	"وہ ذات جس نے پیدا کیا پھر اُسے درست کر دیا اور جس نے ہر وجود کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا اور پھر اُس پر راہِ عمل کھول دیا۔"
(الاعلیٰ ۲ تا ۳)	

پھر ہر چیز کو اُس کی ضرورت کے مطابق سامان عطا فرمایا۔ چیونٹی کو سُونگھنے کی دُور رس قوّت عطا فرمائی تاکہ وہ دُور دُور جا کر اپنی غذا حاصل کر سکے چیل اور عقاب کو تیز نگاہ عطا فرمائی تاکہ بلندی پر اُڑتے ہُوئے اپنا شکار دیکھ سکے۔

پھر شہد کی مکھیوں کو خاص قسم کا گھر بنانے کی تربیت دی، ایسی شکل کہ اس سے بہتر گھر ڈیزائن کرنا ناممکن ہے۔ کبھی کسی پرندے کے آشیانے کی طرف غور سے دیکھیں اور اُس انجینئرنگ یونیورسٹی کا نام بتائیں جہاں سے اِس قدر عمدہ مکان بنانے کی صلاحیت سے یہ پرندہ بہرہ ور

ہُوا ہے۔

تو جانوروں اور انسانوں میں الہامی علم کی توجیہ اگر خدا کی ذات کے علاوہ کہیں اور ممکن ہے تو ہمیں بھی بتایا جائے، اس لیے کہ ابھی تک فلسفہ اور سائنس سوائے حیرت کے اِس موضوع پر کسی اور توجیہ کا اضافہ نہیں کر سکے۔

حِصّہ دُوم

نظامِ کائنات

باب ۵

یکسانیّت و عمومیّت

ہم جانتے ہیں کہ فطرت کے کچھ قوانین ہیں جو ہر جگہ اور ہر وقت یکساں ہیں۔ زمانہ اور جگہ کی تبدیلی سے ان میں تغیّر واقع نہیں ہوتا۔ زمین کی کششِ ثقل یہاں پر بھی ہے اور یہاں سے دس ہزار میل دُور بھی۔ آج بھی ہے اور آج سے سو سال پہلے بھی تھی اور آئندہ بھی یہ کششِ ثقل اسی طرح سے ہوگی۔ پھر فطرت کے قوانین جس طرح زمان و مکان کی تبدیلی سے نہیں بدلتے، اسی طرح افراد کی تبدیلی سے بھی نہیں بدلتے۔ ایک سائنسدان جب اپنی تجربہ گاہ میں داخل ہوتا ہے تو اس یقین سے داخل ہوتا ہے کہ قوانینِ فطرت جو کل تھے آج بھی وہی ہوں گے۔ پانی کا جو درجۂ انجماد کل تھا وہی آج ہوگا۔ چنانچہ سائنس دان ماضی کے تجربات کی روشنی میں دریافت شُدہ طبعی قوانین کو اٹل اور حتمی قرار دینے کے بعد آگے ترقی کرتا ہے اور پُرانی بنیادوں کو ترقی دے کر اس پر مزید علم کی دیواریں اُستوار کرتا ہے۔ اسی گذشتہ علم کو صحیح اور مستقل ماننے کے بعد ہی وہ آئندہ کے لیے بھی صحیح پیشین گوئیاں کرتا ہے اور آئندہ کے تجربات کے سہارے آگے بڑھ جاتا ہے۔

یہ سب کیا ہے؟ منطقِ استقرائیہ میں اسے قانونِ یکسانیّت اور قانونِ عمومیّت کہتے ہیں۔ یہی بنیاد ہے تجربہ و مشاہدہ کی۔ سائنس کی ساری عمارت، حتٰی کہ انسان کا سارا مشاہداتی علم اسی پر مبنی ہے۔ یہ یکسانیت و عمومیت کیا ہے؟ یہ نظم و ضبط کی معراج ہے۔ اس قدر باریک نظم و ربط کہ کہیں بھی ایک سیکنڈ کے وقت کی کمی بیشی نہیں ہوتی، ایک اِنچ کے لاکھویں حصّہ کے برابر فرق نہیں پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا سائنسدان اس قانونِ فطرت کی انتہائی صحت سے

فائدہ اُٹھاتے ہوئے آنکھیں بند کر کے چاند پر پہنچ جاتا ہے۔ کائنات کا اس قدر باریک، پیچیدہ اور صحیح انتظام جس میں علّت و معلول کی کڑیاں واضح طور پر نظر آجاتی ہیں۔

ہر عمل کا کوئی نہ کوئی سبب نظر آتا ہے اور ہر سبب کوئی نہ کوئی نتیجہ فراہم کرتا ہے۔

علّت و معلول

ایک تجربہ گاہ میں سائنسی تجربات کے ذریعے یا براہِ راست فطرت کا مشاہدہ کرتے ہوئے، ہم تمام واقعات و حالات کو علّت و معلول کی کڑیوں میں پروتے چلے جاتے ہیں لیکن ایسی منزل بھی ایک آجاتی ہے جہاں ہم "علّت" کی اگلی کڑی نہیں دریافت کر سکتے۔ یہاں پر آکر ہماری دیکھنے کی محدود قوّت جواب دے جاتی ہے۔ سُننے، چکھنے، سُونگھنے اور چھُونے کے حواس بے بسی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ ہم صاف صاف اعتراف کرتے ہیں کہ ابھی راستہ بہت باقی ہے، منزل بہت آگے ہے لیکن ہماری قوت اس قدر محدود ہے کہ ہم مزید آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس منزل پر ہر وہ آنکھ جسے عقلِ سلیم کی رہنمائی حاصل ہوگی فقط یہی بات کہے گی کہ "آگے دھند ہے، راستہ صاف نظر نہیں آتا"۔ لیکن اگر عقلِ سلیم کی توفیق نصیب نہ ہو تو یہی آنکھ ڈھٹائی کے ساتھ یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ "راستہ بس وہیں تک تھا جہاں تک میں دیکھ سکتی تھی، جس جگہ سے میری نظر نے کام کرنا بند کر دیا ہے بس وہیں سے راستہ بھی ختم ہو گیا ہے، اب آگے مزید کوئی راستہ نہیں، کوئی منزل نہیں، علّت و معلول کی وہ کڑیاں جو اب تک انتہائی باریکی اور صحت کے ساتھ ملتی چلی آئی ہیں بس اب ختم ہو گئیں۔ اس مقام سے آگے نہ کسی سبب کا کوئی نتیجہ ہے اور نہ کسی نتیجے کا کوئی سبب۔ بس دھند ہی دھند ہے"۔ بیچاری عقل چیخ چیخ کر یہ سوال کرتی ہے کہ جناب آپ اس مقام تک تو علّت و معلول کا رشتہ انتہائی صحت کے ساتھ اٹل قوانین کی حیثیت میں بیان کرتے چلے آئے ہیں اب ایک معلول ایسا بھی آن پہنچا ہے جس کی علّت آپ کو نظر نہیں آرہی۔ کیا آپ کی گذشتہ ساری تحقیق یہ بات گوارا کرنے کو تیار تھی کہ بغیر علّت کے معلول کا تصوّر بھی کیا جا سکتا ہے؟ اب اس آخری معلول کی علّت کے وجود کا انکار صرف اس لیے کیا جا رہا ہے کہ علّت آپ کو نظر نہیں آرہی۔ کیا ایک واضح اور روشن معلول کی علّت کے وجود کا انکار صرف اس لیے کر دیا جائے کہ وہ آپ کی

نظر میں نہیں آرہا۔ آپ کی نظر میں تو بہت سی باتیں نہیں آتیں، کیا ان سب کے وجود کا انکار کر دیا جائے؟

یہی وہ بنیادی غلطی ہے جس کی وجہ سے بعض لوگ علّت و معلول کا تعلق صرف طبیعی قوانین تک اور طبیعی اور مادی دنیا تک محدود سمجھتے ہیں یعنی جہاں تک انسان کے حواسِ خمسہ کام کر سکیں وہاں تک تو علّت و معلول کا سلسلہ موجود ہے اور جہاں انسان کے حواس دُھندلانے لگیں وہاں سے علّت و معلول کا رشتہ بھی ختم! حیرت کی بات ہے کہ سرحدِ ادراک سے اُس پار تو قوانینِ فطرت بھی اٹل ہیں، قوانینِ یکسانیت و عمومیت بھی برسرِ کار ہیں، رشتۂ علّت و معلول کے بغیر ایک سیکنڈ کے لیے بھی گزارا نہیں اور جُونہی سرحدِ ادراک سے اُس پار جائیے سارے رشتے ناطے ٹوٹ گئے، نہ کوئی قانون باقی رہا، نہ یکسانیت، نہ عمومیت نہ تعلیل۔ وہ آخری معلول جو سرحدِ ادراک سے اس پار ہمیں نظر آیا ہے اور جس کی دوسری ٹانگ سرحدِ ادراک کی دوسری جانب ہے ان نیم حکیم سائنسدانوں کے لیے درخورِ اعتناء نہیں۔ اس آخری معلول کی علّت چونکہ انہیں معلوم نہیں ہو سکتی، اس لیے موجود ہی نہیں۔ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ[1] (القرآن)۔ اگر کسی انسان کی عقل بالکل ماری نہیں گئی تو وہ یہ بات کہنے پر مجبور ہے کہ اس آخری معلول کی علّت اگر حسّی دنیا میں موجود نہیں تو غیر حسّی دنیا میں ضرور موجود ہے۔ اگر سرحدِ ادراک سے اس پار طبیعی دنیا میں اس کی علّت نہیں ہے تو سرحدِ ادراک سے اُس پار مابعد الطبیعی دنیا میں اس کی علّت ضرور موجود ہو گی اور مابعد الطبیعی دنیا میں بھی علّت و معلول کا رشتہ اس طرح سے موجود ہے جس طرح سے طبیعی دنیا میں ہے۔

اس کی تائید ایک اور دلیل سے بھی ہوتی ہے کہ اگر ہم علّت اور معلول کی لمبی زنجیر کو تسلیم کر لیتے ہیں تو یہ بات از خود طے ہو جاتی ہے کہ کوئی معلول از خود اپنی علّت نہیں ہو سکتا۔ ورنہ اتنی لمبی زنجیر کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہر معلول کے اوپر ایک علّت ہے۔ اگر اونچی سطح پر ہم فطرت کو ایک معلول تصوّر کر لیں تو اس کی علّت ہمیں فطرت سے باہر ڈھونڈنی پڑے گی۔ اس علّت کو ہم مافوق الفطرت

---

[1] ترجمہ: "بس صرف اس لیے جھٹلا دیا کہ بات ان کی سمجھ (علم) میں نہیں آئی"

کہنے پر مجبور ہوں گے۔ جس طرح سے ایک معلول اپنی علت خود نہیں ہو سکتا اسی طرح سے یہ کائنات خود اپنی خالق و ناظم نہیں بن سکتی۔ اس کائنات کی منصوبہ بندی اور انتظام کے لیے ایک ایسا منصوبہ ساز درکار ہے جو مافوق الفطرت ہو۔

قانونِ یکسانیت و عمومیت اور علت و معلول کے اس واضح رشتے کے سمجھ میں آجانے کے بعد ایک صحیح ذہن خود بخود اس نتیجہ کی طرف مائل ہوتا ہے:۔

ا۔ اس کائنات کا وجود، اس کی تخلیق، اس کا انتظام اور اس کی ارتقائی منازل محض اتفاقات و حادثات پر مبنی نہیں بلکہ ایک انتہائی جامع اور حکیمانہ منصوبہ کو چلانے کے لیے فطرت کی اندھی بہری قوت کافی نہیں بلکہ اس کے لیے ایک حکیم و قدیر خالق کا وجود ایک مُدبّر و منتظم کارفرما ہستی کا وجود مانے بغیر چارہ نہیں۔

آیئے اس بارے میں ایک مشہور ماہرِ نباتات مسٹر سیسل بائس کے تاثرات دیکھیں۔ وہ اپنے ایک مضمون "پھولوں اور پھلوں کے بارے میں" میں لکھتے ہیں۔

"پانی کے ایک قطرے سے لے کر جو خوردبین سے مشکل ہی سے دیکھا جا سکتا ہے، فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے ان دور دراز ستاروں تک نگاہ دوڑاؤ جو دُوربین کے بغیر نظر نہیں آتے تمہیں ان میں فقید المثال نظم و ضبط نظر آتے گا۔ ان کے وظائف میں اس قدر یکسانیت پائی جاتی ہے کہ ہم اس کی بنیاد پر قوانین مرتّب کر سکتے ہیں، فطرت کے مظاہر میں یکسانیّت اور ہم آہنگی کے یقین ہی نے بے شمار انسانوں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اس یکسانیت کی تحقیق میں عمریں صرف کریں۔ اگر انہیں اس پر اعتماد نہ ہوتا تو وہ عمر ایسی متاعِ عزیز کو اس تحقیق میں گنوانے کے لیے تیار نہ ہوتے۔ اگر اس کائنات کی تہ میں محض اتفاق کارفرما ہوتا تو پھر ہر نئے تجربے سے نت نئے نتائج برآمد ہوتے۔ ان حالات میں کوئی ترقی ممکن نہ ہوتی۔ کائنات کا حُسنِ انتظام اس بات کا شاہد ہے کہ اس کا کوئی ناظم ضرور ہے، کیونکہ ناظم کے بغیر کسی کام میں یکسانیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہر نیا قانون جو دریافت ہوتا ہے، زبانِ حال سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ میرا واضع

خدا ہے۔ اس نے مجھے ضرور وضع کیا ہے۔

سائنس خدا کے وجود پر گواہ ہے۔ ایسا خدا جو روز مرّہ زندگی میں بھی موجود ہے۔ پھر ستاروں کی تصویریں لے سکتے ہیں اور آسمانوں پر ان کے راستے متعین کر سکتے ہیں، مگر خدائے واحد کے وجود کی ایسی کوئی مادّی شہادت فراہم نہیں کی جاسکتی۔ خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لیے اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ضروری ہے۔ اگر ایک شخص ستاروں کا مشاہدہ نہیں کرتا تو وہ ہٹ دھرمی سے کہہ سکتا ہے کہ ستارا ایسی کوئی چیز کائنات میں نہیں۔ لیکن کیا اس کا یہ کہنا درست ہے؟ یہی حال خالقِ کائنات کا ہے، جب تک ہم اس کی طرف متوجّہ نہ ہوں، اُس کی تخلیق پر غور نہ کریں اُس وقت تک وہ ہمارے ذہن میں نہیں آتا اور ہم ضدّی بچوں کی طرح ایک بدیہی حقیقت کو جھٹلانے کا ارتکاب کرتے ہیں، لیکن اگر ہم ایک مرتبہ بھی اُس کے نور کی پرچھائیں دیکھ لیں تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت ہمیں اس کی تکذیب کے لیے تیار نہیں کر سکتی۔ اس عمل کا ایک داخلی تجربہ ہونا چاہیے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اگر ہم خود اس کی ذات پر غور و فکر نہ کریں تو محض دلائل کے زور سے اسے دل و دماغ میں کس طرح اُتارا جاسکتا ہے۔ وہ اُنھی کو دکھائی دے گا جو اسے ڈھونڈھ رہے ہیں۔“

(۳ : ص ۲۹۶)

انسان کے تخلیقی مراحل، اس کی رُبوبیّت کے لیے طویل و عریض خوانِ نعمت اور پھر آخر کار اس کی جولانئ طبع کے لیے کائنات کے اس قدر واضح طور پر تدبیر کردہ نظام کو دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص اس حکیم و مدبّر ہستئ باری تعالیٰ کے وجود کا منکر ہوتا ہے تو اس کی مثال اُس ڈھیٹ چور کی سی ہے جو کسی باغ سے پھل چُرا کر لے جا رہا تھا مگر عین موقع پر باغ کا مالک پہنچ گیا۔ باغ کے مالک نے چور سے پوچھا کہ یہاں کیوں آئے؟ چور نے جواب دیا کہ اتفاق ہے کہ آگیا، آنے کا ارادہ تو نہ تھا، غالباً راستہ بھول گیا۔ مالک نے پوچھا یہ پھل کیوں توڑے؟ چور نے جواب دیا: انہیں کسی نے نہیں توڑا، یہ خود ہی ٹوٹ کر گر گئے، غالباً تیز ہوا آئی ہوگی۔ باغ کے مالک نے مزید پوچھا کہ اچھا پھر یہ

خدا ہے۔ اس نے مجھے ضرور وضع کیا ہے۔

سائنس خدا کے وجود پر گواہ ہے۔ ایسا خدا جو روزمرّہ زندگی میں بھی موجود ہے۔ ہم ستاروں کی تصویریں لے سکتے ہیں اور آسمانوں پر ان کے راستے متعین کر سکتے ہیں، مگر خدائے واحد کے وجود کی ایسی کوئی مادّی شہادت فراہم نہیں کی جا سکتی۔ خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لیے اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ضروری ہے۔ اگر ایک شخص ستاروں کا مشاہدہ نہیں کرتا تو وہ ہٹ دھرمی سے کہہ سکتا ہے کہ ستارا ایسی کوئی چیز کائنات میں نہیں۔ لیکن کیا اس کا یہ کہنا درست ہے؟ یہی حال خالقِ کائنات کا ہے، جب تک ہم اس کی طرف متوجّہ نہ ہوں، اُس کی تخلیق پر غور نہ کریں اُس وقت تک وہ ہمارے ذہن میں نہیں آتا اور ہم ضدّی بچوں کی طرح ایک بدیہی حقیقت کو جھٹلانے کا ارتکاب کرتے ہیں، لیکن اگر ہم ایک مرتبہ بھی اُس کے نور کی پرچھائیں دیکھ لیں تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت ہمیں اس کی تکذیب کے لیے تیار نہیں کر سکتی۔ اس عمل کا ایک داخلی تجربہ ہونا چاہیے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اگر ہم خود اس کی ذات پر غور و فکر نہ کریں تو محض دلائل کے زور سے اسے دل و دماغ میں کس طرح اُتارا جا سکتا ہے۔ وہ اُنہی کو دکھائی دے گا جو اسے ڈھونڈھ رہے ہیں۔"

(۳: ص ۲۹۶)

انسان کے تخلیقی مراحل، اس کی رُبوبیّت کے لیے طویل و عریض خوانِ نعمت اور پھر آخر کار اس کی جولانیٔ طبع کے لیے کائنات کے اس قدر واضح طور پر تدبیر کردہ نظام کو دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص اس حکیم و مدبّر ہستیٔ باری تعالیٰ کے وجود کا منکر ہوتا ہے تو اس کی مثال اُس ڈھیٹ چور کی سی ہے جو کسی باغ سے پھل چُرا کر لے جا رہا تھا مگر عین موقع پر باغ کا مالک پہنچ گیا۔ باغ کے مالک نے چور سے پوچھا کہ یہاں کیوں آئے؟ چور نے جواب دیا کہ اتفاق ہے کہ آ گیا، آنے کا ارادہ تو نہ تھا، غالباً راستہ بھول گیا۔ مالک نے پُوچھا یہ پھل کیوں توڑے؟ چور نے جواب دیا: انہیں کسی نے نہیں توڑا، یہ خود ہی ٹُوٹ کر گر گئے، غالباً تیز ہوا آئی ہوگی۔ باغ کے مالک نے مزید پوچھا کہ اچھا پھر یہ

باب ۹

مسئلے کا واحد حل

ایک اہم اقتباس

کسی دعوے کی صحت کو پرکھنے کا صحیح طریقہ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ پہلے اس دعوے کو درست فرض کر لیا جائے اور دیکھا جائے کہ دعویٰ درست ماننے کے بعد کیا کیا نتائج سامنے آتے ہیں۔ اگر یہ نتائج واقعاتی دنیا میں سو فیصد صحیح ثابت ہوں تو اس دعویٰ کو صحیح ماننا پڑے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اس دعویٰ کے علاوہ اور بھی متبادل دعوے ہیں یا نہیں۔ ان کے نتائج کیسے ہیں، اور یہ نتائج اس کائنات میں حقائق و واقعات کے مطابق ہیں یا نہیں؟

علمی و سائنسی تحقیق کی دُنیا میں آپ دیکھیں گے کہ ہر مسئلے کا حل ڈھونڈنے کے لیے بے شمار دعوے سامنے آتے ہیں اور بالآخر ایک دعویٰ ایسا باقی رہ جاتا ہے جو مندرجہ بالا معیار پر پُورا اترتا ہے اور وہی مسئلہ کا اصل حل قرار پاتا ہے۔

وجود باری تعالیٰ کے بارے میں سوچنے کا صحیح اور فطری انداز کیا ہے؛ اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ غبارِ خاطر میں لکھتے ہیں:

"بارہا مجھے خیال ہُوا، کہ ہم خدا کی ہستی کا اقرار کرنے پر اس لیے بھی مجبور ہیں کہ اگر نہ کریں، تو کارخانۂ ہستی کے معمّے کا کوئی حل باقی نہیں رہتا، اور ہمارے اندر ایک حل کی طلب ہے جو ہمیں مضطرب رکھتی ہے ؎

آں کہ ایں نامہ سربستہ نوشتہ است نخُست
گرہے سخت بر سر رشتہ مضمون زدہ است

اگر ایک اُلجھا ہُوا معاملہ ہمارے سامنے آتا ہے اور ہمیں اس کے حل کی جستجو ہے تو ہم کیا

نظر میں نہیں آرہا۔ آپ کی نظر میں تو بہت سی باتیں نہیں آتیں، کیا ان سب کے وجود کا انکار کر دیا جائے؟

یہی وہ بنیادی غلطی ہے جس کی وجہ سے بعض لوگ علّت و معلول کا تعلق صرف طبیعی قوانین تک اور طبیعی اور مادی دنیا تک محدود سمجھتے ہیں یعنی جہاں تک انسان کے حواسِ خمسہ کام کر سکیں وہاں تک تو علّت و معلول کا سلسلہ موجود ہے اور جہاں انسان کے حواس دھندلانے لگیں وہاں سے علّت و معلول کا رشتہ بھی ختم! حیرت کی بات ہے کہ سرحدِ ادراک سے اُس پار تو قوانینِ فطرت بھی اٹل ہیں، قوانینِ یکسانیت و عمومیت بھی برسرِ کار ہیں، رشتۂ علّت و معلول کے بغیر ایک سیکنڈ کے لیے بھی گزارا نہیں اور جونہی سرحدِ ادراک سے اُس پار جاتیے سارے رشتے ناطے ٹوٹ گئے، نہ کوئی قانون باقی رہا، نہ یکسانیت، نہ عمومیت نہ تعلیل۔ وہ آخری معلول جو سرحدِ ادراک سے اس پار ہمیں نظر آیا ہے اور جس کی دوسری ٹانگ سرحدِ ادراک کی دوسری جانب ہے ان نیم حکیم سائنسدانوں کے لیے درخورِ اعتنا نہیں۔ اس آخری معلول کی علّت چونکہ انہیں معلوم نہیں ہو سکتی، اس لیے موجود ہی نہیں۔ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ[1] (القرآن)۔ اگر کسی انسان کی عقل بالکل ماری نہیں گئی تو وہ یہ بات کہنے پر مجبور ہے کہ اس آخری معلول کی علّت اگر حسّی دنیا میں موجود نہیں تو غیر حسّی دنیا میں ضرور موجود ہے۔ اگر سرحدِ ادراک سے اس پار طبیعی دنیا میں اس کی علّت نہیں ہے تو سرحدِ ادراک سے اُس پار مابعد الطبیعی دنیا میں اس کی علّت ضرور موجود ہوگی اور مابعد الطبیعی دنیا میں بھی علّت و معلول کا رشتہ اس طرح سے موجود ہے جس طرح سے طبیعی دنیا میں ہے۔

اس کی تائید ایک اور دلیل سے بھی ہوتی ہے کہ اگر ہم علّت اور معلول کی لمبی زنجیر کو تسلیم کر لیتے ہیں تو یہ بات از خود طے ہو جاتی ہے کہ کوئی معلول از خود اپنی علّت نہیں ہو سکتا۔ ورنہ اتنی لمبی زنجیر کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہر معلول کے اوپر ایک علّت ہے۔ اگر اونچی سطح پر ہم فطرت کو ایک معلول تصوّر کریں تو اس کی علّت ہمیں فطرت سے باہر ڈھونڈنی پڑے گی۔ اس علّت کو ہم مافوق الفطرت

---

[1] ترجمہ: "بس صرف اس لیے جھٹلا دیا کہ بات ان کی سمجھ (علم) میں نہیں آئی"۔

باقی نہیں رہے گی۔ الجھاؤ کا دُور ہو جانا اور ایک نقش کا نقش بن جانا بجائے خود ہزاروں دلیلوں کی ایک دلیل ہے۔

اب علم و تیقّن کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھائیے اور ایک تیسری مثال سامنے لائیے، آپ نے حرفوں کی ترتیب سے کھلنے والے قُفل دیکھے ہوں گے، اُنہیں اپنے قفل ابجد کے نام سے پکارتے تھے۔ ایک خاص لفظ کے بننے سے وہ کھُلتا ہے اور وہ ہمیں معلوم نہیں، اب ہم طرح طرح کے الفاظ بناتے جائیں گے اور دیکھیں گے کہ کھلتا ہے یا نہیں؟ فرض کیجیے ایک خاص نقطے کے بنتے ہی کھُل گیا، اب کیا ہمیں اِس بات کا یقین نہیں ہو جائے گا کہ اسی لفظ میں قفل کی کُنجی پوشیدہ تھی، جستجو جس حل کی تھی وہ قفل کا کھُلنا تھا، جب ایک لفظ نے قفل کھولا یا تو پھر اس کے بعد باقی کیا رہا جس کی مزید جستجو ہو۔

اِن مثالوں کو سامنے رکھ کر اس طلسم ہستی کے معمّے پر غور کیجیے، جو ہمارے اندر اور ہمارے چاروں طرف پھیلا ہُوا ہے، انسان نے جب سے ہوش و آگہی کی آنکھیں کھولی ہیں، اس معمّا کا حل ڈھونڈ رہا ہے لیکن اس پُرانی کتاب کا پہلا اور آخری ورق کچھ اس طرح کھو یا گیا ہے، کہ نہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شروع کیسے ہوتی تھی، نہ اسی کا کچھ سُراغ ملتا ہے کہ ختم کہاں جا کر ہوتی اور کیونکر ہوگی:

اوّل و آخرِ این کہنہ کتاب افتادست!

زندگی اور حرکت کا یہ کارخانہ کیا ہے اور کیوں ہے؟ اس کی کوئی ابتدا بھی ہے یا نہیں؟ یہ کہیں جا کر ختم ہوگا یا نہیں؟ خود انسان کیا ہے؟ جو ہم سوچ رہے ہیں کہ "انسان کیا ہے؟" تو خود یہ سوچ اور سمجھ کیا چیز ہے؟ اور پھر حیرت و درماندگی کے ان تمام پردوں کے پیچھے کچھ ہے بھی یا نہیں؟ ہم اس اُلجھاؤ کو نئے نئے حل نکال کر سُلجھانے کی جتنی کوشش کرتے ہیں، اور زیادہ اُلجھتا جاتا ہے، ایک پردہ سامنے دکھائی دیتا ہے اُسے ہٹانے میں نسلوں کی نسلیں گزار دیتے ہیں، لیکن جب وہ ہٹتا ہے تو معلوم ہوتا ہے سو پردے اس کے پیچھے پڑے تھے اور جو پردہ ہٹا تھا، وہ فی الحقیقت پردے کا ہٹنا نہ تھا، بلکہ نئے نئے پردوں کا نکل آنا تھا، ایک سوال کا جواب ابھی حل نہیں ہو سکتا کہ دس نئے سوال سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں، ایک راز ابھی حل نہیں ہو سکتا کہ سو نئے راز چشمک

کرنے لگتے ہیں۔

اچھا اب غور کیجیے، اس معمّا کے حل کی کاوش بالآخر ہمیں کہاں لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے؟ یہ پورا کارخانہ ہستی اپنے ہر گوشہ اور اپنی ہر نمود میں سر تا سر ایک سوال ہے۔ سورج سے لے کر روشنی کے ذرّوں تک کوئی نہیں جو یک قلم پرسش و تقاضا نہ ہو، "یہ سب کچھ کیا ہے؟" "یہ سب کچھ کیوں ہے؟" "یہ سب کچھ کس لیے ہے؟" ہم عقل کا سہارا لیتے ہیں اور اس روشنی میں جسے ہم نے علم کے نام سے پکارا ہے، جہاں تک راہ ملتی ہے چلتے چلے جاتے ہیں لیکن ہمیں کوئی حل ملتا نہیں، جو اس اُلجھاؤ کے تقاضوں کی پیاس بجھا سکے، روشنی گُل ہو جاتی ہے، آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور عقل و ادراک کے سارے سہارے جواب دیتے ہیں، لیکن پھر جونہی ہم پرانے حل کی طرف لوٹتے ہیں اور اپنی معلومات میں صرف اتنی بات بڑھا دیتے ہیں کہ "ایک صاحبِ ادراک و ارادہ قوّت پسِ پردہ موجود ہے" تو اچانک صورتِ حال یک قلم منقلب ہو جاتی ہے اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے اندھیرے سے نکل کر یکایک اُجالے میں جا کھڑے ہوئے۔ اب جس طرف بھی دیکھتے ہیں روشنی ہی روشنی ہے، ہر سوال نے اپنا جواب پا لیا، ہر تقاضے کی طلب پوری ہو گئی، ہر پیاس کو سیرابی مل گئی، گویا یہ سارا اُلجھاؤ ایک قفل تھا، جو اس کنجی کے چھوتے ہی کھل گیا۔

چنداں کہ دست و پا زدم، آشفتہ تر شدم
ساکن شدم میانۂ دریا کنار شد

اگر ایک ذی عقل و ذی ارادہ پسِ پردہ موجود ہے، تو یہاں جو کچھ ہے کسی ارادہ کا نتیجہ ہے اور کسی معیّن اور طے شدہ مقصد کے لیے ہے، جونہی یہ حل سامنے رکھ کر ہم اس گورکھ دھندے کو ترتیب دیتے ہیں، معاً اس کی ساری پیچیدگیاں دُور ہو جاتی ہیں اور ساری چولیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک آ کر بیٹھ جاتی ہیں کیونکہ "یہ کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟" کو ایک معنی خیز جواب مل جاتا ہے۔ گویا اس معمّا کے حل کی ساری رُوح ان چند لفظوں کے اندر سمٹی ہوئی تھی، جونہی یہ سامنے آئے معمّا معمّا نہ رہا، ایک معنی خیز داستان بن گیا، پھر جونہی یہ الفاظ سامنے سے ہٹنے لگے ہیں تمام معانی و اشارات غائب

ہو جاتے ہیں اور ایک خشک اور بے جان چیستان باقی رہ جاتی ہے۔

اگر جسم میں رُوح بولتی ہے اور لفظ میں معنیٰ اُبھرتا ہے تو حقائقِ ہستی کے اجسام بھی اپنے اندر کوئی روحِ معنی رکھتے ہیں، یہ حقیقت کہ معمائے ہستی کے بے جان اور بے معنی جسم میں صرف اسی ایک حل سے روحِ معنی پیدا ہو سکتی ہے، ہمیں مجبور کر دیتی ہے کہ اس حل کو حل تسلیم کر لیں،

اگر کوئی ارادہ اور مقصد پردے کے پیچھے نہیں ہے تو یہاں تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن اگر ایک ارادہ اور مقصد کام کر رہا ہے تو پھر جو کچھ بھی ہے روشنی ہی روشنی ہے۔ ہماری فطرت میں روشنی کی طلب ہے، ہم اندھیرے میں کھوتے جانے کی جگہ روشنی میں چلنے کی طلب رکھتے ہیں اور ہمیں یہاں روشنی کی راہ صرف اسی ایک حل سے مل سکتی ہے۔

فطرت کائنات میں ایک مثال (Pattern) کی نموداری ہے ایسی مثال جو عظیم بھی ہے اور جمالیاتی (Aesthetic) بھی۔ اس کی عظمت ہمیں مرعوب کرتی ہے اس کا جمال ہم میں محویت پیدا کرتا ہے، پھر کیا ہم فرض کر لیں کہ فطرت کی یہ نمود بغیر کسی مدرک (Intelligent) قوت کے کام کر رہی ہے؟ ہم چاہتے ہیں کہ فرض کر لیں، مگر نہیں کر سکتے، ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایسا فرض کر لینا ہماری دماغی خودکشی ہوگی۔

اگر غور کیجیے، تو اس حل پر یقین کرتے ہُوئے ہم اُس طریقِ نظر سے کام لینا چاہتے ہیں جو ریاضیات کے اعدادی اور پیمائشی حقائق سے ہمارے دماغوں میں کام کرتا رہتا ہے۔ ہم کسی عددی اور پیمائشی اُلجھاؤ کا حل صرف اُسی حل کو تسلیم کریں گے جس کے ملتے ہی اُلجھاؤ دُور ہو جائے۔ اُلجھاؤ کا دُور ہو جانا ہی صحت کی اٹل دلیل ہوتی ہے۔ بلاشبہ دونوں صورتوں میں اُلجھاؤ اور حل کی نوعیت ایک طرح کی نہیں ہوتی، اعدادی مسائل میں اُلجھاؤ عددی ہوتا ہے، یہاں عقلی ہے، وہاں عددی حل عددی حقائق کا یقین پیدا کرتا ہے یہاں عقلی حل عقلی اذعان کی طرف رہنمائی کرتا ہے، تاہم طریقِ نظر کا سانچہ دونوں جگہ ایک ہی طرح کا ہُوا۔ دونوں راہیں ایک ہی طرح کھُلتی اور ایک ہی طرح بند ہوتی ہیں۔"

(۲: ۱۳۰ تا ۱۳۶)

اب ا

انسانی فطرت کے تقاضے

انسانی فطرت اس زندگی میں بہت سے فطری مطالبات رکھتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنی فطرت کا گلا دباتے رکھیں اور اس کی آواز اپنی پریشانی فکری کے نقار خانے میں بلند نہ ہونے دیں۔ لیکن یہ مطالبات برحق ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:-

۱۔ انسان فنا سے نفرت کرتا ہے حتیٰ کہ فنائے عارضی یعنی موت سے بھی گھبراتا ہے۔ اس کی فطرت کا تقاضائے برحق ہے کہ اسے ہمیشگی اور خلود حاصل ہو، اسے ایسی زندگی نصیب ہو جس کا خاتمہ نہ ہو۔ مگر یہ بات اسے اس دنیا میں نہیں مل سکتی، اس کا ملنا محال ہے، موت یقینی ہے۔

۲۔ انسانی فطرت کا تقاضائے سلیم ہے کہ مکمل انصاف قائم ہو۔ اسے بھی اور ہر شخص کو اعما
کی ٹھیک ٹھیک اور مکمل جزا ملے۔ مجرموں کو مکمل سزا اور محسنوں کو مکمل جزا۔
مگر یہ بھی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ اس دُنیا کی بساط اس قدر تنگ ہے کہ نہ مکمل جزا دی
ہے اور نہ مکمل سزا۔ فرض کیجیے ایک شخص نے سو آدمیوں کو قتل کر دیا، اسے زیادہ سے زیادہ سز
یہی دی جا سکتی ہے کہ اُسے ایک مرتبہ قتل کر دیا جائے۔ یہ تو سزا کا محض سوواں حصّہ ہے۔ ان
کا اصل تقاضا یہ ہے کہ اُسے سو مرتبہ زندہ کیا جائے اور سو مرتبہ قتل کیا جائے، مگر اس دُنیا
محال ہے۔

۳۔ انسان حُسن پرست واقع ہوا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے ارد گرد حسینوں
ہوں مگر یہ بھی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ ہوتا یہی ہے کہ ؎

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار

۴۔ انسان خواہش پرست بھی ہے۔ اس کی بے حد تمنائیں ہیں جن کی وہ تکمیل چاہتا ہے۔ مگر اس دنیا میں پوری نہیں ہو پاتیں اور نہ ہی ممکن ہے کہ پوری ہو پائیں۔

غرض یہ کہ یہ دنیا اور پھر زندگی کی یہ مختصر سی مہلت اس کے حوصلوں کی تکمیل کے لیے کافی نہیں۔ اس کی فطرت یہ تقاضا کرتی ہے کہ ایک اور دنیا ہو اور ابدی دنیا ہو جس میں اس کی یہ ساری فطری آرزوئیں اور یہ سب جائز فطری تقاضے پورے ہوں۔ یہ سب کچھ آخرت کے تصوّر کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ آخرت جس کا تصوّر وجودِ باری تعالیٰ کا رہینِ منت ہے، وہ آخرت جس میں انسان کو ابدی زندگی میسّر ہو، مکمل انصاف میسّر ہو، اس کی جمالی حس اور حُسن پرستی کے جائز تقاضے پورے ہوں، اس کی خواہشات کی تکمیل ہو۔ جونہی وہ کسی بات کی خواہش کرے، اسی لمحہ وہ خواہش پوری ہو جائے۔

یہ سب کچھ تصوّرِ آخرت کے بغیر ممکن نہیں۔ اور تصوّرِ آخرت وجودِ باری تعالیٰ پر ایمان کی دوسری منزل ہے۔

غور کریں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ آخرت کے بغیر زندگی کا تصوّر لغو ہے۔ اگر زندگی محض یہی کچھ ہے جو اس دُنیا میں نظر آتی ہے تو بلاشُبہ وہ بے معنی اور بے مقصد ہے۔

اس کائنات میں انسانی زندگی کے لیے انتظامات تو اربوں کھربوں سالوں سے ہو رہے ہیں لیکن انسان کی کُل زندگی صرف سو برس ہو؟ کیا یہ انہونی بات نہیں؟ حق بات یہ ہے کہ آخرت کے بغیر یہ جہان مکمل نہیں۔

اس مختصر سی زندگی میں ہماری تمام اُمنگوں کی تکمیل نہیں ہو پاتی ــــ خلود ــــ موت سے گریز ــــ غیر متناہی خوشی ــــ ہر تکلیف و دکھ درد سے مکمّل اور دائمی عافیت ــــ حوصلوں کی تکمیل کا آخری حد تک موقع ملنا ــــ یہ سب کچھ یہاں ممکن نہیں۔ اقبالؒ نے خوب کہا:

؎ کیا عشق ایک زندگیٔ مُستعار کا کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا

؎ کہ پہلے مجھ کو زندگیٔ جاوداں عطا پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بیقرار کا

انسان اپنی ساری تمناؤں کو عملی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے، مگر اس محدود و مختصر دنیا

ہیں ایسا نہیں کر سکتا، کائنات اس کے لیے ناساز گار معلوم ہوتی ہے، وہ ہر قدم بعد انسان کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ مایوسی و ناکامی کے علاوہ اسے کچھ نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مفکروں نے دُنیا کو دُکھوں کا گھر قرار دیا ہے۔

کیا ہماری تمام خواہشیں، جذبات، خیالات اور ہماری فطرت کے زوردار تقاضے سب غیر حقیقی ہیں؟ وہ تمام فطری تقاضے، وہ تمام احساسات جن کو لے کر انسانی نسل پچھلے ہزاروں سالوں سے پیدا ہو رہی ہے اور جن کو اپنے سینے میں لیے ہوئے دفن ہو جاتی ہے کہ وہ انہیں حاصل نہ کر سکی، کیا ان احساسات کی کوئی منزل نہیں؟

ساری کائنات میں انسان ایک ایسا وجود ہے جو کل (Tomorrow) کا تصوّر رکھتا ہے انسان کل چاہتا ہے مگر اس کو صرف آج دیا گیا ہے اور وہ بھی ناساز گار!

غور کیجیے کہ ہماری فطرت اور عقلِ سلیم ہماری کس طرف رہنمائی کر رہی ہے۔ اس کا کیا تقاضا ہے؟ کیا اس کا تقاضا یہی ہے کہ آخرت نہ ہو، اس کا کوئی خواہش فطری پوری نہ ہو۔ نہ خلود، نہ ابدیت، نہ انصاف، نہ دیگر آرزوؤں کی تکمیل؟

کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس اپنی فطرت کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا تقاضا اس قدر بھونڈا، ظالمانہ اور غیر حقیقت پسندانہ ہو سکتا ہے۔

انسانی فطرت واضح طور پر یہ تقاضا کرتی ہے کہ اسے ابدی زندگی، انصاف، حسن جمال اور دیگر آرزوؤں کی تکمیل کا صحیح سامان ہو اور یہ سب کچھ اُخروی زندگی کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ سب کچھ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ایک خدا ہو جو انسان کو ابدی زندگی اور تمام خواہشات کی تکمیل کا موقع آخرت کی صورت میں عطا فرماتے۔ پس ثابت ہُوا کہ وجودِ باری تعالیٰ انسانی فطرت کا انتہائی زوردار تقاضا ہے۔ اس کے بغیر کسی انسانی مسئلہ کی گرہ کشائی نہیں ہوتی۔

یہی وجہ ہے کہ جب انسان پر آفت آتی ہے تو وہ اپنی مصنوعیت سے باہر آتا ہے، اس کا بناوٹی پن ختم ہو جاتا ہے اور اس کی فطرتِ سلیم کی صحیح آواز باہر آنے لگتی ہے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ

کو ہی مدد کے لیے پکارتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوا إِلَيْهِ مِن قَبْلُ۔ (الزُّمر: ۸)

"انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اُسے پکارتا ہے۔ پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نواز دیتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے پکار رہا تھا۔"

وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا۔ (بنی اسرائیل: ۶۷)

"جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اُس ایک کے سوا جن کو تم پکارتے ہو، سب گم ہو جاتے ہیں۔ مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اس سے مُنہ موڑ جاتے ہو۔ انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے۔"

مشہور واقعہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد ابوجہل کا بیٹا عکرمہؓ مکہ سے فرار ہو گیا۔ کشتی میں بیٹھا تو طوفان نے آگھیرا۔ اچانک خدائے واحد کو یاد کرنے لگا۔ اس وقت توحید وجود باری تعالیٰ اور توحید کا صحیح ادراک ہوا۔ آخرکار ایمان لے آیا۔

اس سلسلہ میں انتہائی دلچسپ واقعہ روسی زعیم سٹالن سے متعلق ہے جس کا ذکر مسٹر چرچل نے دوسری جنگِ عظیم کے حالات سے متعلق اپنی کتاب کی چوتھی جلد میں صفحہ نمبر ۴۳۳ میں لکھا ہے:

۱۹۴۲ء کے انتہائی نازک حالات میں جب رُوس حیات و موت کی کشمکش سے گزر رہا تھا اور ہٹلر سارے یورپ کے لیے خطرہ بنا ہوا تھا، چرچل نے ماسکو کا سفر کیا تھا۔ اس موقع پر چرچل نے سٹالن کو اتحادی فوجی کارروائی کے متعلق اپنی اسکیم کی تفصیلات بتائیں۔ اسکیم کی تشریح کے ایک خاص مرحلہ پر جب کہ سٹالن کی دلچسپیاں اس سے بہت بڑھ چکی تھیں، اس کی زبان سے نکلا:۔

"خدا اس اسکیم کو کامیاب کرے"

(بحوالہ ڈاکٹر سیّد عبداللطیف: دی مائنڈ القرآن بلڈز، صفحہ ۹۴)

باب ۱۱

حُسن و جمال

اگر دیکھنے والی آنکھ ہو تو کائنات کی ہر ہر چیز میں حُسن و جمال نظر آتا ہے۔ سبزہ، دریا، پہاڑ، وادیاں، بادل، برکھا، سُورج، چاند، تارے تو بے جان چیزیں ہیں مگر ان کا حُسن آپے سے باہر کر دیتا ہے جانداروں کا حُسن اور سب سے بڑھکر انسان کی صورت، حُسنِ عظیم کا شاہکار ہے۔

دھنک، شفق، مہتاب، گھٹائیں، بجلی، تارے، نغمے، پھُول
اس کے دامن میں کیا کچھ ہے، ہاتھ میں دامن آئے تو

کائنات بے حد حسین ہے اور ہم جب بھی حسن کا کوئی تخلیقی فن پارہ دیکھتے ہیں تو سب سے پہلے اس فن کار کو داد تحسین دیتے ہیں۔ اس لیے کہ

ع ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو ——— اقبال

یُوں معلوم ہوتا ہے کہ پُوری کائنات اپنے حُسن و رعنائی سمیت اپنے اصلی فن کار کی ایک نامکمل سی جھلک ہے، ایک نامکمل عکس! نہ جانے خود فن کار کس قدر حسین ہوگا۔ اگر اس کے فن بلکہ اس کے نامکمل عکس پر نظر ڈالتے ہی ایک عالم وجد کناں ہے تو وہ خود کیا نہ ہوگا؟

اک عکسِ ناتمام پہ عالم کو وجد ہے
کیا پُوچھنا ہے آپ کے حُسن و جمال کا

مگر اہم بات یہ ہے کہ حُسن و رعنائی حادثہ یا اتفاق کے طور پر ظہور میں نہیں آتی کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مختلف رنگ گر کر صفحاتِ قرطاس پر بکھر جاتے ہیں مگر ایسا کبھی نہیں ہُوا کہ گر کر وہ "مونالیزا" کی تصویر بن گئے ہوں۔ حُسن و جمال کی شان میں سب سے بڑی گستاخی اور اس بارے میں سب سے بڑی

بد ذوقی یہی ہے کہ اسے محض اتفاق یا حادثہ کا کرشمہ قرار دے دیا جائے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک آل پاکستان انٹر کالجیٹ مباحثہ میں اوّل انعام حاصل کرنے پر ایک صاحب نے مجھ سے یہ جملہ کہا: "بھئی عجیب اتفاق ہے کہ تم نے اس قدر خوبصورت تقریر کر ڈالی"۔ مجھے یاد ہے کہ اس کے لفظ "اتفاق" کے استعمال کرنے پر مجھے بہت رنج ہُوا۔ اس کوڑھ مغز شخص نے میری کئی روز کی محنت اور ایک اچھے بھلے تخلیقی فن پارے کو محض "اتفاق" قرار دے دیا۔

نظم، ترتیب اور اس سے بڑھ کر حُسن، جمال اور رعنائی بغیر خالق کے تصوّر میں نہیں آسکتی اور یہ وجودِ باری تعالیٰ کا ایک اُبھرا ہُوا ثبوت ہے جس کا انکار ایک بد ذوق اور چشمِ بصیرت سے محروم انسان ہی کر سکتا ہے۔

اب دیکھیے کہ وہ احسن الخالقین اس کائنات کے بارے میں خود کیا کہتا ہے:۔

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ۔ (السجدہ: ۷)
"وہ جس نے جو چیز پیدا کی، خوب صورت پیدا کی"

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ۔ (النمل۔ ۸۸)
"اللہ تعالیٰ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو انتہائی کمال سے پیدا کیا"

وَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ۔ (الحجر: ۱۹)
"ہم نے اس میں ہر چیز مناسب و موزوں اُگائی"

وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ (الملک۔ ۵)
"ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے زینت بخشی"

رابسن کہتا ہے: "اے آسمانو! مجھ کو خبر دو! اے دریاؤ! مجھ کو بتاؤ! اے زمین! مجھ کو جواب دے! اے بے شمار ستارو! تم بولو کون سا ہاتھ ہے جس نے تم کو اُفق میں تھام رکھا ہے، اور اے شبِ چہاردہ! کس نے تیری تاریکی کو خوبصورت بنا دیا ہے، تو کس قدر پُرشکوہ اور تو کتنی عظیم ہے!

تو خود بتا رہی ہے کہ تیرا کوئی صانع ہے جس نے تجھ کو بغیر کسی زحمت کے بنایا ہے۔ اس نے تیری چھت کو قبّہ ہائے نور سے مُرصّع کیا ہے جس طرح کہ اس نے زمین پر خاک کا فرش بچھایا ہے اور گرد کو اُبھارا ہے، او مُژدہ رسانِ سحر! او نیّرِ شنگرف اور ہمیشہ روشنی دینے والا ستارہ! او آفتاب درخشاں! سچ بتا تو کس کی طاعت کے لیے محیط کے پردہ سے باہر آتا ہے اور نہایت فیاضی کے ساتھ اپنی روشن شعاعیں عالم پر ڈالتا ہے۔

اَے پُر رُعب سمندر! اے وہ کہ غضبناک ہو کر زمین کو نگل جانا چاہتے ہو کس نے تجھ کو محبوس کر رکھا ہے جس طرح شیر پنجرے میں قید کر دیا جاتا ہے تو اس قید خانہ سے نکل جانے کی کوشش کرتا ہے۔ تیری موجوں کا زور ایک حدِّ معیّن سے آگے ہرگز نہیں بڑھ سکتا۔"

نیوٹن کہتا ہے "کائنات کے اجزا میں باوجود ہزاروں انقلاباتِ زمانہ کے جو ترتیب اور تناسب ہے وہ ممکن نہیں کہ خود کسی ایک ذات میں پایا جاسکے، سوائے اس ذات کے جو سب سے اوّل ہے اور صاحبِ علم ہے اور صاحبِ اختیار ہے۔"

باب ۱۲

نظم و ترتیب

آئیے اب اس کائنات کا کچھ تفصیل سے مطالعہ کریں۔ اس کے نظم و ربط، ترتیب، توازن، صحتِ انتظام اور ہم آہنگی میں ہمیں خدا کا ہاتھ صاف صاف نظر آنے لگے گا۔ منطق کی باریکیوں میں اُلجھے بغیر، کائنات کی سیر کرتے ہوئے ہم بار بار اپنے دل و دماغ سے پوچھیں گے کہ آیا وہ خدا کے وجود کی طرف مائل ہوتے ہیں یا خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں؟

کُرۂ ارضی

سب سے پہلے سائنس کی جدید ترین معلومات کی روشنی میں کُرۂ ارضی کی ماہیت پر غور کریں اور دیکھیں کہ اگر یہ زمین ایک خاص نظم کی بجائے محض اتفاقات کی لہروں کے رحم و کرم پر ہوتی تو اس کے نتائج کیا ہوتے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اگر زمین کا حجم موجودہ حجم کی بجائے کم و بیش ہوتا تو اس میں زندگی محال ہوتی۔ اگر اس کا قطر موجودہ قطر کی نسبت $\frac{1}{4}$ ہوتا تو اس کی کششِ ثقل موجودہ کششِ ثقل کا $\frac{1}{4}$ رہ جاتی۔ اس میں ہوا اور پانی کا وجود ممکن نہ رہتا۔ اس میں اگر درجۂ حرارت بڑھتا تو انتہائی حد تک گر جاتا۔ اس کے برعکس اگر کرۂ ارضی کا قطر اصل کی نسبت دوگنا ہوتا تو اس کی کششِ ثقل دوگنی ہو جاتی۔ ہوا کے غلاف کا حجم خطرناک حد تک گھٹ جاتا اور اس کے دباؤ میں فی مربع انچ ۱۵ تا ۳۰ پونڈ کا اضافہ ہو جاتا اور زندگی کا وجود ممکن نہ ہوتا۔

سورج کے گرد زمین کی گردش کی رفتار انتہائی درجہ مستقل ہے۔ خود اپنے محور کے گرد زمین کی گردش کی باقاعدگی اور پابندیٔ وقت کی یہ کیفیت ہے کہ اگر صدی میں ایک سیکنڈ کا بھی فرق پڑ جاتے تو علمِ ہیئت کے سارے حساب و شمار غلط ہو جائیں۔ یہی حال زمین کے گرد چاند کی گردش

کا ہے۔اسی طرح چاند کا فاصلہ بھی اگر ہماری زمین سے موجودہ فاصلہ کی بجائے پچاس ہزار میل کے قریب ہوتا تو زمین پر قیامت بپا ہو جاتی۔دن میں دوبارہ ہمارے سمندروں سے پہاڑوں جیسی لہریں اُٹھتیں اور کوئی جاندار زندہ نہ بچتا۔

کُرۂ ارضی کے نظم وضبط اور توازن کے بارے میں اے کریسی ماریسن کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ دستِ قدرت نمایاں نظر آتے گا:۔

"زمین اپنے محور پر چوبیس گھنٹوں میں ایک گردش مکمل کر لیتی ہے اور چونکہ اس کا محیط بھی کوئی پچیس ہزار میل کے قریب ہے، اس لیے اس کی رفتار کم وبیش ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہونی چاہیے۔لیکن فرض کیجیے اس کی رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ ہوتی اور کیوں نہ ہوتی؛ ایسی صورت میں ہمارے شب وروز موجودہ شب وروز سے دس دس گنا طویل ہوتے اور گرمیوں کے موسم میں ایک سو بیس سے لے کر دو سو گھنٹے تک مسلسل چمکنے والا سورج ہماری ہر قسم کی نباتات کو جلا کر رکھ دیتا اور حیوانات میں سے کوئی بے حد سخت جان ہی زندہ رہ سکتا۔اسی طرح سردیوں کی اتنی طویل راتیں ہر چیز کو منجمد کر دیتیں اور نباتات وحیوانات کی بہت کم قسمیں سلامت رہ سکتیں۔پھر سُورج کی اپنی گرمی اس کی سطح پر بارہ ہزار درجہ فارن ہائیٹ کے قریب ہے اور ہماری زمین اس سے عین اتنے فاصلے پر واقع ہے کہ ہم اس کی "آتش جاودانی" سے صرف ایک نہایت موزوں ومناسب مقدار کی حرارت حاصل کرتے ہیں۔یہ حرارت حیرت انگیز طور پر یکساں اور مستقل ہے اور گزشتہ کروڑوں سال میں اس کے استقلال ہی کے باعث اس کُرے میں زندگی کی وہ صورتیں جن سے ہم واقف ہیں باقی وبرقرار رہی ہیں۔اگر ایسا نہ ہوتا اور ہم تک پہنچنے والی حرارتِ شمسی میں پچاس پچاس درجوں کا فرق بھی پڑنے لگتا تو زمین کی بیشتر نباتات مر جاتیں اور ان کے ساتھ ہی انسان بھی یا تو منجمد ہو جاتا یا جُھلس کر رہ جاتا۔پھر غور کیجیے کہ کرۂ زمین سُورج کے گرد اٹھارہ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کرتا ہے۔اگر اس کی گردش کی رفتار اٹھارہ کی بجائے چھ میل یا چالیس میل فی سیکنڈ ہوتی تو اسی حساب سے اس کا محیط موجودہ محیط کی نسبت بہت چھوٹا، یا

بہت بڑا ہوتا اور اسی حساب سے ہم سورج سے بہت زیادہ قریب یا بہت زیادہ دُور ہوتے اور ہمارے کُرے کی زندگی اپنی موجودہ صورت میں ہرگز قائم نہ ہو سکتی۔"

(۷ : ص ۲۰)

پودے

اس سلسلہ میں ایک اہم اقتباس درج ذیل ہے :-

"اس مضمون نگار کو یقین ہے کہ ایک خدائے جلیل موجود ہے جو متواتر پودوں کی حیرت انگیز زندگی، ان کے اسرار اور ناقابلِ تغیر قوانین کی صورت میں خود کو متواتر جلوہ گر کرتا رہتا ہے اور اس کے یہ جلوے جن صورتوں میں نظر آتے ہیں وہ یہ ہیں :-

(۱) تنظیم :- پودوں کی نشوونما اور پھر ان کے پھلنے پھولنے کا عمل جو ایک خلیے کے بڑے ہو جانے اور تقسیم ہونے کا نام ہے، انتہائی مرتب، باقاعدہ، حیرت انگیز اور ناقابلِ تغیر طریق سے تکمیل کو پہنچتا ہے۔

(۲) پیچیدگی :- ایک سادہ سے پودے کی نشوونما اور اس کی قسم کے پودوں کی پیدائش جو پیچیدہ طریق کار ہے، انسانی دماغ آج تک ایسی پیچیدہ مشین نہیں بنا سکا ہے۔

(۳) حُسن :- پودوں، تنوں، پتوں اور پھولوں کو جو ملکوتی حُسن ملا ہے، وہ نابغہ قسم کے انسان بھی اپنی مصنوعات کو نہیں دے سکے۔

(۴) تولید و توارث :- پودے اپنے ہم شکل اور ہم مثل نباتات پیدا کرتے ہیں اور یہ تولید و توارث بے ہنگم طریق پر نہیں ہوتی بلکہ گندم از گندم بروید جو ز جو۔ بہر حال ہر دور اور ہر زمانے میں زیتون کے درخت سے زیتون کا درخت اُگے گا۔"

(۳ : ص ۱۴۵)

زندگی

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا

چھوٹے سے چھوٹے جاندار کے جسم کی ساخت پر غور کیجیے خواہ وہ مکھی کا سر ہو یا مچھر کی ٹانگوں

کے جوڑ، زندگی اپنے ظہورِ ترتیب کے ساتھ جلوہ فرما ہے۔ ادھر بڑے بڑے ڈیل ڈول کے جانوروں کی جسمانی ساخت ملاحظہ ہو۔ ہاتھی کے گٹھے ہوئے عضلات آپس میں اس طرح سے مربوط ہیں کہ اعلیٰ درجے کی مشین کے بیرنگ اور جوڑ ان جسمانی جوڑوں اور رابطوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ پھر جانداروں کے جسم کی اندرونی ساخت ملاحظہ ہو۔ اعضائے رئیسہ بغیر جانوروں کی مرضی کے اور بغیر اس کے کنٹرول کے آپس میں پورے توازن و تعامل (Co-Ordination) کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ دماغ، دل، پھیپھڑے، جگر، گردے آخر کس کی ہدایات پر عمل کر رہے ہیں؛ پھر یہ خودکار دل جو پیدائش سے موت تک بغیر ستائے حرکت کیسے چلا جا رہا ہے اور سارے جسم میں خون کی روانی کو برقرار رکھتا ہے۔ پھر ہر جاندار کے پورے جسم میں ایک عصبی نظام پھیلا ہوا ہے جس کے سامنے دورِ حاضر کے بہترین برقی سلسلے بھی ہیچ ہیں۔ مخلوقات کی کم عمری اور کمزوری کے زمانے میں جس مہر و محبت کے ساتھ حفاظت کی جاتی ہے وہ بھی ایک انتہائی رحیم و شفیق خالق و پروردگار کے بغیر ممکن نہیں، انڈے کے جوف اور ماں کے رحم میں پلنے والے بچے کے لیے اتنی غذا فراہم کر دی جاتی ہے جو اس کی پیدائش تک اسے کافی ہو۔ کسی ماں سے پوچھیے کہ آیا اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کی غذا اور زندگی کی نشوونما کا انتظام اس نے خود ہی اپنے ارادے سے کیا ہوا ہے یا کسی اور کا ارادہ کارفرما ہے؟ ماں کے پیٹ میں بچہ بھی بے بس اور بچے کو اٹھاتے پھرنے والی ماں بھی بے بس، لیکن خوبصورت اور تنومند بچہ کس طرح سے پیٹ میں پلتا رہا۔ یہی حال اس بیج کا ہے جسے ہم زمین پر بکھیر کر آ جاتے ہیں اور پھر آسمان کی طرف نگاہیں لگاتے رکھتے ہیں۔ کون ہے جو اس بیج کے لیے بادل و برکھا، شمسی توانائی، زمین کی زرعی قوت اور ہوا و موسم کی سازگاری کے اسباب فراہم کرتا ہے؟ ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟

کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟

کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟

خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نُورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خُوئے انقلاب؟

زندگی خواہ وہ جانداروں میں ہو یا پودوں میں، وہ ابھی تک ایک معمّا ہے۔ انسان اب ذرّۂ آخر ترین یعنی جوہر کے طول و عرض سے آگاہ ہو کر اس کی پنہاں قوّتوں کا احاطہ کر رہا ہے لیکن زندگی ابھی تک ایک سایۂ گریزاں ہے، ایک نا قابلِ فہم چیستاں ہے۔ ابھی تک سائنس یہ معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی کہ وہ مرحلہ جب ایک مادّہ میں زندگی ظہور پذیر ہوتی ہے کس طرح وقوع پذیر ہو جاتا ہے۔ دل اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس مسئلہ کی تہ تک پہنچنے سے پہلے سائنس کو خدا کے وجود کا عرفان نصیب ہو جائے گا۔

انسانی دماغ کی ساخت پر غور کیجیے۔ اے کریسی ماریسن کے الفاظ میں "یہ ایک پورا ساز ینہ ہے جس کے لیے بے شمار باجے اپنی اپنی سُریں پیش کرتے اور باہم مل کر ایک ہم آہنگ نغمہ جو انسانی ذہانت کے نام سے معروف ہے، معرضِ تخلیق میں لے آتے ہیں اور پھر یہی نغمہ کارخانۂ ہستی میں ایک آہنگِ نو پیدا کرتا ہے اور اپنے سحر سے اسے حیرت انگیز طور پر منظّم کرتا چلا جاتا ہے۔ انسان کی تخلیق تک فطرت نے اس زمین کی قدیم چٹانوں سے کوئی ایسا جاندار پیدا نہیں کیا تھا جسے انسان کا سا لچکدار دماغ حاصل تھا۔ چنانچہ یہ بات قابلِ غور و فکر ہے کہ انسان کو اپنی خلقت میں ذہانتِ اعلیٰ کے فانوسِ لاہُوتی کا ایک شعلہ مرحمت ہُوا کہ عالمین پر حاوی ہے اور یہ اسی شعلۂ ازل کی آدم افروزی ہے کہ انسان اس زمین پر اپنی اہلیّتوں میں بے مثال، اپنی سطوت میں بے عدیل اور اپنی منزلِ مقصود اور مقدّر کے اعتبار سے لافانی ثابت ہُوا"۔

کیمیا اور طبیعیات کے ہر نظریّے اور قاعدے کی رُو سے ارتقاء کے عمل کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول سے کامل مطابقت حاصل کرے لیکن اس سے آگے اس کا قدم نہیں اٹھ سکتا۔ اگر انسان کی تخلیق محض ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی ہی مرہونِ منت ہے تو ڈارون کا نظریہ یہاں تک تو

وضاحت کرتا ہے کہ انسان کا ذہن آہستہ آہستہ ماحول سے مطابقت اختیار کرتا چلا گیا لیکن یہ نظریہ ارتقاء اس بات کی کیونکر توجیہ کر سکتا ہے کہ انسان کا ذہن مطابقت کی منزل سے بہت آگے گزر کر اس کائنات کی تسخیر پر اُتر آیا اور وہ ماحول جس کی مطابقت اور پیروی اسے کرنا تھی، اسی ماحول کو اپنے گرد اپنی مرضی سے استعمال کرنے لگا۔ نظریہ ارتقا اس بات کی کیونکر توجیہ کر سکتا ہے کہ ایک انسان اپنی ذہنی افتاد اور روحانی صلاحیتوں کی بدولت ایّام کا مرکب نہیں بلکہ راکب بن جاتے۔

آنکھ

تخلیق کے معاملے میں ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو رد کرنے کے لیے آنکھ کا وجود بذاتِ خود ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ اگر کوئی صاحبِ نظر آنکھیں کھول کر اس آنکھ کا مشاہدہ کرے تو ایک خالق کا وجود ماننے بغیر چارہ ہی نہیں۔ اے کریسی ماریسن لکھتا ہے :-

"فطرت نے ہمارے احساسِ ہشت پہلو کو بلند تر کر کے اس کا رُخ گرمی سے روشنی کی طرف کیا اور ہماری آنکھ کو رنگ کا شعور عطا فرمایا۔ چنانچہ ہم دنیا اور اس کی اشیاء کو ان کے اصل رنگوں اور اصل مقامات کے مطابق دیکھنے کے قابل ہو گئے اور یہی ایک معیاری اور کامل بصری کیفیت ہے۔ پھر ہماری آنکھ کا خود کار عدسہ اپنی دبازت اور کثافت میں مسلسل تبدیلی کرتا رہتا ہے تاکہ اس تک پہنچنے والی تمام شعاعیں خود بخود ماسکے میں مرکوز ہوتی رہیں اور ہر آنے والی چیز اپنے صحیح فوکس میں نظر آتے۔ انسان اس قسم کے عدسے (Iens) آج تک ایجاد نہیں کر سکا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام حیرت ناک مطابقتیں جو چشمِ حیوانی کو اعلیٰ درجے کی بصارت عطا کرتی ہیں اور عینی عدسوں اور لاکھوں کروڑوں مخروطوں، ہڈیوں اور نسوں کو ایک کامل ترتیب میں منظم کرتی ہیں بیک وقت ہی وجود پذیر ہوتی ہوں گی، کیونکہ ان میں سے کسی ایک کی عدم موجودگی بھی بصارت کو باطل کر سکتی ہے اور اس صورت میں کسی حیوان کا کوئی چیز دیکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ پس سوچنے کی بات یہ ہے کہ آیا ان سب عناصر کا ایک ہی وقت میں یک جا ہو جانا کسی اتفاق پر مبنی تھا یا ان میں سے ہر عنصر تمام دوسرے عناصر کی ضروریات اور لوازم سے پیشتر ہی آگاہ ہو کر اپنے آپ کو اُن کے مطابق کر لینے پر قادر ہو چکا تھا؟"

کان

کان سے متعلق اُس کا مشاہدہ ملاحظہ ہو:

"انسانی کان کا ایک حصّہ قریب قریب چار ہزار ایسی باریک ترین لیکن پیچیدہ محرابوں پر مشتمل ہے جو قامت اور صورت کے لحاظ سے ایک کامل تدریجی سلسلہ بناتی ہیں۔ انہیں ہم ایک اعلیٰ درجہ کے آلۂ موسیقی کی محرابوں سے تشبیہ دے سکتے ہیں اور یہ ایک دوسری سے اِس انداز میں مطابقت رکھتی ہیں کہ ان کی اہلیت آواز کے ہر اُس مدوجزر کو جو بادلوں کی کڑک سے لے کر ہَوا سے ہلنے والے درختوں کی سائیں سائیں یا کسی سازینے کے ہر رُکن کی علیٰحدہ علیٰحدہ سُروں سے پیدا ہوتا ہے پُوری صحت کے ساتھ وصول کرے اور فوراً دماغ تک پہنچا دے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسانی کان کی تخلیق و ترتیب سے متعلق خلیات محض اس تحریک پر کام کر رہے تھے کہ وہ اپنی اعلیٰ کارگزاری میں محض اس کی بقا کو پیشِ نظر رکھیں تو انہوں نے اپنے کام کو زیادہ وسعت کیوں دی اور اس کے لیے غیر معمولی قوتِ سامعہ کے حصول کا انصرام کیوں نہ کیا؟ کیا اس لیے کہ ان خلیات کی پُشت پر جو طاقت کارفرما تھی اس نے محسوس کر لیا تھا کہ مستقبل کے انسان کو ذہنی لطف اندوزی کی ضروریات بھی پیش آئیں گی۔ یا پھر یہ محض ایک اتفاق تھا کہ انہوں نے جو تعمیر کی اس کی خوبیاں ان کے تصوّر سے بالاتر تھیں"۔



حصّۂ سوم

باب ۱۳

بُرہانِ تکوینی

کائنات کی تخلیق پر غور کرتے ہوئے فلسفیوں نے خود کائنات کی تخلیق کو خدا کے وجود کا ثبوت تسلیم کیا ہے۔ یہ کائنات کس طرح سے وجود میں آگئی اس کی کوئی ابتدا بھی ہے یا نہیں اور ابتدا بھی ہے یا نہیں اور ابتدا ہوئی تو کس طرح سے۔ کیا چیزیں خود بخود پیدا ہو جایا کرتی ہیں یا ہر چیز کے پیدا ہونے کے لیے کسی خارجی سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔

دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز پیدا ہوتے وقت اپنے آپ سے باہر کی چیزوں کا سہارا لیتی ہے۔ گندم کا ایک خوشہ پیدا ہونے سے پہلے زمین کی طاقت، ہوا، پانی اور دیگر بہت سی قوّتوں کا سہارا لیتا ہے۔ ان سہاروں کو پیدا ہونے کے لیے اور سہاروں کی ضرورت ہے اور ان سہاروں کو پیدا ہونے کے لیے اور سہاروں کی ضرورت۔ الف کو ب نے پیدا کیا۔ ب کو ج نے ج کو د نے، اور جُوں جُوں حقیقت آگے بڑھتی چلی جاتے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ یہ کہہ دیں گے کہ ازل سے چیزیں پیدا ہوتی چلی آئی ہیں اور کوئی آخری سہارا نہیں ہے اس لیے کہ ایک خالق کا دوسرا خالق اور اس کا تیسرا خالق اور پھر اس کو اگر یوں ہی بڑھاتے چلے جائیں تو معلوم ہوگا کہ ہر خالق کا کوئی نہ کوئی خالق چلا آ رہا ہے۔ نتیجہ کے طور پر ہمیں ماننا پڑے گا کہ کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جس کو پہلی مرتبہ کسی ایسی ہستی نے پیدا کیا ہو جو بغیر کسی مدد کے خود بخود پیدا ہوئی ہو۔ اسے تسلیم کرتے ہی ہمیں فوراً تسلیم کرنا پڑے گا کہ تخلیق کا عمل خود بخود چلا آ رہا ہے اور کوئی خالق نمبر ا موجود نہیں ہے۔

لیکن جب پہلے خالق کے وجود کا ہی انکار کر دیں تو تخلیق کے عمل کا انکار کرنا پڑے گا تو تمام مخلوقات کے وجود کی نفی کرنا پڑے گی حالانکہ مخلوقات ہماری آنکھوں کے سامنے بڑھ رہی ہیں ان کے وجود کی نفی اپنے آپ کو دھوکا دینے کی بات ہے۔ اس دلیل کو اس انداز میں دُہرایا جا سکتا ہے۔

فصل ۱

عِلّتِ اُولیٰ

دُنیا میں سب سے زیادہ واضح اور بدیہی امر یہ ہے کہ ہم اپنے سامنے حرکت، تغیّر، تخلیق، ارتقاء، علّت و معلول، ہر گھڑی دیکھ رہے ہیں۔ اس کے لیے فلسفہ میں ایک لفظ "حرکت" مستعمل ہے۔ اب ذیل کے کچھ قضیوں پر غور فرمایئے :۔

قضیہ نمبر۱۔ دنیا میں حرکت کا وجود ہے۔ (حرکت موجود ہے)

قضیہ نمبر۲۔ ہر حرکت کے لیے مُحرّک (حرکت دینے والا) ضروری ہے۔
(ہر معلول کے لیے علّت یا ہر مخلوق کے لیے خالق ضروری ہے)

قضیہ نمبر۳۔ ہر مُحرّک کے لیے ایک اور مُحرّک کا ہونا ضروری ہے۔
(ہر علّت کے لیے پھر ایک اور علّت کی ضرورت ہے)

قضیہ نمبر۴۔ یہ سلسلہ غیر متناہی ہے (یعنی اِس مُحرّک کے لیے اور مُحرّک اور اُس مُحرّک کے لیے ایک اور مُحرّک اور پھر اور، پھر اور، یعنی سلسلہ کی کوئی انتہا و انجام نہیں (علّت اور معلول کے اس سلسلہ کی کوئی آخری کڑی نہیں)

قضیہ نمبر۵۔ (اس لیے) مُحرّکِ اوّل کا وجود ہی نہیں۔

قضیہ نمبر۶۔ (اس لیے) حرکت کا وجود نہیں ہے (اس لیے کہ جب مُحرّکِ اوّل ہی موجود نہیں تو حرکت کہاں سے آگئی)

غور کیجیے کہ ان قضیوں میں قضیہ ۱ سے قضیہ ۳ تک تمام قضیے بدیہیات ہیں قضیہ ۴ پر پہنچ کر دو باتیں فرض کی جا سکتی ہیں :۔

۱۔ یہ سلسلہ غیر تناہی ہے۔

۲۔ یہ سلسلہ تناہی ہے۔

پہلا مفروضہ اختیار کرنے کی صورت میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مُحرّکِ اوّل کا وجود ممکن نہیں رہتا اور حرکت کے وجود کی نفی آجاتی ہے اور قضیہ ع۶ ہمارے قضیہ ع۱ سے ٹکرا جاتا ہے (حالانکہ قضیہ ۱ بدیہیات میں سے ہے)

اس کا مطلب یہ ہے کہ مفروضہ نمبر ا کی صورت میں ہم تناقض (Self-contradiction) کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ قضیہ نمبر ۴ کی جگہ پر مفروضہ نمبر ۲ کو لازماً اختیار کریں اور وہ یہ ہے کہ:

"علّت و معلول یا حرکت و مُحرّک کا یہ سلسلہ غیر تناہی نہیں بلکہ لازماً اس کی انتہا موجود ہے۔ ایک علّت ضرور ایسی ہے جس کی آگے کوئی علّت نہیں ہے۔"

چنانچہ ہمیں یہی قضیے اس انداز سے لکھنا پڑیں گے:۔

قضیہ ع۱ : کائنات میں حرکت کا وجود موجود ہے۔ (بدیہی امر)

قضیہ ع۲ : ہر حرکت کے لیے مُحرّک کا وجود لازمی ہے۔ "

قضیہ ع۳ : ہر مُحرّک کے لیے ایک اور مُحرّک کی ضرورت ہے۔ "

قضیہ ع۴ : حرکت و مُحرّک (علّت و معلول) کا یہ سلسلہ لازماً تناہی ہونا چاہیے۔ (لازمی مفروضہ)

قضیہ ع۵ : مُحرّکِ اوّل (خالقِ اوّل) کا وجود ثابت ہُوا۔

مُحرّکِ اوّل کے وجود سے ہی حرکت کا وجود ثابت رہ سکتا ہے ورنہ حرکت کی نفی لازم آتے گی اور یہ بات ہمارے قضیہ ع۱ سے ہی ٹکرا جاتے گی جس میں مذکور ہے کہ "کائنات میں حرکت کا وجود موجود ہے۔"

سچّی بات یہ ہے کہ اس دَور میں جبکہ سائنس نے قریب قریب یہ بات طے کر دی ہے کہ

یہ دنیا قدیم نہیں بلکہ حادث ہے۔ یہ ازلی نہیں ہے، بلکہ اس کی ابتدا بھی ہے اور جدید طبیعیات نے یہاں تک ترقی کی کہ اس کائنات کی عمر بھی متعین کر دی تو ان حالات میں یہ دلیل اور بھی زیادہ مضبوط ہو گی کہ ایک وقت ایسا تھا جبکہ کائنات میں کچھ بھی نہیں تھا صرف ایک ہستی تھی جس نے سب کو پیدا کر دیا۔ کائنات کی تخلیق کی اس سے بہتر توجیہ ممکن نہیں ہے اس لیے کہ جن لوگوں نے خالق کے وجود کا انکار کیا ان کی اصل بنیاد یہ تھی کہ مادّہ ازلی ہے اور قدیم ہے، کوئی وقت ایسا نہیں گزرا جب یہ موجود نہ ہو۔ مادّہ کبھی غیر موجود نہیں تھا، یہ ہمیشہ موجود تھا اس لیے اس کو عدم سے وجود میں لانے یا پیدا کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ تخلیق کی بجائے ارتقاء (evolution) الاپتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی گزرا کہ لوگ مادہ کو ازلی سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کے ابدی ہونے کا بھی اقرار کرتے رہے اور قانونِ بقائے مادّہ پُر زور انداز میں ہر تعلیم گاہ میں پڑھایا جاتا رہا۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات اِس بات سے واقف ہیں کہ قانون بقائے مادّہ ایک پُرانی بات بلکہ ایک رَدّ شدہ نظریہ ہو کر رہ گیا ہے اور جدید سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مادّہ کو بقا حاصل نہیں۔ مادّہ نہ ابدی ہے اور نہ ازلی۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد مادیّت کی اصل جڑ کٹ گئی ہے اب یہ سوال ایک اہم صورت اختیار کر گیا ہے کہ مادّہ جب موجود نہ تھا تو کیسے وجود میں لایا گیا۔ جب یہ کائنات عدم میں تھی، غیر موجود تھی تو کس طرح وجود میں آئی۔ کیا بغیر وجود میں لانے والے کے؟ کیا بغیر کسی خالق کے؟

مادیّت کا پرچار کرنے والوں نے ہمیشہ یہ بات کہی ہے کہ کائنات کی تخلیق محض ایک اتفاق ہے، ایک حادثہ ہے، یہاں تک کہ کائنات کا باقی رہنا اور ارتقائی منزلیں طے کرتے چلے جانا سب کچھ اتفاق ہی اتفاق ہے۔ وہ اس کے لیے دلچسپ مثالیں دیتے ہیں۔ ایک مثال یہ ہے کہ اگر چند بندروں کو ٹائپ رائٹر دے دیئے جائیں اور وہ مسلسل ٹائپ رائٹر پہ (بغیر ٹائپ رائٹنگ جانے) اُنگلیاں مارتے رہیں اور ایسا ہزاروں سال تک ہوتا رہے۔ بندروں کی عمر بھی طویل ہو اور کاغذ کی سیاہی بھی ختم نہ ہو، تو ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ یہ بندر شیکسپیئر کے

سارے ڈرامے ..... یا لٹریچر کے دیگر فن پارے سبھی تخلیق کر جائیں گے۔

اس اعتراض کا جواب دینے میں اور اس مثال پر زیادہ بحث کرنے میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں ہے لیکن اس پر ایک اہم سوال پیشِ خدمت ہے اور وہ یہ کہ آخر یہ بندر شیکسپیئر کے ڈراموں تک ہی کیوں پہنچے، ایک اتفاق یہ بھی ہونا چاہیے کہ وہ بدکلامی کی انتہا کو پہنچتے، یا فنِ کلام کا ہی خاتمہ کر دیتے۔ مزید برآں یہ مثال اس بات کا جواب بھی نہیں دیتی کہ ٹائپ رائٹر کے حروفِ ابجد کہاں سے آگئے، ان کا آپس میں لفظی رشتہ کس نے پیدا کر دیا۔

اگر یہ کائنات مسلسل اتفاقات کا نتیجہ ہے اور حادثات کا نتیجہ ہے تو کیا وجہ ہے کہ کائنات مسلسل نظم وضبط کے ساتھ ترقی کرتی چلی جا رہی ہے اور باقی ہے؟ اگر اتفاقات ہی اتفاقات ہیں تو ان کروڑوں سالوں میں ایک اتفاق یہ بھی ہونا چاہیے تھا کہ یہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے لیکن ان اتفاقات میں اس بات کی تو ہمیشہ احتیاط کی گئی ہے کہ یہ کائنات ختم نہ ہونے پاتے اور باقی رہے یہ ہدایت دینے والا کون ہے؟

مادیت کے ماننے والوں سے ایک اہم سوال یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ اگر مادہ ہی نے ہر چیز کو خود بخود پیدا کر دیا ہے تو گویا مادہ نے عقل کو بھی خود ہی پیدا کر دیا جو بعد میں اس کی حاکم بن گئی اور مادہ کو مسخر کر کے، غلام بنا کے ہر جگہ خدمت لینے لگی۔

مادیت کے ماننے والے اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ عقل کی تخلیق مادہ کے تسلسلِ دوام کا نتیجہ ہے یعنی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مادہ ترقی کر کے خود بخود عقل بن گیا۔ یہاں پر اہم سوال یہ ہے اور یہی سوال عقل کے علاوہ توانائی، روح اور زندگی کے لیے بھی اٹھایا جاسکتا ہے، کہ وہ منزل کب آئی جب مادہ عقل میں تبدیل ہو گیا یا روح میں تبدیل ہو گیا یا زندگی میں تبدیل ہو گیا اور یہ منزل مادہ کے ایک حصہ پر ہی کیوں آئی۔ مادہ کے کل پر اور تمام مادہ پر یعنی پوری کائنات پر کیوں نہ آگئی۔ پھر زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ ایسا کیونکر ہو گیا کہ مادہ کا وہ بدنصیب حصہ جو عقل، روح، زندگی، توانائی نہ بن سکا وہ عقل اور روح کے لیے تدبیرِ منزل بن گیا اس کا کام فقط یہ ہوا کہ

وہ عقل اور رُوح کی چاکری کرتا رہے۔ یہ مادہ اِس منزل میں بسنے والے جاندار وں کی ضرورت کے مطابق غذا وغیرہ کے مہیا کرنے کا انتظام کرتا رہتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ مادّہ کی ظاہری شکل دیکھنے سے یا اس کے بعض اعمال تجربے کے ذریعے سے معلوم کر لینے سے مادّہ کو خالقِ کُل قرار دے دینا غیر سائنٹفک بات ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ شخص جس کو حیاتیات (Biology) میں مہارت ہو اور اعضائے جسمانی کی حرکتوں کو سمجھتا ہو وہ زندگی کی حقیقت کو بھی سمجھ لے۔ اور زندگی کے خالق کے وجود کے بارے میں صحیح فیصلہ کر سکے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ ایک بڑھئی شطرنج کے مُہرے بناتا بناتا یہ خیال بھی کرنے لگے کہ وہ شطرنج کا بہترین کھلاڑی بھی ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک شخص وہ بھی ہے جو شطرنج کے مُہرے تو بڑھئی کی طرح نہیں بنا سکتا لیکن ان مُہروں کا مقصد اور شطرنج کے کھیل کی حقیقت سے پوُری طرح آگاہ ہے۔

مادیّت کا پرچار کرنے والے اسی غلطی کے مُرتکب ہوُتے ہیں۔ وہ مادّہ کی حرکات سے متعلق ذرا سی واقفیت حاصل ہونے پر مادّہ کی حقیقت، اس کا مقصد اس کی تخلیق یہاں تک کہ اس کے حادث یا قدیم ہونے کے بارے میں غیر ذمّہ دارانہ طور پر رائے دینے لگے ہیں۔ یہ ان کا میدان نہ تھا اور نہ انہیں ضرورت تھی کہ وہ اس میدان میں قدم رکھیں جو ان کی تحقیقات کے دائرہ سے بالکل باہر اور الگ ہے۔ خالق کے وجود کا انکار ان حضرات نے کسی سائنسی تحقیق کی بنا پر نہیں کیا بلکہ محض اٹکل پچّو پر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ خدا کے وجود کی دلیل مانگتے ہیں اور دلیل سننے کے بعد بے اطمینانی کا اظہار کر دیتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوُا کہ اُنھوں نے اس بات کی پہلے کوئی دلیل دے دی ہو کہ خدا کا وجود غیر ممکن ہے۔

انسان کو ہوش میں آتے ہی جن بدیہی مقدمات کا علم ہوتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کو باترتیب، منظّم اور باقاعدہ دیکھتا ہے تو اسے فوراً یقین ہو جاتا ہے کہ کسی دانشمند نے ان چیزوں کو ترتیب دیا ہے، اگر کسی جگہ ہم چند اشیا بغیر ترتیب رکھے ہوُئے دیکھیں تو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ یہ چیزیں آپ سے آپ اکٹھی ہو گئی ہونگی لیکن جب اس طریقہ ترتیب اور سلیقہ سے چُنی

گئی ہوں کہ ایک ہوشیار کاریگر بھی اس طرح سے نہیں چُن سکتا ہے تو یہ خیال کبھی نہیں ہو سکتا کہ یہ ترتیب آپ سے آپ پیدا ہو گئی ہو گی۔ اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ غالبؔ یا اقبالؔ کا کوئی شعر لے لیا جائے، اس کے الفاظ اُلٹ پلٹ کر کے کسی عام آدمی کے سامنے رکھ دیئے جائیں اور اس سے کہا جائے کہ یہ الفاظ ایک عمدہ شعر کے ہیں انہیں ترتیب دے دو تاکہ عمدہ شعر پھر سے بن جائے۔ وہ شخص ہزار طرح سے ان الفاظ کو اُلٹ پلٹ کرے گا لیکن اتفاقیہ طور سے بھی کبھی یہ نہیں ہو گا کہ غالبؔ اور اقبالؔ کا وہ شعر نکل آئے حالانکہ الفاظ وہی ہیں، حروف وہی ہیں، صرف ذرا سی ترتیب کا اُلٹ پھیر ہے، پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ پورا نظامِ کائنات جب اس قدر مربوط، منظّم، موزوں اور باقاعدہ ہے وہ خود بخود قائم ہو گیا ہے۔ قرآن مجید میں خدا کے وجود پر اس طرح استدلال کیا گیا ہے:

مَا تَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۔ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۔ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۔ (الملک - ۳)

"خدا کی کاریگری میں تم کو کہیں جھول نظر نہیں آئے گی نظر اُلٹ اُلٹ کے دیکھو کیا تمہیں کہیں کوئی دراڑ یا خرابی دکھائی دیتی ہے"

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۔ (الفرقان - ۲)

"خدا نے ہر شے کو پیدا کیا، پھر اس کا ایک معیار معیّن کیا"

فصل ب

مسئلہ حادث و قدیم علم الکلام کی روشنی میں

آئیے اب کائنات کے حادث یا قدیم ہونے کے مسئلہ کو علم الکلام کی روشنی میں حل کریں:

(۱) کائنات میں دو قسم کی اشیاء پائی جاتی ہیں: (ا) عرض: یعنی وہ اشیاء جو بذاتِ خود موجود نہیں بلکہ کسی دوسری میں ہو کر پائی جاتی ہیں مثلاً رنگ، بُو، ذائقہ، رنج، خوشی اور جوش وغیرہ۔

(ب) جوہر: یعنی وہ اشیاء جو بذاتِ خود قائم اور موجود ہیں۔ مثلاً پانی، مٹی اور پتھر وغیرہ۔

(۲) کوئی جوہر کسی وقت بھی عرض کے بغیر یا عرض سے خالی نہیں ہو سکتا کیونکہ کائنات میں جس قدر جوہر ہیں۔ کسی نہ کسی صورت، شکل یا ہیئت میں پائے جاتے ہیں اور ہیئت عرض ہے۔ تمام جوہروں میں کسی نہ کسی قسم کی حرکت کا وجود پایا جاتا ہے اور حرکت عرض ہے۔ غرض جوہر خواہ کسی شکل میں بھی ہو اس میں کسی نہ کسی عرض کا پایا جانا ضروری ہے یعنی کوئی جوہر عرض سے خالی نہیں ہو سکتا۔

(۳) عرض حادث ہے یعنی پیدا ہوتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے۔

(۴) جوہر بھی حادث ہے کیونکہ عرض حادث ہے، عرض اور جوہر جُدا نہیں ہو سکتے۔ اگر جوہر کو قدیم مانا جاتے تو لازم ہو گا کہ عرض بھی قدیم ہے کیونکہ دو چیزیں جو لازم ملزوم ہوں ان میں سے اگر ایک چیز قدیم ہو گی تو لازم ہے کہ دوسری چیز بھی قدیم ہو، ورنہ لازم و ملزوم میں فصلِ زمانی ماننا پڑے گا اور یہ محال ہے۔

(۵) کائنات قدیم نہیں بلکہ حادث ہے کیونکہ کائنات دو صورتوں سے خالی نہیں، جوہر ہو گا یا عرض، اور جوہر اور عرض دونوں حادث ہیں۔

(۶) اگر کائنات ہے تو ضروری ہے کہ اس کے لیے کوئی علّت ہو۔ اب اگر علّت بھی حادث ہے تو اس کے لیے بھی کوئی علّت درکار ہو گی۔ اب یہاں پر دو باتیں فرض کی جا سکتی ہیں (۱) یہ کہ علّتوں کا یہ سلسلہ کہیں جا کر ختم نہ ہو۔ یہ سلسلہ ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح سے ہو، اور ایک کڑی سے دوسری کڑی وابستہ ہو اور ان کڑیوں کا سلسلہ کہیں بھی ختم نہ ہو۔ علّتوں کی اس زنجیر کا کوئی دوسرا سرا موجود نہ ہو۔ اس سلسلہ میں دَور تسلسل لازم آتے گا اور زمانہ غیر متناہی کا وجود لازم آتے گا جو عقلاً محال ہے۔

باب ۱۴

بُرہانِ غایت

کائنات کی کوئی چیز بے مقصد نظر نہیں آتی۔ مخلوقات میں ہر چیز ایک مقصد اور اپنی رفتارِ تدبّر میں ایک حکمت کی خبر دیتی ہے۔ انسانی جسم کے کسی عضو کو لے لیجیے، اپنی اپنی جگہ پر ایک مخصوص فرض کی انجام دہی کر رہا ہے۔ یہی حال کائنات کی ہر چیز کا ہے۔

اگر کائنات کی ہر چیز اپنے اندر کوئی مقصد اور حکمت رکھتی ہے تو ثابت ہو گیا کہ پوری کائنات ضرور کوئی نہ کوئی مقصد رکھتی ہے، ایسا مقصد جو اسے کسی حادثہ یا اتفاق کے نتیجہ میں نہ ملے۔

کائنات کی مقصدیّت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس کا ایک خالق ہے جس نے تدبیرِ حکمت کے ساتھ ایک مقصد پورا کرنے کے لیے اس کائنات کی تخلیق کی۔

اگر اس کائنات کا کوئی مُدبّر خالق نہ ہوتا تو اس کائنات کی اکثر اشیاء بے مقصد اور بے فائدہ ہوتیں۔ لیکن ابھی تک ہمارے سائنسدان کسی ایسی چیز کی نشان دہی نہیں کر سکے جو مقصد اور فائدہ سے خالی ہو۔

اس دلیل پر ایک اعتراض وارد ہوا ہے اور وہ یہ کہ اگر ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مقصد اور فائدہ ہے اور دنیا میں کوئی چیز بلا مقصد اور بلا فائدہ نہیں تو زندگی میں شر اور تکلیف کا وجود کیوں ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ عالم میں ایک حکیم کا مقصد اور حکمت کارفرما ہے تو پھر یہ تکلیف، یہ نقص، یہ شر اور یہ ظلم کیوں ہے؟

اس سوال کا جواب ہم دو طرح سے دے سکتے ہیں:

پہلا جواب یہ ہے کہ یہ کائنات ایک کُل ہے اور اس کی موجودات اس کا جزء ہیں۔ کائنات کی کوئی ایک چیز کُل کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ایک جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس طرح دُنیا کے تمام واقعات اپنی اپنی جگہ پر مستقل واقعات نہیں ہیں بلکہ ایک طویل سلسلۂ واقعات کی کڑیاں ہیں۔ یہ کوتاہ نظری ہوگی کہ ہم کسی شخص کی بیماری، درد، تکلیف یا موت کو ایک مستقل واقعہ کی حیثیت دے دیں اور اس کے پس منظر، اس کے ماحول، اس کے ماضی اور اس کے مستقبل کو بالکل نظر انداز کر دیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک باغبان ایک باغ کو خوبصورت بنانے کے لیے پودوں میں کاٹ چھانٹ کرتا ہے، درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر ان میں قلمیں لگاتا ہے اور کبھی تو قینچی کے بے دریغ استعمال سے ایسا کٹاؤ کرتا ہے کہ سینکڑوں اور ہزاروں پتیاں اور شاخیں کٹ کر الگ جا گرتی ہیں۔ اب ان شاخوں اور پتّیوں کو یوں کاٹ کر الگ پھینک دیئے جانے کو اگر معترضین کی نظر سے دیکھا جائے تو ان پر سراسر ظلم کیا جا رہا ہے لیکن اگر ایک باغبان کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو باغ کی زندگی، باغ کا حُسن یا باغ کی رونق اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور کہیں قینچی کا استعمال ہے، کہیں چاقو کا اور کہیں کُدال کا۔ بالکل یہی حالت اس کائنات کے انتظام کی بھی ہے۔ اس کائنات کا منتظم خوب جانتا ہے کہ کس وقت اور کس جگہ کس کارروائی کی ضرورت ہے۔

اس بات کو ایک اور مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک سمجھدار شخصیت جو کرسیٔ وزارت پر ہو اور حاکمِ وقت ہو وہ ایک ملک کے حالات کو بہتر انداز میں سمجھتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک اَن پڑھ گنوار اگر چند سیاسی واقعات کو اس کے پس منظر سے ہٹا کر تنقید کا نشانہ بنا دے تو یہ اس کی اپنی کوتاہ نظری ہوگی۔

اس جواب پر معترضین یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ آخر اللہ تعالیٰ جو رؤف اور رحیم ہے ایک ایسا نظام بھی تو بنا سکتا تھا جس میں کائنات کا نظام چلتا رہتا اور کسی کو کوئی تکلیف نہ ہوتی۔

یہ اعتراض پھر وہی کائنات کی حقیقت سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ علمی بحث میں پڑے بغیر آیئے ہم اس کائنات کا اس کائنات سے مقابلہ کریں جو معترضین اپنے خیال میں صحیح سمجھتے ہیں۔

اگر معترضین کی خیالی کائنات ہمارے دل کو زیادہ لبھائے تو بیشک یہ معترضین ٹھیک کہتے ہیں۔ اور اگر یہی کائنات جس میں ہم سانس لے رہے ہیں تصور سے زیادہ قریب ہے تو اعتراض خود بخود غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

غالباً معترضین کی خیالی دنیا ایسی ہونی چاہیے جس میں کسی چیز میں کوئی خرابی اور کوئی کمی پوری ہونے کا انتظار موجود نہ ہو۔ نہ کوئی نقص ہو نہ زیادتی، نہ باپ نہ بیٹا، نہ کوئی چھوٹا نہ کوئی بڑا، نہ کوئی ذہین نہ کوئی کُند ذہن، نہ کوئی بدصورت نہ کوئی خوبصورت (اس لیے کہ خوبصورتی کا تصوّر بھی بدصورتی کے وجود ہی سے ممکن ہے)۔ کسی کی صلاحیّتِ استعداد میں کوئی فرق نہ ہو۔ نہ کوئی مذکّر ہو نہ کوئی مؤنّث۔ اس کے باشندے ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہنے والے اور ایک گروہ ہوں، نہ کوئی مرے نہ کسی کو بھوک لگے نہ پیاس، نہ کوئی غذا طلب کرے نہ دوا۔

چونکہ اس خیالی کائنات میں کوئی نقص نہ ہوگا اس لیے کوئی حدود و قیود بھی ممکن نہیں چنانچہ ایک شخص اور پھر دوسرے شخص کے درمیان کوئی فرق نہ ہو۔ کروڑوں اور لاکھوں انسان آپس کے فرق کے بغیر ایک نسخہ کتاب کی طرح ہوں۔ اختلاف اور تفاوت کی اس میں گنجائش ہی نہیں ہو سکتی، کیونکہ اختلاف کی علّت یہ ہے کہ یہاں ایک صفتِ ناقص ہے، اور وہ وہاں پائی جاتی ہے اس صورت میں تو ایک عدد ایسا انسان پیدا ہونا چاہیے جو ایک انسانیت کا اجتماع ہو نہ اس میں کوئی کمی ہو نہ تعدّد، نہ ابتدا ہو نہ انتہا۔

یہ خیالی کائنات چونکہ انتظار کی تکلیف سے خالی ہوگی اس لیے اس میں آج کے بعد کوئی کل نہ ہوگا۔ لیجیے وقت کی قید سے بھی آزادی ہوئی۔ ہاں جذباتِ محبت و اشتیاق، یہ سب تکلیف کی باتیں ہیں، یہ جہان اس سے بھی خالی ہوگا۔ معترضین اپنی اس خیالی کائنات پر از راہِ کرم دوبارہ غور فرمائیں۔

ابنِ رُشد نے اس اعتراض کا خوب جواب دیا ہے وہ کہتا ہے کہ دُنیا میں بدی کا وجود بذاتِ خود نہیں یعنی دنیا میں جو بُرائی بھی پائی جاتی ہے وہ کسی اچھائی کی تابع اور لازم ہے۔ غُصّہ

بُری چیز ہے لیکن اس حاسّہ کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے انسان حفاظت خود اختیار کرتا ہے۔ یہ حاسّہ نہ ہو تو انسان ایک حملہ آور کے مقابلہ میں اپنی جان بچانے کی بھی کوشش نہ کرے۔ فسق و فجور بُری باتیں ہیں لیکن یہ اسی قوّت کی تابع ہیں جس پر نسلِ انسانی کی بقا مضمر ہے۔ آگ شہروں کے شہر جلا دیتی ہے لیکن اگر آگ نہ ہو تو انسان کے لیے زندگی بسر کرنا ناممکن ہو جائے۔

یہاں ایک اور شُبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ جو چیز پیدا کی جاتی اُس میں اچھّائی ہی اچھائی ہوتی، بُرائی مطلق نہ ہوتی۔ ابنِ رشد کہتا ہے کہ کائنات کے اس نظام میں یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ کوئی ایسی آگ پیدا نہیں کی جاسکتی کہ اس سے کھانا تو پکالیں لیکن اگر مسجد کو جلانا چاہیں تو نہ جلا سکے۔

اِس مرحلے پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ دُنیا میں اکثر اچھے آدمی تکلیف اُٹھاتے ہیں اور بُرے آدمی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض اس غلط مفروضہ پر قائم ہے کہ انسان کی زندگی بس موت پر ختم ہو جاتی ہے، اصل میں انسان کی دنیوی زندگی اس کی حقیقی زندگی کا ایک بہت ہی معمولی حصّہ ہے اس لیے یہ کیونکر فرض کیا جا سکتا ہے کہ ہم جن کو عیش و عشرت میں زندگی بسر کرتے دیکھتے رہتے ہیں یہ اُن کی پُوری زندگی کی تصویر ہے، اس کی بنا پر ہم پُورے سلسلہ کی نسبت کیونکر رائے دے سکتے ہیں۔

مزید برآں غور کرنے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ جزا و سزا افعالِ انسانی کے لازمی نتائج ہیں جو کسی طرح اُن سے جُدا نہیں ہو سکتے۔ جس طرح سے کہ زہر کھانے کا نتیجہ موت اور عمدہ خوراک کا نتیجہ اچھی صحت ہے اس بنا پر یہ کہنا صحیح نہیں کہ بہت سے لوگ اچھے یا بُرے کام کرتے ہیں اور اُن کا نتیجہ ان کو پیش نہیں آتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں جو تکلیفیں اور بُرائیاں دنیا میں نظر آتی ہیں ضروری نہیں کہ وہ واقعی نقائص ہوں۔ ہمیں یہ باتیں اس لیے نقائص محسوس ہوتی ہیں کہ ہم نے نظامِ عالم کا پُورا سلسلہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ اس بات کو ایک مثال سے واضح کیا جاسکتا ہے:۔

ایک جرّاح کسی بچّے کے پھوڑے کا علاج کر رہا ہے اور آپریشن کے ذریعہ سے فاسد مادہ نکال رہا ہے۔ جرّاح کا نشتر اور آپریشن کا عمل بچّے کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دِہ بُرائی ہے۔ اے کاش اس بچّے کو پھوڑے، جرّاح اور آپریشن کی حقیقت معلوم ہوتی تو وہ آپریشن کے عمل کو بُرائی قرار نہ دیتا بلکہ ایک نعمت سمجھتا۔

بچّہ نادانی کے سبب انگاروں میں ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے۔ ماں اس کے اصرار کے باوجود اس کا ہاتھ انگاروں میں نہیں جانے دیتی۔ وہ چاقو سے کھیلنا چاہتا ہے، ماں اُس سے چاقو چھین لیتی ہے وہ روتا ہے، چیختا ہے، چلّاتا ہے، بچّے کی نظر میں ماں کا ہر عمل تکلیف دہ ہے اور اس کی نظر میں ماں ایک بدلحاظ اور بے مروّت اور دشمن قسم کی شخصیّت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بچّے کی نظر انگارے کی ظاہری چمک دمک سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ وہ ان دونوں افعال کے نتائج اور بعد کی تکلیف کو نہیں سمجھا۔ اگر اُس کی محدود نظر میں ذرا سی وسعت پیدا ہو جائے تو اُسے ماں سے زیادہ کوئی بھی مشفق ہستی نظر نہ آئے۔

باب ۱۵

بُرہانِ اَخلاق

جرمن فلسفی کانٹ نے یہ دلیل بہت زور دار انداز میں بیان کی ہے، اور اُس نے انسان کی توجّہ اس ضمیر کی آواز کی طرف مبذول کرائی ہے جو ہر انسان کے اندر سے اُٹھتی ہے۔ وہ پُوچھتا ہے کہ انسان کی فطرت میں یہ حقیقت کہاں سے آئی کہ وہ اپنے لیے پُرمشقت فرائض کی بجا آوری کو نفسانی خواہشات کے مقابلہ میں زیادہ بہتر سمجھتا ہے؟ حالانکہ یہ اس کے دل میں چُھپی ہُوئی بات ہے جس کا کسی غیر کو علم نہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ایک شخص وفاداری کے جوش میں دوسرے شخص پر اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیتا ہے؟ ایک شخص اُٹھتا ہے اور اپنے ملک پر، اپنی قوم پر اور اپنے دین پر اپنی جان نچھاور کر دیتا ہے۔ یہ قربانی کا جذبہ کہاں سے آگیا؟ انسان جب بُرائی کرنے لگتا ہے تو اس کو ٹوکنے والے ضمیر کی آواز کہاں سے آنے لگتی ہے؟ آخر ایک مُجرِم جُرم کرنے کے بعد اپنے آپ کو ملامت کیوں کرتا ہے۔ یہ کون مُنصف مزاج مجسٹریٹ ہے جو ہر شخص کے اندر بیٹھا ہُوا ہے، اور اس کے اعمال کو غلط یا صحیح ہونے کے فتوے صادر کرتا رہتا ہے۔

کانٹ کہتا ہے کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا وجود ہے جو انسانی نفس میں ایک ایسی نشانی اور دلیل قائم کرتا ہے جو بغیر معبود کے وجود کے ممکن نہیں۔ یہ وجود معبودِ حقیقی ہے جو احساسِ فرض اور ضمیر کی آواز میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس دلیل پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ ضمیر کی آواز درحقیقت ایک اجتماعی عادت ہے جو شروع شروع میں انسانی نفس میں پیدا ہوتی، پھر راسخ ہُوتی اور پھر ورثہ کے طور پر ہم تک منتقل ہوگئی، اور اب یہ ہماری فطرت کہلاتی ہے۔

معترضین یہ بات بھول جاتے ہیں کہ کسی سبب کے دریافت ہونے سے اس عمل کے اصل مقصود کا باطل ہونا لازم نہیں آتا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ضمیر کی یہ آواز ایک اجتماعی عادت ہے اور آہستہ آہستہ انسانی نفس میں راسخ ہوئی تو اس سے یہ بات کہاں ثابت ہوگی کہ ضمیر کی آواز بے معنی عمل ہے یا حکمت سے بالکل خالی ہے یا اس کا کوئی منبع موجود نہیں ہے۔

باب ۱۶

دو ٹوک فیصلہ

وجودِ باری تعالیٰ سے متعلق بے شمار دلائل دیئے جا سکتے ہیں مگر آیئے ایک نیا اسلوب اختیار کریں۔ وہ لوگ جو وجودِ باری تعالیٰ پر یقین رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو اس کے منکر ہیں، ان دونوں کی پوزیشن کا الگ الگ جائزہ لے لیا جائے، بات خود بخود کھل جائے گی:۔

۱۔ وہ لوگ جنہوں نے انسانیت کو دراصل وجودِ باری تعالیٰ کی طرف دعوت دی، نبوت کا دعویٰ لے کر آئے، یہ دعویٰ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی، انتہائی قرب، نامہ و پیام اور مناجاتِ حقیقی کا شرف حاصل کیا ہے۔ اور یہ بات وہ کسی اندازے اور ظن و تخمین کی بنیاد پر نہیں کہہ رہے بلکہ انتہائی واضح ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر کہہ رہے ہیں جو غیر متزلزل یقین و ایمان لیے ہوتے ہے۔

اس کے برعکس وہ لوگ جو وجودِ الٰہی کے منکر ہیں، ان کے پاس اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ ان کے پاس عقل کے علاوہ کوئی اور یقینی ذریعۂ علم بھی نہیں ہے۔ وہ ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں، جو بات سمجھ میں آجاتی ہے مان لیتے ہیں، جو سمجھ میں نہیں آتی، ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ان کے افکار انہیں زیادہ سے زیادہ ظن و تخمین تک لے جاتے ہیں، انہیں خود بھی اپنے افکار پر غیر متزلزل یقین حاصل نہیں ہے۔

۲۔ وجودِ باری تعالیٰ کے حامی لوگ (انبیاء علیہم السّلام) مختلف زمانوں اور مختلف جگہوں پر آئے ہیں۔ کوئی عرب میں، کوئی مصر میں، کوئی ہزار سال پہلے، کوئی ہزار سال بعد، لیکن سب لوگ اپنے دعوے میں یک زبان ہیں، ان کی تعلیمات بھی بنیادی طور پر ایک جیسی ہیں گویا کہ وہ سب

ایک ہی ذریعۂ تعلیم سے مستفید ہو کر آتے ہیں۔

اس کے برعکس منکرینِ وجودِ باری تعالیٰ ہمیشہ مختلف الخیال رہے ہیں۔ خواہ قریب قریب رہتے ہوں یا دُور دُور، ایک ہی زمانہ میں ہوں یا پہلے اور بعد، سب کے نظریات باہم دگر مختلف ہیں آپس میں کوئی اتفاق نہیں۔

۳۔ اوّل الذکر (حضرتِ انبیاءؑ) نے ایک مرتبہ جو بات کہہ دی، زندگی بھر کے لیے وہی تعلیم ٹھہری، اس میں کبھی تغیّر و تبدّل کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، ان کی ہر بات ایمان و یقین کامل لیے ہوتے ہے۔

اس کے برعکس منکرینِ وجودِ باری تعالیٰ مختلف مسائل میں اپنی رائے پر یقین نہیں رکھتے ان میں تبدیلیٔ رائے کی مثالیں بے حد کثرت کے ساتھ ملتی ہیں۔ ان کے اکثر مفکّرین کا حال یہ ہے کہ کل تک جس نظریہ کو پُورے زور کے ساتھ پیش کر رہا تھا، آج اس نے اپنے پہلے نظریہ کی تردید کر دی اور ایک نیا نظریہ پیش کر دیا۔

۴۔ داعیانِ وجودِ باری تعالیٰ اپنے کردار یعنی راستبازی، امانت، صداقت، حُسنِ خُلق ہر چیز میں اپنے معاشرے کے ممتاز ترین انسان ہیں، جس بات کی تعلیم دیتے ہیں، سب سے پہلے خود اس پر عمل کرتے ہیں۔

اس کے برعکس منکرینِ وجودِ باری تعالیٰ کردار کے معاملے میں اوّل الذکر حضرات کے مقابلے میں انتہائی کمزور ہیں۔ اکثر ایسا ہی ہُوا ہے کہ جن نظریات کا پرچار انہوں نے کیا وہ خود اس پر عمل نہیں کر سکے۔

داعیانِ وجودِ باری تعالیٰ اِس دنیا میں اپنے ہمسایوں اور رشتہ داروں کے درمیان بھی انتہائی کامیاب زندگی گزارتے رہے ہیں۔ بظاہر تکالیف کے باوجود انتہائی مطمئن، انتہائی ایثار پیشہ اور آخرکار لوگوں میں انتہائی معزّز اور دانشمند ترین انسان کہلاتے۔

اس کے برعکس منکرینِ وجودِ باری تعالیٰ تمام دُنیوی آسائشوں کو حاصل کرنے کے باوجود

بھی انتہائی پریشان حال اور ناکام انسان نظر آتے ہیں۔ ان میں بہت سے مفکرین ایسے ہیں جنہوں نے دنیا سے تنگ آکر خودکشی کر ڈالی۔

۷۔ اوّل الذکر کے بارے میں تاریخِ انسانیت یہ متفقہ فیصلہ سناتی ہے کہ سب سے زیادہ انہوں نے ہی انسانیت کو متاثر کیا، سب سے اہم اصلاحی انقلاب اُنہی کی بدولت آئے اور اسی وجہ سے جریدۂ عالم پر ان کا دوام ثبت ہے۔

اس کے برعکس مُنکرینِ وجودِ باری تعالیٰ کی یہ پوزیشن نہیں ہے۔ انسانیت نے ان کی تعلیمات سے کوئی گہرا اثر نہیں لیا اور نہ وہ کسی اہم اصلاحی انقلاب کا باعث ہوتے ہیں۔

اب اگر ان تمام نکات کو سامنے رکھا جائے تو عقلِ سلیم بلا جھجک اوّل الذکر فریق (داعیانِ وجودِ باری تعالیٰ) کے حق میں فیصلہ دے دیگی۔ سیدھی سی بات ہے کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں اتنے عاقل، پاک سیرت اور صادق القول آدمیوں نے متفق ہو کر آج تک کسی دُوسرے نظریے کی تائید اتنی قوّت اور یقین و ایمان کے ساتھ نہیں کی ہے۔

مزید برآں یہ کہ ایسے پاکیزہ سیرت اور اتنے کثیر التعداد لوگوں کا مختلف زمانوں اور مختلف مقامات میں اس دعوے پر متفق ہو جانا کہ ان سب کے پاس ایک غیر معمولی ذریعۂ علم ہے اور وہ ہے وحی یعنی اللہ تعالیٰ سے براہِ راست نامہ و پیام۔ اور پھر ان سب حضرات کا ایک ہی دعوت دینا، ایک ہی تعلیم کا پرچار کرنا، اور اس کے لیے انتہائی شدید اذیتیں برداشت کرنا، حتیٰ کہ اس راہ میں جان تک سے ہاتھ دھو بیٹھنا۔ کوئی ہزار میل مشرق میں ہے، کوئی ہزار میل مغرب میں۔ کوئی ہزار سال پہلے، کوئی ہزار سال بعد، لیکن ایک ہی پیغام، ایک ہی دعوت، ایک ہی تعلیم، وہی توحید، وہی آخرت کا عقیدہ، وہی حسنِ اخلاق کا پرچار!

کیا یہ محض اتفاق ہی اتفاق ہے، یہ بات تو صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کی عقل ماری گئی ہو!

حصّہ چہارم

اِستدلالِ قرآنی

قلب ونظر کی زندگی

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام!

قرآن مجید کا طرزِ استدلال (وجودِ باری تعالیٰ اور توحید پر دلائلِ قرآنیہ)

قرآن کا تصوّرِ خدا (یہود، ہنود، نصاریٰ اور مجوسیوں کا تصوّرِ خدا اور اس کا ابطال)

(بندہ اور خدا کے درمیان رشتۂ محبت، بعض اسماء وصفاتِ الٰہیہ کی شرح)

اعجازِ قرآنی - قرآنِ مجید کے حیران کُن سائنسی انکشافات -

چند اہم پیشین گوئیاں جو پُوری ہوئیں - (اعجازِ نبویؐ کا زندہ ثبوت)

—※—

باب ۱۷

قلب و نظر کی زندگی

قرآن مجید انسان سے قلب و نظر کی زندگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ اسے اس کے اپنے نفس، اپنے دل و جان کے جھروکوں میں نظر ڈالنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ"

ترجمہ: "تم اپنے اندر ہی جھانک کر دیکھ لو۔ کیا تمہیں کچھ نظر نہیں آتا؟"

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی زبان میں اس آیت کا ترجمہ یوں ہو گا:

ع اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

اور ؎ جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر کچھ دیر کے لیے اپنے فکر کو ہر مصنوعی بندھن سے آزاد کر دے اور اس سوچ میں پڑ جائے کہ اس کی فطرت سلیم اس سے کیا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے دل میں کیا کیا آرزوئیں، اُمنگیں اور ارمان مچل رہے ہیں۔ کیا یہ سب اسی قابل ہیں کہ ہمیشہ ہمیش کے لیے ان کا گلا گھونٹ دیا جائے اور اپنے آپ کو یہ سمجھا لیا جائے کہ یہ فطری آرزوئیں کبھی پوری نہیں ہو سکتیں؟

انسان خود بھی حسین ہے اور حسن پرست بھی ہے۔ وہ جمالِ یار کے اظہار کے لیے فن کی دنیا میں نام پیدا کرتا چلا آیا ہے۔ یہ حُسن ہے کیا؟ پھر حسن سے اس قدر والہانہ محبّت کا جذبہ! یہ سب کیا ہے؟ اس قدر حسین کائنات کہاں سے آ گئی؟ اگر یہ بھی کسی فن کار کی تخلیق ہے تو وہ فن کار کس قدر حسین ہو گا؟

آیئے کچھ دیر کے لیے قرآن مجید کے اس تقاضے پر عمل کریں۔ اپنے من میں ڈوب جائیں۔ انسانی فطرت کے تقاضوں پر غور کریں۔ حُسن و جمال کی باتیں کریں۔ شاید اسی دوران اس پردہ نشیں کا سُراغ

مل جائے جو ہماری اس کتاب کا اصل موضوع ہے۔

سر جے آرتھر تھامسن، ایم اے ایل ایل ڈی اپنے مضمون "عجائبات حیات" میں لکھتے ہیں:

"کائنات میں چار سُو حُسن بکھرا پڑا ہے۔ یہ ناچتے ہُوئے پھول، یہ مسکراتے ہُوئے تارے، گنگناتی ہوائیں، مست گھٹائیں، لہراتی ہوئی بجلیاں، گاتی ہوئی ندیاں، روپہلی چاندنی، سنہری دھوپ، خمار آلود شامیں، سرمئی راتیں، جلوے ہی جلوے، نغمے ہی نغمے، طور کا عالم، ایمن کا منظر! یوں معلوم ہوتا ہے کہ کائنات نے قوس قزح سے رنگینی اور کہکشاں سے روشنی مستعار لے لی ہے۔"

(۵ : ۵۵)

آئن سٹائن لکھتا ہے:

"میری راتے میں حسین ترین چیز وہ ہے جو پُراسرار ہو۔ سائنس اور سچے آرٹ کا مأخذ یہی ہے کہ جو شخص ذوقِ تماشا سے محروم ہو، جو بار بار رُک کر اظہارِ حیرت نہ کرے اور فطرت کی لاانتہایت سے مرعوب نہ ہو وہ مردہ ہے اور اس کی آنکھیں بند ہیں۔"

(۵ : ۲۸)

حقیقت یہ ہے کہ ہر حسین چیز ایک تخلیقی عمل ہوتا ہے۔ اور اس کے پیچھے کسی تخلیقی ذہن کی کارفرمائی پوشیدہ ہوتی ہے۔ انسان ایک حسین مخلوق ہے۔ شاعروں نے قامتِ محبوب پہ نہایت خوبصورت شعر کہے۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
مَیں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہُوا تھا (غالب)

مگر قامتِ یار ہرگز قیامت برپا نہ کرتی اگر انسان کی دونوں ٹانگیں برابر نہ ہوتیں۔ اس خلّاقِ اعظم کی تخلیقی عظمت کے قربان جایئے کہ دو ٹانگوں میں تو بال برابر بھی فرق نہیں ہے۔ لیکن ہاتھ پاؤں کی اُنگلیاں برابر نہیں ہیں، اس لیے کہ یہاں مقصود کچھ اور ہے۔ اگر ٹانگیں برابر نہ ہوتیں تو انسان

بے ڈھب ہو جاتا، اور چلنے کے لائق نہ رہتا اور اگر ہاتھ کی انگلیاں برابر ہو جاتیں تو انسان ان ہاتھوں سے کام نہ کر سکتا۔ انگوٹھا ایک خاص کام انجام دے رہا ہے، چھوٹی انگلیاں کچھ اور کام اور بڑی انگلیاں کچھ اور کام اور مل کے پنجہ ایک اور کام!

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ"

ایک سائنسدان میرٹ سٹینلے آن ڈان پی ایچ ڈی کہتا ہے:

"کئی سال ہوئے پنسلوانیا کے ایک غیر آباد اور سنسان راستے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک جگہ سڑک کے کنارے خوب صورت پھولوں سے لدا ہوا گلاب کا ایک پودا دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی شخص نے بڑے اہتمام سے اسے یہاں لگایا ہے اور بڑی محنت سے اس کی کانٹ چھانٹ کی ہے۔ کچھ عرصے بعد پھر وہاں جانا ہوا تو پودے کے پاس جھاڑ جھنکار کھڑے تھے۔ قریب ہی ایک ٹوٹا پھوٹا مکان تھا اور غیر آباد تھا۔ اب اس بات کا تو کوئی امکان نہیں کہ یوں کہا جاتے کہ اس گلاب کا بیج یا ٹہنی ہوا کے ذریعے اڑ کر یا پانی میں بہہ کر خود بخود آگئی ہو گی جس نے یہاں آکر جڑ پکڑ لی تھی یا کسی پرندے کی بیٹ یا چوہے کی مینگنیوں کے ذریعے اس کی تخم ریزی ہو گئی ہو گی۔ میرے وجدان نے کہا کہ یقیناً کبھی یہاں کوئی خوش ذوق آدمی آکر رہا ہو گا، اس نے اپنا مکان بنایا، گلاب کا پودا لگایا، اس نے اس کی دیکھ بھال اور کانٹ چھانٹ کی، حالانکہ نہ تو یہ جھاڑیاں میرے سامنے لگیں نہ گلاب کا پودا میرے سامنے لگایا گیا، مگر ذوق شہادت دیتا ہے کہ کسی نے اس کو لگایا ضرور تھا۔ یہ کسی انسان کے ذہن کی کارفرمائی تھی۔ پس یہ بات ہر گز نہیں مان سکتا کہ گلاب کا پودا خود بخود لگ گیا ہو اور خود بخود صفائی ہو گئی اور پھر خود بخود سب کچھ اجڑ کر اس کی جگہ جھاڑی آگئی۔ جو شخص ایسا کہے میں اسے عقل سے خارج قرار دونگا، میں اسے بے عقل قرار دونگا۔" (۶ : ۸۷)

جرمن فلسفی کانٹ کہتا ہے:

"دو چیزیں ایسی ہیں جو مجھے خدا کے وجود کا اقرار کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ایک تو میرے

اندرِ ضمیر کی الہامی آواز اور دوسری رات کے وقت تاروں بھرے آسمان کا منظر۔"

سر فرانسیس ینگ ہسبینڈ ڈاکٹر آف سائنس اپنے مضمون "اسرارِ فطرت" میں لکھتے ہیں:

"جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری یہ زمین کھولتے ہوئے سورج سے نکلی تھی تو ان بے پناہ تبدیلیوں پر حیرت ہوتی ہے جن کی آخری کڑی دامنِ کوہ کا ننھا سا رنگین پھول تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی غیر مرئی طاقت نے ناچتے ہوئے شعلوں کو رام کر کے مسکراتے ہوئے پھولوں میں بدل دیا....

ہم سائنس سے پوچھتے ہیں کہ کیا سائنس میں دانشِ اعلیٰ کا تصوّر ایک غیر سائنسی فریب ہے۔ قطعاً نہیں۔ جب سائنس ہی ہمیں یہ بتاتی ہے کہ وادیٔ تبت کا ننھا سا پھول کسی وقت بھڑکتے ہوئے سورج کا شعلہ تھا تو اسے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ سورج کے شعلے سے پھول تک کا طویل سفر کسی راہ نما کی نگرانی ہی میں طے ہوا ہوگا ورنہ ایک شعلے میں اتنی دانش کہاں کہ وہ ہزاروں انقلابات سے گزر کر از خود پھول کی ہیئت اختیار کرے۔ سائنس جوں جوں آگے بڑھتی ہے یہ سوال بھی اہمیت اختیار کرتا جاتا ہے کہ پسِ حجاب کون ہے اور کیا کر رہا ہے....

پھول کا پودا بیج سے نکلتا ہے۔ بیج میں پودے کا پلان اور نقشہ اسی طرح موجود ہوتا ہے جیسے معمار کے پاس کسی عمارت کا نقشہ ہو۔ جیسے معمار ہر اینٹ اس نقشے کے مطابق رکھتا ہے اسی طرح کوئی غیر مرئی ہاتھ کائنات کی اینٹوں یعنی خلیوں کو پلان کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔ خود خلیے اتنے دانشمند نہیں ہیں کہ کہیں سے ترتیب اور نزاکت رنگ اور خوشبو مانگ کر از خود گلاب کا پھول بن جائیں۔ بیج میں پھول کا پلان اسی طرح وارد ہوتا ہے، جیسے کون و مکان میں خالقِ کائنات کا ارادہ۔" (۳۴:۵)

امریکہ کے ایک شاعر وائٹ مین والٹ (Whitman Walt ۱۸۱۹-۱۸۹۲ء) نے ایک نظم میں کہا تھا:

"کائنات میں گھاس کی پتی کو وہی اہمیت حاصل ہے جو کسی ستارے کی شعاع کو میرے ہاتھ کا ایک جوڑ انسان کی بنائی ہوئی ہر مشین سے بہتر ہے۔ یہ سر جھکا کر چلنے والی گائے ہر مجسمے سے حسین تر ہے۔ ایک چیونٹی یا چوہے کی تخلیق اتنا بڑا اعجاز ہے کہ اگر دنیا کے ملاحدہ اس پر غور کریں تو کروڑوں ایمان لے آئیں۔"

(۵۳ : ۵)

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام

یہ سوال تو ہم بار بار اُٹھا چکے ہیں کہ کائنات میں ہر سُو بکھرا ہُوا حسن کسی عظیم فن کار کے تخلیقی فن کی نمود ہی ہو سکتا ہے۔ آئندہ سطور میں بھی ہم اس بے پایاں حُسن کی نیرنگیاں اس انداز میں بیان کریں گے جیسے قرآن مجید میں پیش کیا گیا ہے۔ یہی وہ آیات بیّنات ہیں جنہیں دیکھنے والی آنکھ جب دیکھتی ہے تو اس کے حُسن میں ڈوب کر خالقِ حُسن کی تلاش میں مگن ہو جاتی ہے۔ صاحبِ بصیرت آنکھ ہر فن پارۂ حسن میں احسن الخالقین کے تخلیقی ہاتھ کا مشاہدہ کرتی ہے اور اس کی محبت میں ڈوب کر پُرنم ہو جاتی ہے۔

ہر صاحبِ بصیرت شخص جب اس کائنات کے حسن، نیرنگی اور نعمتوں سے لبریز خوانِ کرم کو دیکھتا ہے تو وہ اپنے ہی دل کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ اس کے احساسات، جذبات اسے کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔

حُسنِ ازل کی ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لیے ہزار سُود ایک نگاہ کا زیاں

یہاں بطور جُملہ معترضہ ہم ایک سوال اور بھی کریں گے اور وہ یہ ہے کہ انسان کے جذبات کے اس سمندر کا منبع و مصدر کیا ہے؟ انسان میں محبت، نفرت، عشق، ہجر و فراق، قرب و وصال، امید، ہراس، یاس، خوف اور یہ سب تڑپنے پھڑکنے کی کیفیات کہاں سے آگئیں۔ کیا ان کا منبع الیکٹران اور پروٹان ہیں اور بس! کیا اس سے بہتر کوئی اور مصدر تصوّر میں نہیں آتا؟

قرآن مجید میں تو اس سوال کا سیدھا سادہ جواب موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ سب مشاعر، احساسات و جذبات اور نیکی و بدی کے تصورات اللہ تعالیٰ نے انسان کی روح میں الہام فرما دیئے ہیں۔ روح کیا ہے وہ بذاتِ خود اللہ تعالیٰ کا امر ہے:

"قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي" (الاسراء: ۸۵)

"کہہ دو کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے"
(میرے رب کا امر ہے، میرے رب کی شان ہے)

"فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا" (الشمس: ۸) "پھر اس نے (انسانی نفس کو، برائی اور نیکی کی دونوں راہیں سجھا دیں۔"

"وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ" (البلد: ۱۰) "اور ہم نے اسے دونوں راستے بتا دیئے۔"

"وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً" (الروم ۲۱) "ہم نے تم میں محبت (دوستی) اور رحمت ڈال دی۔"

اب اگر کسی کے ذہن میں اس جواب سے بہتر کوئی جواب ہے تو بیان کرے، اہلِ علم اور اہلِ دل خود ہی فیصلہ کرلیں گے۔

اس سلسلہ میں ایک مثال پیشِ خدمت ہے:

فرض کیجیے کسی صحرا کے وسط میں ایک شاندار محل تعمیر کیا گیا ہے۔ محل میں رہنے والے کہیں گئے ہوئے ہیں۔ اسی اثنا میں ایک دیہاتی جس نے کبھی پختہ تعمیر شدہ مکان نہیں دیکھا، کسی غار سے نکل کر اس محل میں جا پہنچتا ہے۔ وہ اس محل کی تعمیر اور اس کے نقش و نگار پر حیران رہ جاتا ہے۔ سوچتا ہے کہ یہ محل کس طرح تعمیر ہوا۔ اچانک اس کی نگاہ ایک دیوار پر پڑتی ہے جس پر محل کی تعمیر کا پورا پلان موجود ہے۔ نقشہ، فارمولا اور ہر وہ چیز جو محل کی تعمیر میں استعمال ہوئی، اس کی تفصیل اور ترکیب دیوار پر درج ہے۔

یہ سب کچھ پڑھنے کے بعد وہ دیہاتی اپنی جگہ مطمئن ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نقشہ اور اس مسالہ نے محل کو جنم دیا، فلاں فلاں قوانینِ طبیعی اور فلاں فلاں فارمولے استعمال ہوئے اور محل وجود میں آگیا۔

محل کی ساخت، ترکیب، تنظیم، قوانینِ تعمیر، قوانینِ طبیعی اس دیہاتی کو اس قدر حیرت میں ڈال دیتے ہیں کہ وہ اتنی ساری معلومات اچھی طرح ہضم نہیں کر سکتا۔ اس علمی بدہضمی کے سبب اس کا خیال انہی معلومات تک محدود رہتا ہے اور انہی قوانینِ طبیعی اور محل میں استعمال شدہ اینٹوں اور مسالے کو ہی محل کا اصل معمار سمجھ لیتا ہے۔ یہ بدہضمی اس کے ذہن کو محل کے نقشہ نویس (Designer) اس کے انجینئر، معمار اور مالک کی طرف جانے ہی نہیں دیتی اور اس کی فکر کی بساط صرف وہیں تک رہ جاتی ہے جو کچھ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا یا پڑھا۔

یہی حال ان مادّہ پرست فلسفیوں یا یک چشم سائنس دانوں کا ہے جو کائنات سے متعلق ناپختہ اور ادھوری معلومات حاصل کرنے کے بعد علمی بدہضمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور کائنات کے وجود کو مادّہ اور قوانینِ طبیعی کی طرف منسوب کرنے لگتے ہیں اور خالق و مالک کے وجود کا انکار کر دیتے ہیں۔

یہ بات ایک اور مثال کے ذریعہ بیان کی جا سکتی ہے۔

فرض کیجیے ہمارے ہاتھوں میں ایک کتاب ہے۔ جوں ہی ہم اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں، ہم پر کتاب کے مُصنّف کی شخصیّت واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کتاب کی عبارت میں ادبی رنگ نمایاں ہے، ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ مُصنّف ادیب ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کتاب میں جدت و نُدرت نمایاں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ مُصنّف فکر بدیعی Original Thinking کا حامل ہے۔ اگر کتاب میں نحو و صرف پر بحث کی گئی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ مُصنّف نحوی ہے۔ اگر سائنس کے موضوعات زیرِ بحث ہیں تو ہم اسے سائنس دان شمار کرتے ہیں۔ اگر کتاب میں افکار بے ربط اور غیر معقول ہیں تو ہم جان لیتے ہیں کہ مُصنّف ایک مفکّر نہیں ہے۔ اگر کتاب میں افکارِ سلیمہ موجود ہوں اور بار ربط و مدلّل بھی ہوں تو ہم کہتے ہیں کہ مُصنّف ایک مُفکّرِ عظیم ہے۔

غرض یہ کہ ہم جب کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی ہر خوبی، ہر حُسن اور ہر بات کو کتاب کے صفحاتِ قرطاس کی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ کتاب کے مُصنّف کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

اب آئیے کائنات کی ایک بہت بڑی کتاب ہمارے سامنے کھلی ہوئی ہے۔ اس کتاب کا ہر ورق اپنے مُصنّف کی کسی نہ کسی صفت کی نشاندہی کرتا ہے۔ کتابِ کائنات کے تمام آثار اس کی رحمتوں اور مہربانیوں کی قسم کھاتے ہیں۔ کتابِ کائنات کا مصنّف ان آثار و آیات کا مطالعہ کرنے کی تمہیں دعوت دیتا ہے:۔

فَانْظُرْ اِلٰی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰہِ۔ "(اے دیکھنے والے) تو خدا کی رحمت کی نشانیوں کی طرف دیکھ"

(الروم: ۵۰)

ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کتابِ کائنات قدیم نہیں ہے بلکہ حادث ہے، ازلی و ابدی نہیں ہے بلکہ کسی

وقت اس کی ابتدا ہوئی اور اس کی انتہا بھی ضروری ہو گی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ضرور کوئی خالقِ اوّل ہے جس نے اسے وجود بخشا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں زندہ ہستیاں موجود ہیں۔ ضرور اس زندگی کو پیدا کرنے والا اور اسے برقرار رکھنے والا موجود ہے جسے المحی کہا جاتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ زندہ ہستیاں موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں۔ ضرور کوئی ایسی ہستی موجود ہے جو موت طاری کرنے والی ہے (الممیت)۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں ذی ارادہ ہستیاں ہیں جنہیں نیکی و بدی کا شعور عطا ہوا ہے۔ اپنے بھلے و بُرے کی تمیز! بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، اسے فوراً یہ بات سمجھا دی جاتی ہے کہ ماں کے پستانوں سے لپٹ کر انہیں چوسنا شروع کر دو۔ چوسنے کا فن کس نے سکھا دیا؟ ضرور کوئی ہدایت دینے والی ہستی موجود ہے (الہادی)۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ گھٹیا جذبات کی وجہ سے ضد میں آجاتے ہیں اور ہدایت سے مُنہ موڑ لیتے ہیں۔ کوئی ایسی باغیرت ہستی ضرور موجود ہے جو اس ضدی انسان کو ٹھکرا کر ہدایت سے بعید تر کر دی ہے (المضلّ)

کائنات میں ایجاد، جدّت، ابتکار یعنی روز نئی نئی اشیاء ظہور پذیر ہوتی ہیں معلوم ہوتا ہے کتابِ کائنات کا مُصنّف فنِ تخلیق کے ساتھ ساتھ ابداع کا بھی مصدرِ کامل ہے (بدیع السموات والارض)۔

لوگوں کو مشکل آن پڑتی ہے، ضرورتیں لاحق ہوتی ہیں، وہ اس کائنات کے خالق سے سوال و طلب کرتے ہیں۔ ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ ضرورتیں پُوری کرنے والا ضرور موجود ہے (المجیب)۔

کتابِ کائنات کیا ہے۔ رحمتوں، کرم نوازیوں، بخششوں، عطاؤں کا خوانِ کرم ہے۔ نعمتیں ہی نعمتیں۔ کوئی تو ہے جس نے ان نعمتوں کی ہم پر بارش کر دی (المُنعم، المُعطی)۔

کائنات کی کوئی چیز حکمت و مصلحت سے خالی نظر نہیں آتی۔ گھاس کا تنکا ہو یا نظامِ شمسی، ہر چیز مصلحت و حکمت سے بھرپور۔ پتہ چلا کہ کائنات اور ان اشیاء کا پیدا کرنے والا دانشِ اعلیٰ کا پیکر

ہے (الحکیم، العلیم)۔

پھر ہم نے یہ بھی دیکھا کہ پوری کائنات ایک نظامِ وحدت میں پروئی ہوئی ہے۔ اُوپر سے نیچے تک چھوٹی سے چھوٹی چیز ایٹم یا بڑے سے بڑا نظامِ شمسی سب ایک ہی طرز پر، ایک ہی نظام میں جکڑے ہوئے ہیں۔ معلوم ہُوا کہ اس کتابِ کائنات کو بہت سے مصنّفوں نے نہیں وجود بخشا، ایک ہی مُصنّف ہیں ایک (الواحد، الاحد)

آیئے اس کتاب کی مزید ورق گردانی کریں۔ قرآن مجید میں کتابِ کائنات کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ یہی آثار ہیں، یہی آیاتِ انفس و آفاق ہیں۔ اُردو کے دائرۃ المعارف میں انہیں انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا ایک حصّہ ملاحظہ فرمایئے:

اور یہ آیات کیا ہیں ؟ اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت اور شانِ خلّاقی کے مظاہر، جو اس کی معرفت میں ہماری رہنمائی کریں گے، اس لیے کہ ان سب کی تہ میں اسی کی مشیت کام کر رہی ہے، لہٰذا ضروری ٹھیرا کہ ہم ان کے مطالعے میں اس بہت بڑے انعام یعنی استعدادِ علم سے کام لیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں بخشا اور جس کا تقاضا ہے فکر و نظر، تجربہ اور مشاہدہ، تحقیق و طلب، کیونکہ یہی وہ اعمال ہیں جن سے علم میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور اس کا سلسلہ لحظہ بلحظہ آگے بڑھتا ہے۔ ہم زمین اور آسمانوں کی پیدائش پر غور کریں گے (۳ [آل عمران] : ۱۹۱)، زمین کے پھیلاؤ اور پہاڑوں کی اونچائی پر، سطحِ ارض پر کہ اس میں کس طرح پہلو بہ پہلو قطعات بنتے چلے گئے ہیں۔ ان میں انگوروں کے باغ ہیں، غلّے کی کھیتیاں، کھجوروں کے جھنڈ۔ کسی کی جڑ کسی سے مل گئی ہے، کسی کی بالکل الگ تھلگ، حالانکہ سب ایک ہی پانی سے سینچے جاتے ہیں۔ بعینہٖ بار آوری میں بھی ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل ہے (الرّعد : ۴)۔ ان میں نر و مادہ بھی ہیں اور نر و مادہ کی تفریق سے وہ جوڑا جوڑا بن گئے ہیں۔ پھر کیسی کیسی چیزیں ہیں جو زمین سے اُگتی ہیں ہری بھری کھیتیاں، دانوں پر دانے، کھجوروں کے گچھے۔ انگور، زیتون اور انار کے باغ، کچھ ملتے جُلتے کچھ مختلف۔ پھلوں کا پکنا بھی ایک آیت ہے (الانعام : ۹۸، ۹۹)، اسی طرح پانی کا برسنا، نہروں کا جاری ہونا (الرعد : ۱۷)، کھیتیوں کا رنگ لانا، رنگ کا زرد پڑ جانا تا آنکہ وہ ریزہ ریزہ ہو کر گر جاتی ہیں۔ (الزُّمر : ۲۱)۔ پرندے کس خوبی سے فضا میں مُسخّر ہیں (النحل : ۷۹) بجلی کوندتی ہے تو انسان اسے خوف و طمع کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بارش نازل ہوتی ہے تو اس سے مُردہ زمین کو ازسرِ نَو زندگی مل جاتی ہے (الروم : ۲۴)۔ پھر چاند، سُورج (حٰمٓ السجدہ : ۳۷)، اور ستارے، دن اور رات (حٰمٓ السجدہ : ۳۷) سایے پھیل جاتے ہیں حالانکہ ساکن بھی رہ سکتے تھے (الفرقان : ۴۵)۔ زمین و آسمان اپنی اپنی جگہ پر ٹھیرے ہیں (الرُّوم : ۲۴)۔ اور انسان ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں تھا (الدھر : ۱)۔ اسے مٹّی اور علقے سے پیدا کیا گیا۔ اس کا سلسلۂ نسب چلا (حٰمٓ السجدہ : ۸)، اور رُوئے زمین میں پھیل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شے جوڑا جوڑا پیدا کی (النبا : ۸)، انسان، حیوان، نباتات (طٰہٰ : ۵۳)، بلکہ ہر وہ چیز جو زمین سے اُگتی ہے اور ہر وہ چیز بھی جس کا ہمیں علم نہیں (یٰسٓ : ۳۶)، لہٰذا مرد و زن پیدا ہوئے اور ان کا وجود ایک دوسرے کے لیے

وجہِ تسکین ٹھیرا۔ ان کے دلوں میں رحمت اور مودّت پیدا کر دی گئی (الرّوم : ۲۱)۔ ہم نفسِ واحد سے پیدا ہُوئے (النساء : ۱)۔ یہ سب اس کی آیات ہیں۔ ہمارے رنگ اور زبان کا اختلاف اس کی آیت ہے (الروم : ۲۲)۔ ہمارے دلوں میں اس کی آیات ہیں۔ اہلِ یقین کے لیے کرۂ ارض میں ہر کہیں اس کی آیات ہیں (الذاریات : ۲۱)۔ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کیے اور ان میں زندہ ہستیاں پھیلا دیں (الشوریٰ : ۲۹) اسے یہ بھی قدرت حاصل ہے کہ ان سب کو باہم جمع کر دے (الشوریٰ : ۲۹)۔ اس نے جسمِ حیوانی کی کثافت اور خون ہی کے درمیان سے دودھ ایسا دل پسند مشروب پیدا کیا (النحل : ۶۶)، کھجوروں اور انگوروں سے نشہ اور کھانے پینے کی عمدہ عمدہ چیزیں۔ پھر شہد کی مکھی سے کہ پہاڑوں اور درختوں میں گھر بناتی اور طرح طرح کے پھلوں کا رس چُوستی ہے۔ رنگا رنگ کا شہد ملتا ہے۔ شہد میں ہمارے لیے شفا ہے (النحل : ۶۷-۶۹)۔ ہم اپنی غذا ہی کو دیکھیں۔ پانی برستا ہے، زمین شق ہو جاتی ہے۔ اس میں سے بیج پھوٹتا ہے۔ غلّہ پیدا ہوتا ہے اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجوروں اور میوہ اور گھاس، یہ سب ہماری متاع ہیں (عبس : ۲۴-۳۲)، سمندر سے تازہ ترین گوشت ملتا ہے، زینت کی چیزیں حاصل ہوتی ہیں، کشتیاں اسے چیرتی ہوئی نکل جاتی ہیں تاکہ ہمیں سامانِ رزق میسّر آئے اور پھر زمین ہے کہ اس میں رنگ رنگ کی چیزیں بکھری پڑی ہیں (النحل ۱۳-۱۴) یہ سب اس کی آیات ہیں، مگر کتنی آیات ہیں جن سے ہم اعراض کرتے اور بے خبر گزر جاتے ہیں (یوسف : ۱۰۵) بایں ہمہ اللہ تعالیٰ اپنی آیات ظاہر کرتا رہے گا، آفاق یعنی عالمِ طبیعی میں جو ہماری ذات سے باہر خارج میں واقع ہے۔ اس کے گوناگوں حوادث، موجودات اور تغیّرات ملتے ہیں، بعینہٖ انفس یعنی ہماری ذات اور شعور کے اندر، ہمارے احوال و واردات، افراد و اقوام کی زندگی اور تاریخ کے انقلابات میں (حٰم السجدہ : ۵۳)۔ دن گزرتے ہیں۔ دنیا بدل جاتی ہے۔ پھر زندگی ہے اور اس کے نشیب و فراز۔ ان تغیّرات کا دوسرا نام ہے تداولِ ایّام جس کا سلسلہ پھر اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ خیر کا ہاتھ کہ جسے چاہے اقتدار و اختیار دے جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلّت (آل عمران : ۲۶، ۲۷)۔ یوں بھی حیاتِ ارضی کیا ہے، زینت اور لہو و لعب، تفاخرِ ذات اور تکاثرِ مال (الحدید : ۲۰) شہوات، مال و زر اور زن و فرزند کی محبت (آل عمران : ۱۴)۔ کیا اس کی یہ مثال نہیں کہ آسمان سے پانی برسا۔ زمین کی پیداوار کہ انسان کی غذا

اور حیوانوں کا چارہ ہے، شاداب ہو کر پھلی پھولی، پودے باہم دگر مل گئے تا آنکہ ان پر رنگ روپ آیا۔ مالک نے ان کی خوش نمائی کو دیکھا تو سمجھا یہ سب کچھ اس کے ہاتھوں ہُوا، مگر پھر دن کا وقت تھا یا رات کا کہ یکایک اللہ کا حکم آگیا اور اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا (یُونس: ۲۴)۔ رزق کو دیکھیے تو کسی کے پاس زیادہ ہے کسی کے پاس کم (الرّوم: ۳۷)۔ زیادہ ہو تو لوگ فساد پر اُتر آتے ہیں (الشوریٰ: ۲۷)، پھر کتنی بستیاں تھیں جنہیں اپنی معیشت پر ناز تھا، لیکن تباہ ہو گئیں (القصص: ۵۸)۔ کتنے قرون یا اَدوارِ تہذیب و تمدّن تھے کہ ان کو عروج ہُوا، پھر زوال آیا اور پھر تباہی کی نذر ہو گئے (مریم: ۹۸ و الانعام: ۶)۔ کتنے دیار و امصار تھے کہ مٹ گئے اور آج وہاں کسی کی آہٹ سنائی دیتی ہے نہ کوئی بھنک کان میں پڑتی ہے (مریم: ۹۸)۔ کتنی قومیں ہیں جن کو اپنی قوّت پر ناز تھا، مگر آخرالامر برباد ہو گئیں (التوبہ: ۶۹)۔ کتنے ظالم تھے کہ انہیں ایک چیخ نے آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے (ہُود: ۶۷)۔ ہر قوم کا ایک وقت مقرر ہے۔ اس کا دورۂ حیات بالآخر ختم ہو جاتا ہے (الاعراف: ۳۴) اور اس لیے کتنے شہر اور ملک اور قومیں ہیں، جن کے آثار روئے زمین پر بکھرے پڑے ہیں، جنہیں کبھی بڑی قوت حاصل تھی، لیکن تباہی سے بچ نہ سکیں۔ کیسی عبرت ہے ان میں ہمارے لیے (المومن: ۸۲)۔ اللہ جس قریے کو ہلاک کر دے اسے پھر زندگی نہیں دیتا (الانبیاء: ۹۵)۔ کیسی کیسی سرسبز کھیتیاں، کیسے کیسے چشمے، کیسے کیسے گل و گلزار، نعمت کے گھر اور سامانِ آسائش ان کے پاس تھا جس کا انہیں غرور تھا، مگر پھر کیا ہُوا؟ دوسرے ان کے وارث بن گئے۔ ان پر آسمان رویا نہ زمین، نہ انہیں مہلت ملی کہ سنبھل جائے (الدّخان: ۲۵)۔ کیسے کیسے جبّار اور قہّار، اہلِ حشمت اور اہلِ ثروت تھے جنہیں اپنی طاقت اور مال و متاع کا بھروسا تھا، لیکن ان کی بربادی کو نہ دولت روک سکی، نہ طاقت (المؤمنون: ۶۵)۔ بایں ہمہ فساد فی الارض جاری ہے، "ذبحِ ابناء" ہے اور "استحیائے نساء" بھی (البقرہ: ۴۹)۔ حکمراں ہیں کہ جہاں داری و جہاں بانی کے دعوے کے باوجود حرث و نسل کو ہلاک کر رہے ہیں (البقرہ: ۲۰۵)۔ کوئی قریہ نہیں جس میں اکابر مجرمین مکر و فریب میں نہ لگے ہوں (الانعام: ۱۲۳)۔ بعینہٖ یقین و ایمان کا اُلجھاؤ ہے، گروہ بندیاں ہیں، ایک دوسرے پر جور و تعدّی ہے (الانعام: ۶۵)۔ پادشاہ اور کشور کشا ہیں اور ان کے ہاتھوں شہروں کی بربادی، شریفوں کی رُسوائی (النمل: ۳۴)۔ ان کے آثار و تعمیرات کو دیکھیے

جیسے دنیا انہیں کی تھی (الشعراء : ۱۲۹)۔ یہ کیا بات ہے کہ دولت و حشمت کو فروغ ہے، نہ طاقت اور سطوت کو (الفاطر: ۴۴) اس کے برعکس کمزور اور ناتواں بھی اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں بھی طاقت دیتا ہے (الاعراف: ۱۳۷)۔ یہ سب اس کی آیات ہیں اور ان کے اندر کوئی حقیقت کارفرما۔ یہ حقیقت ہمارے سامنے آئے گی بشرطیکہ ہم غور و فکر سے کام لیں اور ہمارا سلسلۂ تلاش و طلب جاری رہے۔ تلاش و طلب کے لیے اور بھی آیات ہیں (الحجر: ۵۷)۔ یہ آیات بھی ہم پر ظاہر ہوتی رہیں گی اور ہم ان کا اعتراف کریں گے (النمل: ۹۳)۔ اس کی آیات کہاں نہیں؟ کائنات کے گوشے گوشے میں اس کی آیات، اس کے گوناگوں مظاہر، حوادث اور تغیرات میں آیات، تمام تاریخ اس کی آیت، عالمِ انسانی، فرد اور جماعت کی زندگی، قوموں کا عروج و زوال اور تہذیب و تمدن کی تبدیلیاں اس کی آیات، غرض یہ کہ زمین کے ذرّے ذرّے سے لے کر فلک الافلاک کی رفعتوں تک اس کی آیات ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ سارا عالمِ امر و خلق اس کی ایک آیت ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا فعلِ خلق اور اس کی سُنّت کہ ایک چیز خلق ہو اور پھر اس طرح خلق ہوتی رہے، یہ اس کی قدرت کہ جو چاہے پیدا کرے اور جس کا چاہے اپنی مخلوق میں اضافہ کرے، یہ کائنات کی ایک نشأۃ کے بعد دوسری نشأۃ ــ بالفاظ دیگر یہ تخلیق و تکوین کا مسلسل عمل، جو کائنات کو ایک نئی آفرینش کے لیے تیار کر رہا ہے اور جس کا نتیجہ ہے حرکت، اقدام، آمادگی ــ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ خلق اور تسویہ، تقدیر اور ہدایت کائنات کا تار و پود ہیں۔ کائنات کی ہر شے مخلوق ہے، لیکن اپنی جگہ پر اُستوار (الاعلیٰ: ۲)۔ مضبوط (الصّٰفّٰت: ۸۸) و موزوں (الحجر: ۱۹)، جچی تلی (الطلاق: ۳) اور اس ہدایت کی بدولت جو اس کے اندر موجود ہے (طٰہٰ: ۵۰) اپنی غایتِ وجود کی طرف گام زن، لہٰذا کائنات میں کوئی نقص ہے، نہ عیب، نہ فطور، نہ تفاوُت (الملک: ۳)، بلکہ اللہ تعالیٰ کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو پختگی عطا کی (النمل: ۸۸)، جس کے فعلِ خلق میں کہیں بے قاعدگی نہیں ہے۔ خواہ ہم اس کا مشاہدہ اپنے اندر کی دنیا میں کریں خواہ عالمِ خارج میں، ایک بار نہیں بار بار اس پر نظر ڈالیں (الملک: ۴)، ہمیں بہرحال اقرار کرنا پڑے گا کہ کائنات میں نظم و ربط ہے، ترتیب و تنسیق، توافق و تطابق، باقاعدگی اور باضابطگی، مناسبت اور مشاکلت اور ان سب کی تہ میں ایک حکمت اور غایت، ایک مقصد اور منصوبہ، جو اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ شے سے لے کر

اعلیٰ منظہر میں کام کر رہا ہے۔ یہ نوعیت ہے عالمِ امر و خلق کی، جو آیاتِ الٰہیہ کے مطالعہ سے ہمارے سامنے آتی ہے، لہٰذا کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ تصوّرات ہمارے ذہن کی پیداوار ہیں یا ان کی حیثیت داخلی ہے، اس لیے کہ ہم اس دنیا پر جو ہماری ذات سے باہر واقع اور آزانہ سرگرم کار ہے کوئی ایسی چیز نہیں ٹھونس سکتے جو اصلاً اس میں موجود نہیں، مگر پھر اس سے بڑھ کر ہمارا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ جہاں ہمارے اور ہماری ذات سے باہر عالمِ خارج کے درمیان عمل درآمد شروع ہوا ہمیں اس باقاعدگی اور باضابطگی، اس متابعت اور مطابقت کا احساس ہونے لگا جو بالقوہ اس کے ہر فعل میں موجود ہے۔ دراصل عالمِ فطرت کی یہی خصوصیت ہے جس کی بنا پر علم کی عمارت قائم ہے اور ہم باعتماد اس کے عمل اور کردار کے سہارے اس سے اور زیادہ قریب ہوتے، اسے اور زیادہ سمجھتے اور اس کے ممکنات سے اور زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر کائنات کی کوئی مستقل سمت اور روش نہ ہوتی، اگر اس کا وجود نظم و ربط سے خالی ہوتا، اس کا کوئی ایک نہج ہوتا نہ انداز تو علم بھی ممکن نہ ہوتا اور زندگی کو بھی اپنا آپ قائم اور برقرار رکھنے کے لیے کوئی راستہ نہ ملتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمیں عالمِ امر و خلق کی اس مخصوص نوعیت کو جس سے ربط و نظم، باقاعدگی و باضابطگی، مطابقت اور متابعت کے تصورات پیدا ہوتے ہیں (اور جو اپنی جگہ سرچشمہ ہیں ہمارے تصوّراتِ علّت و معلول، قوانینِ طبیعی اور فطرت کی یکساں روی کا) اس جبریّت تک وسعت نہیں دینا چاہیے جسے یورپ کی مادیت پسندی نے آج سے ایک صدی پہلے انتہا کو پہنچا دیا تھا۔ اس پر طبیعیات کو تو اب وہ اصرار نہیں رہا جو کبھی تھا، لیکن مغرب کے ذہن پر وہ اب تک مسلّط ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ ہے اور اس لیے اپنی مشیت میں آزاد۔ بے شک وہ علیم و حکیم بھی ہے اور اس کے امر و خلق میں ہر کہیں اس کی حکمت کارفرما، بایں ہمہ اس جبریّت سے بالاتر جس کا تعلق ہمارے ذہن سے ہے اور جس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا فہم و ادراک اس غایت اور حکمت کا تمام و کمال احصا نہیں کر سکتا جو مشیتِ الٰہیہ میں کام کر رہی ہے۔ پھر چونکہ عملِ تخلیق جاری ہے، اللہ تعالیٰ جیسا چاہتا ہے اپنی مخلوق میں اضافہ کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں عالمِ امر و خلق ایک دوسری نشاۃ کا منتظر ہے۔ گویا عملِ تکوین جاری ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ جہاں فاطر السمٰوٰت والارض ہے کہ اس نے ہر شے کو ایک فطرت پر پیدا کیا، وہاں بدیع السمٰوٰت

والارض بھی اور اس لیے کائنات میں آزادی بھی ہے اور ابداع بھی۔ بایں ہمہ وہ اپنی نوعیت میں سراسر غائی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ مقصد اور غایت جو اس میں کام کر رہا ہے اس نے اسے ایک وحدت کی شکل دے دی ہے۔ جزو وکل وحدت میں ربط و نظم بھی ہے، اعتدال اور توازن بھی، جمال و جلال، منفعت اور مصلحت بھی۔ کائنات کس قدر حسین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان کو رفعت بخشی اور میزان وضع کیا (الرحمٰن: ۷)۔ اسے کس خوبی سے سجایا (قٓ: ۶)۔ سورج کو ضیا اور چاند کو نور عطا کیا (یونس: ۵)۔ آسمانوں میں چراغ روشن کر دیے (الملک: ۵) اسے ستاروں سے زینت دی (الصّٰفّٰت: ۶)۔ ان کی درخشانی رات کی تاریکیوں میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اس میں تاروں کے جھرمٹ ہیں۔ اس حسن منظر کو دیکھیے (الحجر: ۱۶)۔ عالم نباتات پر نظر ڈالیے۔ ہر شے کس حُسن و خوبی اور موزونی سے پیدا ہوتی (الحجر: ۱۹) کیسی کیسی رنگا رنگ کی پیداوار زمین پر بکھری پڑی ہے (انعام: ۱۴۱)۔ کیسے کیسے خوبصورت پودے اس میں اُگے ہیں (قٓ: ۴)۔ کیسے کیسے پہاڑ ہیں اور ان کی کیسی کیسی رنگتیں۔ سفید، سرخ، بالکل سیاہ (الفاطر: ۲۷) اس میں باغات ہیں، انہار و اشجار (النحل: ۱۱، ۱۵) پھل اور پھول (الرحمٰن: ۱۲)۔ سمندروں میں موتی اور مرجان (الرحمٰن: ۲۲)، ان میں کشتیاں ہیں پہاڑوں کی مانند (الرحمٰن: ۲۳)۔ اللہ تعالیٰ نے نُور اور ظلمت پیدا کی (الانعام: ۱) خنکی کے لیے سایہ اور اس کے مقابلے میں گرمی (الفاطر: ۲۱)۔ دن کے مقابلے میں رات (الانبیاء: ۳۳)۔ وہ کس طرح گھٹائیں اٹھاتا ہے (الرعد: ۱۲)۔ گھٹائیں دوشِ ہوا پر سوار چلی آتی ہیں (الاعراف: ۵۷) مینہ برستا ہے مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے، ہر طرف خوشنما پودے سر نکالتے ہیں (الحج: ۵)۔ بادل امنڈتے چلے آتے، باہم گڈمڈ ہوتے اور آسمان پر چھا جاتے ہیں، بوند بوند ہو کر برستے ہیں، ژالہ باری ہوتی ہے، بجلی کی چمک سے آنکھیں چندھیا جاتی ہے (النّور: ۴۳)۔ کیسی دل کش ہے کائنات اور کیسا حسین منظر ہے عالم جمادات، نباتات و حیوانات کا۔ دریا، پہاڑ، سمندر، نہریں اور وادیاں، پھل پھول، ہرے بھرے کھیت، چرند و پرند، ہمارا لباس، ہمارے مساکن، ہماری گزرگاہیں، ہمارے پالتو جانور ان کا صبح چراگاہوں میں جانا، شام کو واپس آنا، اس میں بھی ایک حسن ہے (النحل: ۶)۔ ان میں ہمارے لیے کیسی کیسی منفعتیں ہیں، سفر میں، حضر میں، ان کے بالوں میں، روؤں میں، ریشوں میں (النحل: ۸۰)۔ یہ ہے ہماری کائنات، ہر لحظہ متغیر، ہر لحظہ دگرگوں، بامقصد اور باقاعدہ، مربوط و موزوں، حسین و جمیل، جس میں نہ تکرار ہے نہ ضیاع جس میں نہ حرکت محض فریب ہے نہ اشیا محض خیال۔ بے شک یہ

ایک عظیم الشان منصوبہ ہے، جس کی انتہائے غایت اور حکمت ہمارے فہم و ادراک سے باہر ہے۔

بارش اور روئیدگی، زندگی اور موت سب ایک سلسلے کی کڑیاں ہیں، سب مشیتِ الٰہیہ کے رشتے میں منسلک، سب اس کی سُنّت کے پابند، سُنّتِ الٰہیہ غیر متبدل ہے، سُنّتِ الٰہیہ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ (الفاطر: ۴۳)۔ اس میں سرِ مُو انحراف نہیں ہوتا (بنی اسرائیل: ۷۷)، ہر شے اپنی فطرت پر قائم، اپنا وظیفہ ادا کر رہی اور اپنی غایت کو پہنچ رہی ہے۔ لہٰذا ساری کائنات رواں دواں، ساری کثرت ایک وحدت میں گُم اور انجام کار یہ سارا عمل مشیتِ الٰہیہ کے ایک نقطے پر مرتکز، اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا مظہر، اس کے حرف کُن کی تفسیر: وہ جب کسی امر کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے اتنا ہی کہتا ہے کہ ہو جا، سو وہ ہو جاتا ہے (مریم: ۳۵)۔ اور ہمارا امر کیا ہے، بس جیسے آنکھ کا جھپکنا (القمر: ۵۰)۔

(عالمِ انسانی میں قدم رکھیے تو یہاں بھی مشیتِ الٰہیہ ویسے ہی کارفرما نظر آتی ہے۔ یہاں بھی وہی باضابطگی اور باقاعدگی، وہی نظم و ربط اور وہی اصول و قانون ہے جس کا سارا عمل اس نقطۂ شعور پر مرکوز ہے جسے ہم "انا" سے تعبیر کرتے ہیں اور جس سے ذاتِ انسانی کی وحدت قائم رہتی ہے۔ بیشک انسان کچھ بھی نہیں تھا (الدھر: ۱)۔ وہ مخلوق ہے (العلق: ۲)، ضعیف پیدا ہُوا (النساء: ۲۷)۔ عجول ہے (الانبیاء: ۳۷)، ظلوم و جھول (الاحزاب: ۷۲)، مایوس، ناشُکرا (ہُود: ۹)، جی کا کچا (المعارج: ۱۹)، ذرا سی تکلیف پر گھبرا اٹھنے والا (المعارج: ۲۰)، نازِ نعمت میں اپنے پر نازاں (بنی اسرائیل: ۸۳)۔ اس کی زندگی مشقّت اور برداشت کی زندگی ہے (البلد: ۴)، اس کے لیے قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں، قدم قدم پر مشکلات، قدم قدم پر تذبذب، بات بات میں گومگو، امید کے ساتھ یاس اور بیم کے ساتھ رجا۔ بظاہر اس کا جادۂ حیات تاریک ہے اور وہ خود حقیر اور بے بس، جیسے زمانے کی رَو اسے وجود میں لے آئے اور زمانہ ہی اسے فنا کر دے گا (الجاثیہ: ۲۴)۔ وہ جب اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتا، موجوداتِ عالم اور کائنات کی وسعتوں کا اندازہ کرتا اور زمان و مکان کی پہنائیوں کو دیکھتا ہے تو اسے خیال ہوتا ہے جیسے ہر شے اس کی حریف ہے، اس کے راستے میں حائل، اس کی کوششوں میں مزاحم۔ بایں ہمہ وہ ایک شاعر بالذات، بامقصد اور ذمّے دار ہستی ہے، لہٰذا اس کی تخلیق کا ایک مقصد ہے اور ایک حکمت۔ اللہ تعالیٰ نے اسے براہِ راست خطاب کیا: کیا مَیں تمہارا رب نہیں ہوں (الاعراف: ۱۷۲)، کیا تم اس کا

اقرار نہیں کر چکے ؟ (الاعراف : ۱۷۲)، پھر وہ کیا چیز ہے جو تمہیں اپنے رب سے بہکا دیتی ہے (الانفطار : ۶)، اسے احسن تقویم پر پیدا کیا گیا (التین : ۴)، بہترین صورت گئی (المومن : ۶۴)، ضعف کے بعد قوت ملی (الروم : ۵۴)، ایک ایسے سازگار ماحول میں پیدا ہُوا جس میں وہ سب کچھ ہے جس کی اسے طلب ہے اور جس کی بظاہر بیگانگی، مخالفت اور مزاحمت سے اس کے قواتے ذہنی کو تحریک ہوتی ہے جس سے اس کا قدم علم وعمل کی دنیا میں آگے بڑھتا ہے۔ اسے عالم طبیعی پر دسترس حاصل ہوتی ہے، بلکہ اگر چاہے تو وہ اس کی وسعتیں بھی پار کر سکتا ہے (الرحمٰن : ۳۳)۔ چاند اور سورج اس کے لیے مُسخّر ہیں (ابراہیم : ۳۳)، ہوائیں اور بادل اس کے لیے سرگرم کار، کرۂ ارضی میں ہر کہیں اس کے لیے نعمتیں بکھری پڑی ہیں (لقمٰن : ۲۰)۔ وہ اس کا دار القرار ہے (المومن : ۶۱)، اس میں متمکّن ہے (الاعراف : ۹)۔ اور اس کی تکریم کا یہ عالم کہ خشکی اور تری پر چھا گیا (بنی اسرائیل : ۷۰)۔ اسے معایش (الاعراف : ۱۰) اور مسالک بہم پہنچائے گئے (طٰہٰ : ۵۲)۔ رات کی تاریکیوں میں ستارے اس کی رہنمائی کرتے ہیں (النحل : ۱۶)۔ شمس وقمر منزل در منزل گزرتے ہیں، تاکہ ماہ وسال کا حساب وشمار ہو سکے (یونس : ۵)۔ آسمان سے پانی اُتارا گیا، ثمرات سے رزق پیدا ہُوا (البقرہ : ۲۲)۔ اقوات مقرر کر دی گئیں (حٰم السجدہ : ۱۰)۔ جگہ جگہ باغ اور کھیتیاں بھی ہیں (النحل : ۱۱)، لہٰذا یہ عالم آب وخاک اس کا میدان عمل ہے، اس کی جولاں گاہ، جس میں اس کی قوتیں بروئے کار آتی ہیں، جو اس کی آرزوں اور تمنّاؤں کا کفیل ہے اور جس میں وہ ارتقائے ذات کے مراحل طے کرتا ہے۔ وہ استخلاف (النمل : ۶۲) اور وراثتِ ارض کا اہل ہے (الانبیاء : ۱۰۵)۔ اس کے لیے درجات ہیں (حٰم السجدہ : ۸)، مسلسل اجر (التین : ۶)۔ ایک مرتبے کے بعد دوسرا (الانشقاق : ۱۹)۔ بیشک اسے ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی ہوتی مٹی سے پیدا کیا گیا (الرحمٰن : ۱۴) لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی روح پھونکی (الحجر : ۲۹)، خلافتِ ارضی عطا کی گئی (البقرۃ : ۳۰)۔ ملائکہ اس کے سامنے سر بسجود ہُوتے (البقرہ : ۳۴)۔ بیشک وہ شیطان کے کہنے میں آگیا (البقرۃ : ۳۶)۔ ابلیس نے سجدہ نہیں کیا (البقرہ : ۳۴)۔ آدم سے لغزش ہوتی لیکن نافرمانی نہیں (طٰہٰ : ۱۱۵)، لہٰذا اللہ نے اسے برگزیدہ کیا (طٰہٰ : ۱۲۲) اور اپنی مخلوق میں ایک خاص درجے کا مستحق ٹھیرایا۔ اسے ارادہ واختیار کی قدرت دی گئی، سمع وبصر، قلب وفواد کیے علم کی قوت بخشی، جملہ اسمار سکھائے (البقرہ : ۳۱) قوتِ بیان دی گئی (الرحمٰن : ۴)، ارادہ واختیار کی قدرت عطا ہوتی۔ اس کی ذات میں

فجور اور تقویٰ دونوں جمع ہیں (الاعلیٰ: ٨)۔ اسے بصیرتِ نفس حاصل ہے اور اس لیے وہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کے لیے کوئی عذر پیش نہیں کر سکتا (القیٰمۃ: ١٤، ١٥)، لہٰذا اس کی فلاح و کامرانی کا دار و مدار اس کے تزکیۂ ذات پر ہے (الاعلیٰ: ١٤)۔ وہ جو کچھ کرے گا وہی پائے گا۔ ہر کوئی اپنے کیے کا پابند ہے (الطُّور: ٢١)۔ وہ اپنا بوجھ خود ہی اٹھائے گا (الزّمر: ٧)۔ اس پر اپنی ہی ذمّے داری ہے۔ اس سے نہیں پوچھا جائے گا کہ دوسروں نے کیا کیا (البقرہ: ١٤١)۔ نفس متناہیہ کی یہی ذمّے داری ہے جو اس نے تن تنہا قبول کی، جو اس کی غایت وجود اور آزاد شخصیّت کا راز ہے، جسے قرآن مجید نے امانت سے تعبیر کیا، امانت جسے زمین اور آسمانوں اور پہاڑوں نے اُٹھانے سے انکار کر دیا، لیکن جسے انسان نے اٹھایا (الاحزاب: ٧٢)۔ یہی وجہ ہے کہ اسے تن تنہا اس کے نتائج برداشت کرنا پڑیں گے۔ وہ تن تنہا اپنے رب کا سامنے کرے گا، (مریم: ٨٠)، تن تنہا، جیسے اوّل اوّل پیدا کیا گیا (الانعام: ٩٤)، تن تنہا اس کا محاسبہ ہو گا (البقرہ: ٢٨٤)
مگر پھر نفس متناہیہ کی یہ تنہائی اور اس کا یہ احساس کہ انسانوں کی عظیم الشان کثرت اور بزمِ قدرت کی گہما گہمی رونق اور ہنگاموں کے باوجود وہ اکیلا ہے اسے مجبور کرتا ہے کہ مثبت یا منفی کوئی راستہ اختیار کرے۔ راستے صرف دو ہیں۔ دونوں اس کے سامنے اور فیصلہ اس کے اپنے ہاتھ میں: کیا ہم نے اسے دو آنکھیں، زبان اور دو ہونٹ نہیں دیتے اور اس سے دو راستے نہیں دکھا دیتے ..... (البلد: ٨:)۔ ان دونوں راستوں کو گھاٹیوں سے تعبیر کیا گیا۔ ایک استحکامِ ذات کا راستہ ہے، خیر و سعادت، کامیابی اور کامگاری کا۔ اور دوسرا ناکامی اور نامرادی کا۔"

باب ۱۸

قرآنِ مجید کا طرزِ استدلال

قرآن مجید میں وجود باری تعالیٰ اور توحید پہ الگ الگ دلائل ملتے ہیں :-

وجودِ باری تعالیٰ پر دلائل

انسان اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے ہی ایک دل پھینک پجاری واقع ہوا ہے۔ اپنی ابتدائی تاریخ سے وہ معبودِ حقیقی کی تلاش میں مگن نظر آتا ہے۔ معبودِ حقیقی سے آشنا ہو گیا تو فبہا ورنہ کوئی نہ کوئی معبود تراش لیتا ہے۔ کبھی دریا کو خدا بنا لیا، کبھی سورج کو، کہیں پتھر کو اور کہیں سانپ کو۔ اور کچھ نہیں تو جاہ، مال یا اپنے نفس کا پجاری بن جاتا ہے۔ قدیم سے قدیم تاریخ دیکھیں تو انسان کسی نہ کسی معبود کے سامنے سجدہ ریز نظر آتا ہے۔ ہزار ہا سال قدیم کھنڈرات میں جاؤ تو سب سے پہلے جو چیز ان کھنڈروں میں نظر آتی ہے وہ کسی نہ کسی معبد کی چار دیواری ہوتی ہے۔ قرآن کا طرزِ استدلال یہ ہے کہ وہ انسان کو اس کی فطرت کے اصل تقاضے کی طرف بلاتا ہے۔ اور ایمان باللہ کو اور اسلام کو عین فطرت قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہے :-

" فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۔ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (الروم : ۳۰)

ترجمہ : " اپنا رُخ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کرو۔ یہ خدا کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا۔ خدا کی بنائی ہوئی فطرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ سیدھا اور ٹھیک دین ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں "

خدا پہ ایمان فطری امر ہے

وجود باری تعالیٰ پہ ایمان کو عین فطرت قرار دیتے ہوئے قرآن انسانوں سے یُوں مخاطب ہوتا ہے :-

"اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ - (ابراہیم : ۱۰)

ترجمہ: "کیا آسمان اور زمین پیدا کرنے والے خدا پر ہی شک ہے"؟

اور فرمایا:

"اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ - اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ - (الطُّور : ۳۵ - ۳۶)

ترجمہ: "کیا وہ آپ ہی آپ پیدا ہو گئے ہیں یا وہ ہی اپنے آپ کے خالق ہیں؟ کیا اُن ہی نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے؟ نہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ان کو یقین حاصل نہیں ہے"۔

یہاں پر قرآن مجید ایک عقلی دلیل پیش کرتا ہے وہ یہ کہ عدم سے وجود میں کوئی چیز از خود نہیں آ سکتی یعنی کوئی چیز کسی کے بن بنائے آپ سے آپ نہیں بن سکتی اور نہ ہی کوئی مفعول اپنا فاعل آپ ہو سکتا ہے۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ قرآن مجید خشک منطق اور گھسے پٹے قدیم فلسفیانہ طرزِ استدلال کا سہارا نہیں لیتا ہے۔ بلکہ قرآن مجید انسان کی فطرتِ سلیمہ کو مخاطب کرتا ہے اور انتہائی حسین ادبی انداز میں اللہ تعالیٰ کے وجود سے متعلق آیاتِ بیّنات اور کھلی کھلی نشانیاں پیش کرتا ہے۔ ایسی نشانیاں جن پر غور کرنے سے فطرتِ سلیمہ صرف ایک ہی نتیجے پر پہنچ سکتی ہے اور وہ ہے وجود باری تعالیٰ کا اثبات۔ ایسی نشانیاں جو خود انسان کے اندر اور اس کے ارد گرد پائی جاتی ہیں انہیں وہ آیاتِ انفس و آفاق قرار دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيَاتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ - اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ - اَلَا اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاءِ رَبِّهِمْ - اَلَا اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ (حٰمٓ سجدہ : ۵۳-۵۴)

ترجمہ: "ہم عنقریب ان کو (اطراف) عالم میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ حق ہے کیا یہ تم کو کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے

باخبر ہے۔ دیکھو یہ اپنے پروردگار کے رُوبرو حاضر ہونے سے شک میں ہیں۔ سُن رکھو کہ وہ ہر چیز پر احاطہ کیے ہوتے ہے۔"

اور فرمایا:

" وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۔ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ " (الذاریات: ۲۰-۲۱)

ترجمہ: "اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہاری جانوں کے اندر بھی! کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟"

سینکڑوں آیات کے اندر وجودِ باری تعالیٰ کے متعلق دل ہلا دینے والا کلام ہے۔ اور اگر انسان آنکھیں کھول کر پڑھے تو اس کا رُواں رُواں وجودِ باری تعالیٰ کی گواہی دے۔ ایسے دلائل و براہین ایسی نشانیاں اور ایسی آیات و بیّنات کہ فطرتِ سلیمہ رکھنے والا کوئی شخص چشمِ پُرنم کیے بغیر اُن سے نہیں گزر سکتا۔ ہر مرحلے اور ہر موقع پر دل سے یہی صدا نکلتی ہے:

" فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ " (المومنون: ۱۴)

ترجمہ: "سو کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام صنّاعوں سے بڑھ کر ہے۔"

تین قسم کے دلائل

ان آیات میں زیادہ تر تین قسم کے دلائل ہیں:

۱۔ کائنات کے عجائبات اور نیرنگیاں، اور ان سب کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

۲۔ کائنات کے تمام امور میں اسباب و علل کا تسلسل، تغیّر و انقلاب کا نظام اور سب کا ایک مرتّب سلسلہ۔

۳۔ سلسلۂ عالمِ اسباب کے ہر واقعہ اور ہر مرحلہ میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور فائدوں کا موجود رہنا۔

ان مقدمات کو ذہن میں رکھ کر اگر ذیل کی آیات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو دل از خود گواہی دیتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کا منظّم سلسلۂ اسباب و علل از خود وجود میں نہیں آ گئے بلکہ کسی حکیم و دانا اور قادرِ مطلق صانع اور خالق نے اپنے ارادہ اور قدرت سے ان کو بنایا ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔ (البقرۃ: ١٦٤)

"جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، بے شمار نشانیاں ہیں۔"

وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَجَنّٰتٍ مِنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ انْظُرُوا إِلَى ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَيَنْعِهِ إِنَّ فِي ذٰلِكُمْ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ (الانعام: ٩٩)

"اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعہ سے ہر قسم کی نباتات اگائی، پھر اس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کیے، پھر ان سے تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کیے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں اور انگور، زیتون اور انار کے باغ لگائے جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور پھر ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی ہیں۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر ان کے پکنے

کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو، ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔"

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ - وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَابْتِغَآؤُکُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِہٖ

(روم: ۲۰-۲۵)

"اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر یکایک تم بشر ہو کہ (زمین میں) پھیلتے چلے جا رہے ہو۔ اور اس کی نشانیوں میں یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمند لوگوں کے لیے۔ اور اُس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن کو سونا اور تمہارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سُنتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے،

خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی اور آسمان سے
پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ زمین کو اس
کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے یقیناً اس میں
بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل
سے کام لیتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے
یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں"

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَ
اَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ
وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّاَنْزَلْنَا
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ
كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ۔ (لقمان: ۱۰)

"اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے
جو تم کو نظر آئیں اس نے زمین میں پہاڑ جما دیئے
تاکہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے
ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیئے اور آسمان
سے پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں
اُگا دیں"

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَ
بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلَ
نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ
ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ
جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ
قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۔
(السجدہ: ۷-۹)

"جو چیز بھی اس نے بنائی خوب ہی بنائی اُس
نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی پھر
اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر
پانی کی طرح کا ہے پھر اس نک سک سے درست
کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم
کو کان دیئے، آنکھیں دیں اور دل دیئے اور
تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو"

وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً
نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ

"اور تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق
موجود ہے اُن کے پیٹ سے گوبر اور خون کے

فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ — درمیان ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں یعنی خالص

(النحل : ۶۶) — دُودھ جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے"۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا — "وہ بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں بُرج بنائے

وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا — اور اس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا ہُوا

(فرقان : ۶۱) — چاند روشن کیا"۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ — "یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہوگا جس نے ہر

(النمل : ۸۸) — چیز کو حکمت کے ساتھ اُستوار کیا۔

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ — "تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ

فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ — پاؤ گے، پھر پلٹ کر دیکھو کہیں تمہیں کوئی خلل

ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ — نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ تمہاری نگاہ

الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ۔ (الملک ۳،۴) — تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔

اسی پہ ہے سب کی انتہا

وجودِ باری تعالیٰ پر ایک خاص دلیل جسے اہلِ فلسفہ اور متکلّمین پیش کرتے چلے آتے ہیں، قرآن مجید میں ایک مختلف انداز سے بیان ہوتی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ ہر چیز کے لیے کوئی نہ کوئی سبب موجود ہے ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں ہر چیز کے لیے اسباب وعلل کا سلسلہ آگے کو بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ یا تو کہیں جا کر ختم ہوگا یا بغیر کسی انتہا کے مسلسل چلتا جائے گا۔ اگر علل و اسباب کے اس سلسلے کی انتہا نہیں ہے اور یہ یُونہی چلا جائے گا تو لازم آتا ہے کہ اسباب کے اس سلسلے کا کوئی بھی آخری سرا نہ ہو۔ مطلب یہ کہ کہیں بھی نقطۂ آغاز نظر نہیں آسکتا اس لیے کہ جب آخری سرا ہی کسی چیز کا معلوم نہیں تو نقطۂ آغاز کہاں سے آئے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی چیز بھی پیدا نہیں ہوسکتی۔

تسلسل عقلاً بھی محال ہے بلکہ انسان اس کے تخیّل سے بھی عاجز ہے۔ اس بنا پر لامحالہ سلسلۂ عِلل و اسباب کا کہیں نہ کہیں خاتمہ ہونا ضروری ہے۔ یہی ہر چیز کا نقطۂ آغاز ہوگا۔ یعنی وہ علت العلل یا علتِ کُل

مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ، اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ، سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۔ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ (المؤمنون: ۹۱)

کوئی دوسرا خدا اس کے ساتھ نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی خلق کو لیکر الگ ہو جاتا اور وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔ پاک ہے اللہ ان باتوں سے جو یہ لوگ بناتے ہیں۔ کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے، وہ بالاتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ تجویز کر رہے ہیں۔"

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (الحدید: ۳)

"وہی اوّل بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی۔"

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، اَللّٰهُ الصَّمَدُ۔ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔ (الاخلاص)

"کہو وہ اللہ ہے یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔"

توحید پر دلائلِ قرآنیہ:

شرک کے اِبطال اور توحید کے اثبات پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا گیا ہے وہ نظامِ کائنات کی یکسانی و وحدت اور دنیا میں علّت واسباب کا باہمی توافق، تعاون، اشتراک اور اتحاد ہے۔ دنیا میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز اُس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک کہ زمین سے لے کر آسمان تک تمام کی تمام قوتیں اور اسباب باہمی اشتراکِ عمل اور تعاون اور توافق سے اس کام پر نہ لگ جائیں۔ یہ باتیں گذشتہ صفحات میں ہم کافی تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔اب آیئے دیکھیں قرآن پاک نے اس حقیقت کو کس طرح بیان کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَوْ كَانَ فِيهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۔ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ"۔

(انبیاء: ۲۲)

"اگر زمین وآسمان میں اس خدائے واحد کے سوا چند اور خدا بھی ہوتے تو زمین وآسمان برباد ہو جاتے تو پاک ہے عرش والا خدا ان باتوں سے جو یہ مشرک کہتے ہیں"۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۔ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۔ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ۔ (بنی اسرائیل: ۴۲-۴۴)

"کہہ دیجیے اگر خدائے واحد کے ساتھ کچھ اور خدا ہوتے جیسا کہ مُشرک کہتے ہیں تو ایسی حالت میں وہ ضرور خدائے مالکِ عرش کی طرف (لڑنے بھڑنے کے لیے) راستہ نکالتے تو پاک اور بلند ہے وہ خدا اس بات سے جو یہ کہتے ہیں، خدائے واحد کی پاکی اور بلندی ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے اندر ہے، سب بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی تعریف کے ساتھ

جس پر تمام علّتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہی خلق و پیدائش اور کائنات کے وجود کی اصل علّت ٹھہرے گی۔

قرآن مجید میں یہی منطقی دلیل ایک دو آیتوں میں اس انداز میں مذکور ہے:۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ - وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ - فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ہود: ۱۲۳)

"اور خدا ہی کے پاس ہے آسمانوں اور زمینوں کی چھپی بات اور اس کی طرف ہر بات لوٹائی جاتی ہے۔ اسی کی عبادت کر اور اسی پر بھروسہ کر"

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (النجم: ۴۲)

"اور یہی کہ تیرے رب کی طرف ہے سب کی انتہا"

صحیح مسلم کتاب الایمان میں متعدد روایتوں سے مندرجۂ ذیل حدیث مذکور ہے کہ آپؐ نے فرمایا:
(لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ انسانوں کو خدا نے پیدا کیا ہے اور خدا کو کس نے پیدا کیا، آسمانوں کو خدا نے بنایا، زمینوں کو اس نے بنایا، دنیا کی ہر چیز کو خدا نے پیدا کیا تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا۔ فرمایا کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ جب کسی کو پیش آئے تو کہہ دے کہ آمَنْتُ بِاللهِ "میں اللہ پر ایمان لایا")

غور کرنے پر صاف پتہ چلتا ہے کہ حضور اکرمؐ نے غور کرنے سے منع نہیں فرمایا بلکہ یہ فرما رہے ہیں کہ آخر تمام علّتوں کی کوئی نہ کوئی انتہا ضرور ہوگی۔ اور ایک علّت کے بعد دوسری اور اس کے بعد تیسری اور پھر چوتھی، یوں بڑھتے بڑھتے کہیں نہ کہیں کسی نقطے پر پہنچنا پڑے گا جہاں پر ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ یہی سب سے پہلی علّت ہے اور یہی ہر چیز کا سببِ اوّل ہے اور یہی کہنا پڑے گا آمنتُ باللہ، میں اللہ پر ایمان لایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی وہ علّتِ اولیٰ ہے جس کے بعد کوئی علّت نہیں۔ یہی تمام اسباب کا سبب اور تمام علّتوں کی علّتِ اصلیہ ہے۔

باقی رہ گیا ایک خدا ! (بُرہان تمانع)

مذکورہ بالا آیت کی تشریح ایک مفروضے کے ذریعے کی جا سکتی ہے :

فرض کر لیجیے کہ اس دنیا میں ایک سے زیادہ یا دو خدا ہیں۔ اب ان دو خداؤں کا باہم دگر اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ فرض کیجیے ان میں سے ایک خدا دوسرے پر اپنے علم و قدرت میں غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اب دو ہی صورتیں ممکن ہیں :-

اوّل یہ کہ یہ خدا دوسرے خدا پر غلبہ حاصل نہ کر سکے۔ اس صورت میں یہ تو عاجز و مقہور ہو گیا، خدا ہی نہ رہا۔ باقی رہ گیا ایک خدا، جس پر غلبہ نہ پایا جا سکا۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ خدا نمبر ۱، خدا نمبر ۲ پر علم و قدرت میں غلبہ پالے۔ ایسی صورت میں اس کی خدائی تو تسلیم لیکن خدا نمبر ۲ عاجز و مقہور ہو گیا۔ وہ خدا نہ رہا۔ تو باقی رہ گیا ایک خدا !

اس دلیل کو فلسفہ کی زبان میں "برہانِ تمانع" کہتے ہیں۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ فرض کیجیے دو خدا ہیں۔ ان میں سے ایک خدا زید کو کسی مقام پر متمکن کرنا چاہتا ہے، دوسرا خدا اس کے برعکس زید کو معطّل کرنا چاہتا ہے۔ اب دونوں باتیں بیک وقت تو ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ دو خداؤں میں سے ایک خدا کا ارادہ ہی پُورا ہو سکے گا۔ اب جس خدا کا ارادہ پورا نہ ہو سکا، وہ مقہور، عاجز اور مغلوب ہو کر رہ گیا، وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ تو باقی رہ گیا ایک خدا !

تو اس اعتبار سے دیکھا جائے تو منطقی طور پر ایک خدا سے زیادہ کا وجود عقلاً ممکن ہی نہیں ہے۔
قرآن مجید میں یہی دلیل پیش کی گئی ہے :-

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔ (الانبیاء : ۲۲)	"اگر زمین و آسمان میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو زمین اور آسمان دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔"
مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ	"اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا ہے اور

تسبیح نہ کرتی ہو۔"

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (المومنون : ۹۱)

"خدا نے نہ تو اپنا کسی کو بیٹا بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی معبود ہے۔ ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی اپنی مخلوقات کو لے کر چل دیتا اور ایک دوسرے پر غالب آجاتا۔ یہ لوگ جو کچھ خدا کے بارے میں بیان کرتے ہیں خدا اس سے پاک ہے۔"

گویا بالفاظ دیگر توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کی اصل دلیل کائنات میں وحدت و یکسانیت کا وجود ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے تمام اُمور ایک مقررہ نظام اور بندھے اصول کے ماتحت چل رہے ہیں۔ اور یہ سب کچھ کسی ایک ہستی کے اشارے پر ہو رہا ہے۔

مندرجۂ بالا آیاتِ قرآنیہ میں توحید پر جو دلیل دی گئی ہے اسے متکلّمین کی اصطلاح میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ عالمِ کون و مکاں معلول ہے اور اس کی علّتِ اولیٰ کا وجود ایک منطقی تقاضا ہے۔ علّتِ اُولیٰ یا علّتِ تامہ اس کو کہتے ہیں جس میں معلول کے وجود کے بعد کسی اور چیز کا انتظار نہ رہے۔

اب ظاہر ہے کہ معلول کی دو علّتِ تامہ نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے کہ کائنات کی اگر علّتِ تامہ ایک نہ ہو بلکہ دو ہوں تو دو صورتوں میں سے ایک صورت لازماً ہو گی۔ ایک تو یہ کہ علّتِ تامّہ کے وجود کے بعد کائناتی وجود میں دوسری علّتِ تامّہ کا انتظار رہے گا۔ دوسری صورت یہ ہو گی کہ انتظار نہیں رہے گا اگر پہلی صورت درست ہے تو پہلی شے علّتِ تامہ یا علّتِ اُولیٰ نہیں رہے گی اور اگر دوسری صورت درست ہے یعنی دوسری علّتِ تامہ کا انتظار نہیں رہے گا تو اس سے ثابت ہو گا کہ دوسری شے علّتِ تامہ نہ ہو گی۔ اور نہ وہ علّتِ اولیٰ کہلا سکے گی بلکہ وہ سرے سے علّت ہی نہیں ہو گی۔ اس لیے کہ اس کی ضرورت نہیں ہے اور اس کا انتظار نہیں ہے۔

تو ثابت ہُوا کہ کائنات کی علّتِ تامہ ایک ہی ہو سکتی ہے۔ ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتیں اور وہی علّتِ تامّہ وجودِ باری تعالیٰ ہے۔

باب ۱۹

قرآن کا تصوّرِ خدا

اسلام سے پہلے اہلِ عرب کے ہاں خدا کا تصوّر تو تھا لیکن بہت ہی ادھورا۔ وہ ایک خالقِ کائنات اور رب کے وجود کو تو تسلیم کرتے تھے لیکن اسے تنہا اس کائنات کا مالک نہیں سمجھتے تھے۔

بالفاظِ دیگر ان کے یہاں توحید ربوبیت تو پائی جاتی تھی مگر توحید اُلوہیت نہیں تھی۔

یہودیوں کا خدا ان کا خاندانی خدا تھا جس نے ساری کائنات کو صرف بنی اسرائیل کے لیے پیدا کیا۔ اور کائنات پیدا کرنے کے ساتویں دن وہ تھک کر بیٹھ گیا۔ یہ خدا صاحبِ اولاد تھا اور اس کی بیٹیاں تھیں۔

عیسائیوں کا خدا اپنی ساری خدائی اور اختیارات ابنِ مریم کو دے کر خود معطّل ہو گیا تھا۔

ہندوؤں کے خدا نے اپنے وجود کو لاکھوں اوتاروں کی شکل میں تقسیم کر ڈالا۔ اور برہما، مہیش اور بھشن تینوں نے مل کر خدائی کے کاروبار باہم تقسیم کر لیے۔

ادھر ایرانیوں کے خدا کی خدائی نیکی اور بدی کی دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک طرف یزداں اور دوسری طرف اہرمن!

دیکھیے اسلام نے اللہ تعالیٰ کا کیا تصوّر پیش کیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا تعارف خود اللہ تعالیٰ کی زبانی ہو۔ فرماتے ہیں:

اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ لَا	وہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں۔ وہی جیتا ہے
تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ لَہٗ مَا فِی	اور سب اس کے سہارے جیتے ہیں اس کو
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا	نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ آسمانوں اور زمین میں
الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ	جو کچھ ہے سب اسی کا ہے۔ کون ایسا ہے

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَؤُدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ۔

(البقرہ: ۲۵۵)

جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔ جو لوگوں کے روبرو ہے اور جو ان کے پیچھے ہے سب کو جانتا ہے۔ اور وہ اس کے علم کے حصّہ کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے اس کا تخت آسمانوں کو اور زمین کو سمائے ہے۔ ان آسمانوں کو اور زمین کی نگرانی اس کو تھکاتی نہیں۔ اور وہی اوپرا اور بڑا ہے۔"

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ، سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔"

(الحشر: ۲۲-۲۴)

"وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غائب اور حاضر ہر چیز کا جاننے والا ہے وہی رحمان اور رحیم ہے۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بادشاہ ہے نہایت مقدّس، سراسر سلامتی، امن دینے والا، نگہبان، سب پر غالب، اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا، اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا۔ پاک ہے اللہ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں، وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے لیے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے"۔

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ذُو الْعَرْشِ

"وہی گناہوں کا بخشنے والا ہے۔ بندوں سے

الْمَجِيدُ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ۔" (بروج: ۱۴-۱۶)

محبت کرنے والا ہے تخت کا مالک ہے۔ بڑی شان والا ہے جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔"

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ۔ (بنی اسرائیل: ۴۴)

"اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔"

وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۔" (آلِ عمران: ۸۳)

"اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کے زیرِ فرمان ہے۔"

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ (التوبہ: ۱۱۶)

"آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اُسی کی ہے۔"

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۔ لَهُ الْحُكْمُ ۔ (قصص: ۸۸)

"اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے اُسی کے ہاتھ میں فیصلہ کی طاقت ہے۔"

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۔ (شوریٰ: ۱۱)

"اس کے مانند کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔"

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ يُصِيبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۔ (یونس: ۱۰۷)

"اور اگر اللہ تجھے مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا اس کا دُور کرنے والا نہیں۔ اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کرے تو اس کے فضل و کرم کو کوئی روکنے والا نہیں۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنے فضل سے ممتاز کرے اور وہی گناہوں کو معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔"

یہود، ہنود، نصاریٰ اور مجوسیوں کا تصوّرِ خدا

اسلام سے پہلے ادیانِ سماوی تصوّرِ خدا کے بارے میں کافی افراط و تفریط کا شکار رہے تھے یہودیوں کے یہاں مذہب کی بنیاد سراسر دہشت، خوف و خشیت اور سخت گیری تھی۔ ان کا خدا فوجوں کا سپہ سالار اور شدید منتقم مزاج تھا۔ باپ کا بدلہ پُشت ہا پشت تک بیٹوں سے لینے والا۔

(خروج: ۲۰، ۵، ۳۴، ۷ و استثناء: ۴، ۳۴، ۶، ۱۵ وغیرہ)

اس کے برعکس عیسائیوں کے یہاں خدا محبّت کا سراپا تھا۔ رحم و کرم اور شفقت اس کی سرشت میں داخل تھی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہودیوں کی دینی کتب میں رحم و کرم سرے سے مفقود ہے۔ یا عیسائیوں کی دینی کتب میں خوف و خشیت کا تذکرہ نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہودیوں کے نزدیک خدا کا تصوّر یہ ہے کہ وہ دہشت اور سخت گیری کا سراپا ہے اور عیسائیوں کے یہاں خدا کا تصوّر یہ ہے کہ وہ محبّت ہی محبّت ہے۔

یہ اسلام ہی ہے جس نے اس افراط و تفریط کے درمیان نقطۂ اعتدال کو پیشِ نظر رکھا اور اس کا سبب واضح ہے کہ اسلام کے ہاں خدا کا تصوّر وہی ہے جو خدا کے ہاں سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس یہودیوں اور عیسائیوں میں خدا کا تصوّر وہ ہے جو انہوں نے اپنے جی سے گھڑ لیا اور صحیح تصوّرِ خدا کو تحریف کرنے کے بعد کچھ سے کچھ بنا ڈالا ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں خدا نہ تو یہودیوں کے خدا کی طرح رب الافواج اور نہ وہ صرف بنی اسرائیل کا گھریلو خدا ہے اور نہ وہ عیسائیوں کی طرح مجسّم انسان یا انسانوں کا باپ ہے۔ اسلام میں تو اللہ تعالیٰ کی ذات رحمٰن و رحیم اور کریم بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ شدید العقاب بھی ہے۔ مسلمانوں کا شیوہ یہ ہے کہ وہ خدا سے ڈرتے بھی ہیں اور اس سے پیار بھی کرتے ہیں۔ اس سے امید بھی رکھتے ہیں اور خوف بھی۔ وہ اپنے خدا کو رحم کا پیکر بھی سمجھتے ہیں لیکن ادب کی وجہ سے اس کے سامنے ان کی آوازیں پست بھی ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں

کی مدح میں فرماتے ہیں:

إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ۔ (الانبیاء: ۹۰)

"وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہم کو امید اور ڈر کے ساتھ پکارتے تھے۔ اور ہمارے آگے عاجزی کیا کرتے تھے۔"

وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ۔ (طٰہٰ: ۱۰۸)

"اور رحم والے کے ادب سے تمام آوازیں پست ہو گئیں۔"

یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں دو قسم کے پیغمبر آئے۔ ایک تو جن پر خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا ان کی تعلیم میں خدا کا خوف و خشیت طاری تھا۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السّلام اور حضرت موسیٰ علیہ السّلام۔ دوسرے وہ جن پر اللہ تعالیٰ کی رحمانیت اور رحیمیت کا غلبہ تھا وہ اللہ کی محبّت میں سرشار تھے اور لوگوں کو میخانۂ محبّت کی طرف بلاتے تھے۔ مثلاً حضرت یحییٰ علیہ السّلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام۔ لیکن محمد رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی شخصیّت وہ ہے جو اُمّتِ وَسَط کے نبی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کے جمال و جلال دونوں کا جلوہ عین اعتدال سے پڑا اور وہ ان دونوں صفتوں کی برزخِ کبریٰ ہیں۔ ان کی شخصیّت سے خشیتِ الٰہی اور اللہ تعالیٰ سے والہانہ عشق دونوں بیک وقت جھلکے پڑتے ہیں۔

اور یہ حقیقت ہے کہ جسے صرف اللہ تعالیٰ کی محبت نصیب ہوئی اور خشیت سے محروم رہا تو اللہ تعالیٰ سے بے خوف ہو کر اس کی نافرمانی تک کر گزرتا ہے۔ اس کے برعکس وہ شخص جسے صرف اللہ تعالیٰ کا خوف و خشیت نصیب ہوا اسے تقرّبِ الٰہی کا درجہ مطلوبہ نصیب نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کو بھی وہ اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے نا امید کر دیتا ہے۔

اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو خوف و محبّت کے کناروں سے ہٹا کر، جہاں سے ہر وقت نیچے گرنے کا خطرہ ہوتا ہے، خوف و خشیت اور رحم و محبت کے بیچ کی شاہراہ میں کھڑا کر دیتا ہے

اسی لیے کہا گیا ہے:

"الایمان بین الخوف والرجاء"

"ایمان ڈر اور امید کے درمیان درمیان ہے"

بندہ و خدا کے درمیان رشتۂ محبّت

انسان اَن دیکھی چیزوں کا تصوّر صرف دیکھی ہُوئی چیزوں کی تشبیہ سے پیدا کرتا ہے۔ اور اس طرح اُسے اَن دیکھی چیزوں کا ایک تصوّر ذہن میں آجاتا ہے۔ بندہ و خدا کے درمیان محبّت کے رشتے کی بھی یہی کیفیت ہے۔ انسان فطرۃً یہی چاہتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو بھی انہی مادّی اور جسمانی رشتوں کے ذریعے سے ظاہر کرے جس طرح سے کہ وہ رشتے انسان اور انسان کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ خالق و مخلوق کے باہمی ربط و تعلق کے اظہار کے لیے بہترین اُسلوب یہ سمجھا گیا کہ خالق کو یا تو باپ سمجھا جائے جیسا کہ عیسائیوں نے کیا۔ یا خدا کو ماں کا درجہ دے دیا جائے جیسا کہ ہندوؤں نے کیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ عیسائیت میں خالق کو باپ قرار دے دیا گیا، بندہ و خدا کا رشتہ بیٹے اور باپ کا رشتہ بن گیا۔ اور ادھر ہندومت میں بے شمار دیویاں انسانوں کی ماتائیں بن گئیں۔

ہندوستان کی خاک میں میاں اور بیوی کا باہمی تعلق انتہائی عظیم سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ خالق و مخلوق کے رشتے کو بھی یہی رنگ دے دیا گیا اور بندے کو بیوی اور خدا کو خاوند کا رتبہ دیا گیا۔ چنانچہ ہندوستان میں سدا سہاگ فقرا۔ اسی تخیّل کی مضحکہ خیز تصویریں ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جگہ جگہ سدا سہاگ فقیروں نے ساڑھیاں اور چوڑیاں پہن رکھی ہیں اور اللہ تعالیٰ سے شوخیاں کرتے پھرتے ہیں۔

اسلام بندہ و خدا کے باہمی رشتے کو اس سے کہیں زیادہ گہرا، مضبوط اور استوار ظاہر کرنا چاہتا ہے وہ محبّت کے اس تخیّل کو مادیّت، جسمانیت اور انسانیت کی آلائشوں سے بالکل پاک و منزّہ کردیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق باپ، ماں اور شوہر کا تصوّر اس درجہ مادّی اور جسمانی ہے کہ وہ اسے توحید کے صحیح راستے سے ہٹا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اظہارِ محبّت کے اس اُسلوب سے جس میں مادیّت

جسمانیت اور انسانیت ہو، منع کیا گیا ہے اور ایسے تمام الفاظ کے استعمال کو شرک قرار دیا ہے۔

بعض اسماء و صفات کی شرح

لیکن اہم بات یہ ہے کہ اسلام نے، جہاں تک جذبات و احساسات کا تعلق ہے، بندہ و خدا کے باہمی تعلق کو اس سے بھی زیادہ گہری اور مضبوط بنیادوں پہ استوار کیا اور اس تعلق میں ان جذبات و عواطف سے انکار نہیں کیا جو ماں اور بیٹے یا باپ اور بیٹے کے درمیان ہوتے ہیں۔

لفظ "اللہ" عربی زبان میں الہ سے نکلا ہے۔ الہ کے اصل معنی ہیں غم، محبت اور تعلقِ خاطر کے ہیں۔ کہا جاتا ہے الہ الرجل الی الرجل یعنی ایک شخص دوسرے شخص کی طرف شدّتِ شوق و محبّت سے متوجہ ہوا، یا اس کی پناہ پکڑی، یا اس کے ہاں سکون و اطمینان حاصل کیا۔ اسی طرح کہتے ہیں: الہ الفصیل بامّہٖ "یعنی وہ بچہ جس کا دُودھ چھڑایا گیا، بیقرار ہو کر ماں سے لپٹ گیا"

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی قرآن مجید کی آیات کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے۔ "اللہ" کا ترجمہ وہ "من موہن" یعنی "دلوں کا محبوب" کیا کرتے تھے۔ اللہ تو اسم ذاتی ہے لیکن صفات میں جو سب سے پہلے ہمارے سامنے آتی ہیں وہ "رحمٰن" اور "رحیم" ہیں۔ ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں یعنی رحم والا محبّت اور لطف و کرم والا اور یہ دونوں رحم و کرم اور لطف و مہر کے معنی میں صفتِ مبالغہ کے صیغے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ایک نام "الرّؤف" بھی ہے، رؤف کا لفظ "رأفت" سے نکلا ہے۔ اس کے معنی اس محبّت اور تعلقِ خاطر کے ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ایک نام "حنّان" بھی ہے، حنّان کا لفظ "حن" سے نکلا ہے۔ "حن" اور "حنین" اس دردِ دل اور سوز و محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔

یہاں یہ قابلِ غور بات ہے کہ قرآن مجید ان رشتوں کا نام تو نہیں لیتا ہے یعنی خدا کو باپ یا ماں کہنا کسی صورت میں جائز نہیں رکھتا لیکن اس محبّت، رأفت اور مامتا کے جذبے کو ضرور اُبھارتا ہے جو باپ اور بیٹے یا ماں اور بیٹے کے درمیان پائی جاتی ہے۔ یعنی ان رشتوں کی وجہ سے محبّت اور پیار

کے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے لیے بے تکلف استعمال کرتا ہے، لیکن ان رشتوں کا نام نہیں آنے دیتا۔ اور اس طرح سے مادیت اور جسمانیت کا تصور و تخیل لائے بغیر وہ روحانی طور پر ان جذبات و عواطف کو برقرار رکھتا ہے بلکہ اس میں مزید شدت پیدا کرتا ہے۔

دیکھیے اللہ تعالیٰ کا ایک نام "الودود" ہے جس کے معنی "پیارے" اور "محبوب" کے ہیں یعنی وہ ہستی جو مہر و محبت اور عشق کا سراپا ہو۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ایک نام "الولی" ہے جس کے معنی "یار اور دوست" کے ہیں۔

محبت کے مادی و جسمانی تصور سے گریز

تو بات واضح ہوتی کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کو بندے کا محبوب بھی قرار دیتا ہے۔ یار دوست بھی اور اس کی ذات میں پدرانہ شفقت اور ماں کی مامتا کا بھی بدرجۂ اتم اظہار کرتا ہے لیکن اس تعلق کو مادی اور جسمانی معنوں میں ہرگز استعمال نہیں کرنے دیتا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے باپ یا ماں کا لفظ استعمال کرنا جائز نہیں ٹھیراتا۔ اور نہ اسے شوہر ٹھیرا کے بندوں کو سدا سہاگ فقیر بناتا ہے۔

عیسائیوں اور ہندوؤں سے یہی بنیادی غلطی ہوتی۔ انہوں نے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو اصلیت سمجھ کر پاک اور روحانی تعلق کو مادیت اور جسمانیت کے دائرے میں مقید کر لیا اور یوں وہ توحید کی بلند سطح سے نیچے گر گئے۔

اصل بات یہ ہے کہ رشتہ حقیقت پر قائم رہنے کے لیے صرف محبت ہی کافی نہیں بلکہ آدابِ محبت کا جاننا بھی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے استعارات اور مجازات کے استعمال میں بہت احتیاط برتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے مہر و کرم، عشق و محبت اور مغفرت کے تذکروں کے ساتھ ادب لحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کیا ہے۔

گنہگاروں کے لیے بھی سراپا محبت

پھر اللہ تعالیٰ نے بندے کے ساتھ اپنی محبت کا جو اظہار کیا ہے وہ معنوی طور پر اس قدر حسین ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسی اظہارِ محبت پہ ہی مر مٹنے کو جی چاہتا ہے۔ دیکھیے اپنے گنہگار بندوں کو خطاب فرماتے ہیں تو

کس قدر محبّت سے ارشاد ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۔ (زمر: ۵۳)

"اے پیغمبر میرے ان بندوں کو پیغام پہنچا دیجیے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ یقیناً تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ بے شک وہ بخشش کرنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔"

کیا ٹھکانا ہے اس محبّت اور شفقت کا کہ گنہگار بندوں کو یُوں خطاب کرتے ہیں کہ اے میرے بندو!

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت لوگوں سے کہا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ اگر تم لوگ گناہ نہ کرتے تو خدا کوئی اور مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور اس کو بخشتا۔" (مُسند احمد بن حنبل، جلد ۵ ص ۴۱۴)

نیکوں سے اور اچھوں سے تو ہر کوئی پیار کرتا ہے اور انہیں ڈھونڈتا ہے مگر گناہگاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے اور اس کی رحمت و مغفرت انہیں سہارا دیتی ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک صحابی کو شراب خوری کے جرم میں بار بار حضورؐ کے سامنے لایا گیا تو صحابہ میں سے کسی شخص نے اس پر لعنت کر دی۔ رحمت للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یہ بات پسند نہ آئی، فرمایا:

"لَا تَلْعَنُوْهُ اِنَّهٗ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ" (بخاری، کتاب الحدود، باب ما یکرہ من لعن شرب الخمر، صفحہ ۱۰۰۲)

"اس پر لعنت نہ کرو، کیونکہ اس کو خدا اور رسول سے محبت ہے۔"

جامع ترمذی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے یُوں خطاب فرماتے ہیں:

"اے آدم کے فرزندو! جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے آس لگاتے

رہو گے مَیں تمہیں بخشتا رہوں گا۔ خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں، مجھے پروا نہیں۔ اے آدم کے بیٹے، اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو تو مَیں تمہیں معاف کر دُوں گا خواہ تم میں کتنے ہی عیوب کیوں نہ ہوں مجھے پروا نہیں۔ اے آدم کے بیٹو! اگر پُوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو پھر تم میرے پاس آؤ، اس حال میں کہ کسی کو میرا شریک نہ بناتے ہو تو میں بھی تمہارے پاس پوری سطح زمین بھر مغفرت لے کر آؤں گا۔"

(جامع الترمذی، ابواب الدعوة)

کیوں نہ ہو اپنی شان میں خود فرماتے ہیں:

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۔ (انعام: ۵۴)

"اللہ نے از خود اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔"

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف: ۱۵۶)

"اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے۔"

انسان کی زندگی میں دو چیزیں ہیں جو اس کے لیے سوہانِ روح بن جاتی ہیں۔ ایک ماضی و حال کی ناکامیاں اور ان کی یاد جنہیں غم اور حزن کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے مستقبل سے متعلق بعض خطرات اور ان کی فکر جسے خوف و دہشت کہا جاتا ہے، یعنی خوف و حزن۔ یہی دو کانٹے ہیں جو انسان کی زندگی میں درد و الم کا سبب ہیں۔ دیکھیے وہ آقائے رحمان و رحیم جب اپنے دوستوں پر رحمت و شفقت کا اظہار فرماتے ہیں تو کس قدر خوبصورت انداز سے فرماتے ہیں، کہتے ہیں کہ تمہاری زندگی کے چمن زار سے مَیں ان دونوں کانٹوں کو نکال کے پھینک دُوں گا۔ ارشاد ہے:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس: ۶۲)

"ہاں خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

کسی جگہ فرماتے ہیں:

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ (المائدہ: ۵۴)

"وہ اپنے بندوں سے پیار کرتا ہے اور اس کے بندے اُس سے پیار کرتے ہیں"

اور کہیں فرماتے ہیں :-

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ (التوبہ : ۱۰۰)

"وہ اپنے بندوں سے راضی ہو گیا اور اس کے بندے اس سے راضی ہو گئے"

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں کئی طریقوں سے حضرت انسؓ سے یہ روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ "یا رسول اللہ! قیامت کب آئے گی؟" فرمایا چھوڑو تم نے اس کے لیے کیا تیاری کر رکھی ہے۔ صحابی نے عرض کیا "یا رسول اللہ! میرے پاس نہ تو نمازوں کا بڑا ذخیرہ ہے اور نہ روزوں کا اور نہ صدقات و خیرات کا۔ جو کچھ سرمایہ ہے وہ بس یہی ہے کہ خدا اور رسول کی محبت ہے اور بس! حضورؐ نے فرمایا تو انسان جس سے محبت کرے گا اسے اس کا ساتھ نصیب ہو جائے گا۔ صحابہؓ نے اس بشارت کو سُن کر اس دن جس قدر خوشی منائی اس سے پہلے کبھی اتنی خوشی نہیں منائی تھی۔ (مسلم، کتاب الادب، باب المرءُ مع من احَبّ، بخاری کتاب الادب، باب ما جاء فی قول الرجل ویلک)

حدیث شریف میں ہے کہ میدانِ جنگ میں ایک عورت اپنے گمشدہ بچّے کو دیوانگی کے عالم میں تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ سامنے جو بچہ بھی نظر آتا جوشِ محبّت میں اسے چھاتی سے لگا لیتی اور دُودھ پلانے لگتی۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس عورت کو دیکھ کر صحابہ سے ارشاد فرمایا کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچّے کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے۔ صحابہ نے عرض کیا، ہرگز نہیں! آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جتنی محبت اِس ماں کو اپنے بچے سے ہے خدا کو اپنے بندے سے اس سے کہیں زیادہ محبت ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الولد)۔

بندہ و خدا کا باہمی رشتہ و محبت ذیل کی دو آیتوں سے اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ۔ (البقرہ : ۱۶۵)

"اور جو ایمان لاتے وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں"

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِۦ فَسَوْفَ يَأْتِى ٱللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُۥٓ۔ (مائدہ: ۵۴)

"مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا تو خدا کو اس کی کچھ پرواہ نہیں وہ ایسے لوگوں کو لا کھڑا کرے گا جن کو وہ پیار کرے گا اور وہ اس کو پیار کریں گے۔"

إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِى يُحْبِبْكُمُ ٱللَّهُ۔ (آل عمران: ۳۱)

"اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی) پیروی کرو، خدا بھی تم سے پیار کرے گا۔"

إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّٰلِحَٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ ٱلرَّحْمَٰنُ وُدًّا (مریم: ۹۶)

"جو لوگ ایمان لاتے اور انہوں نے نیک کام کیے، رحمت والا خدا ان کے لیے (ارد گرد ہر طرف) محبت پیدا کر دے گا۔"

دیکھ لیجیے محبتِ الٰہی کی یہ سب نیرنگیاں صرف اسلام ہی کے پردے پر نظر آتی ہیں اور عفو و کرم، رحمت و مغفرت کے بحرِ ذخّار کا یہ ساحلِ امید محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دکھانے سے انسانیت کو نظر آیا۔

باب ۲۰

اعجازِ قرآنی

قرآنِ مجید کے حیران کن سائنسی انکشافات

یُوں تو قرآن مجید ہر دَور میں ایک معجزہ ہے لیکن سائنس کے جدید دَور میں قرآنی اعجاز نئے ہی اسلوب میں نکھر کے سامنے آگیا ہے۔ یُوں معلوم ہوتا ہے کہ جُوں جُوں سائنسی علم اور حکمت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے قرآن مجید کے فہم کے افق اور واضح اور نمایاں ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ سائنس اور فلسفے کا طالب علم جب اس دَور میں قرآن مجید کا مطالعہ کرتا ہے تو آیاتِ قرآنیہ اس سے عجیب و غریب انداز میں گویا ہوتی ہیں اور اس انداز سے ہم کلام ہوتی ہیں کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

بہت سی باتیں ہیں جو کہ ڈیڑھ ہزار سال قبل بیان کر دی گئی ہیں۔ لیکن اس لیے سمجھ میں نہ آسکیں کہ انسان کا فہم اور اس کی تحقیق و تفتیش کا درجہ اس فہم و بصیرت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ بہت سی باتیں جو کہ آج ہمارے لیے محض جدید انکشافات ہیں اور گذشتہ ایک ڈیڑھ صدی سے پہلے انسان کو ان کی ہوا بھی نہ لگی تھی قرآن مجید میں انتہائی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔ کیا یہ اس بات کا کھلا ثبوت نہیں کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور ایسا کھلا ہُوا معجزہ جو اپنی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کے وجود کا ایک کھلا ہُوا ثبوت ہے۔ اور نہ ختم ہونے والی شہادت۔

ذیل میں ہم چند ایسے ہی اُمور کی طرف اشارہ کریں گے جو قرآنی اعجاز سے متعلق ہیں اور سائنس اور فلسفۂ حکمت کے ہر طالب علم کو بزبانِ حال یہ دعوت دے رہی ہیں کہ:

دستِ ہر نا اہل بیمارت کند
سُوئے مادر آکہ تیمارت کند

مُطالعۂ فطرت

دنیا میں قرآنِ مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جو آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے انسان کو مطالعۂ کائنات، علم، حکمت اور قرأت وکتابت کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ آج سے چودہ سو سال قبل صحرائے عرب میں نہ کوئی کتاب تھی نہ مُصنّف، نہ صاحبِ علم، اور نہ پڑھنے لکھنے کا رواج تھا۔ بعض حضرات کے بقول اُس وقت سارے عرب میں ایسے افراد کی تعداد تقریباً دو درجن تھی جو اپنا نام یا خط لکھ سکتے تھے، مگر حیرت ہوتی ہے کہ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی نازل ہوتی ہے تو اس طرح سے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔ (علق: ۱-۵)

"پڑھو (اے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا"

یا پھر ایک جگہ قلم کی قسم کھائی جاتی ہے:

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ۔ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ۔ (القلم: ۱-۲)

"قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جو لکھی جاتی ہے جو یہ لوگ لکھتے ہیں (یعنی قلم اور لکھی ہوئی چیزوں کی اور لکھی ہوئی کتابیں اس بات کی شاہد ہیں) کہ آپ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دیوانے نہیں ہیں"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ، الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (اٰلِ عمران: ۱۹۰-۱۹۱)

"زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوشمند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اُٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اور آسمان اور زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اُٹھتے ہیں) پروردگار یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے"۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ (البقرہ: ۲۶۹)

"اور جس کو چاہتا ہے دانائی بخشتا ہے اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہیں"۔

فطرت اور کائنات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے کسی جگہ متّقی اور کہیں صاحبِ ایمان و یقین اور کہیں اصحابِ فکر و دانش اور کہیں عالم اور کہیں اصحابِ تدبّر و حکمت قرار دیا ہے۔ قرآنِ مجید کے تقریباً ہر صفحے پر اس قسم کی آیات ملتی ہیں۔

اٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔ "یہ اربابِ عقل کے لیے نشانیاں ہیں"

اٰيَاتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ۔ "یہ اصحابِ یقین کے لیے نشانیاں ہیں"

لَاٰيَاتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ۔ "یہ اہلِ علم کے لیے نشانیاں ہیں"

لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ "یہ اہلِ ایمان کے لیے نشانیاں ہیں"

لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ "یہ سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں"

لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَذَكَّرُوْنَ۔ "اس میں عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں"

قابلِ غور بات یہ ہے کہ کیا حضور محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے کسی نبی، فلسفی یا حکیم نے مطالعۂ کائنات کی طرف اس قدر زوردار انداز سے توجہ دلائی تھی؟ کیا کوئی شخص کسی ایسی بات کی دعوت دے سکتا ہے جس کی اہمیّت کا انکشاف بارہ تیرہ سو سال بعد ہونا ہو؟ صاف پتہ چل رہا ہے کہ ان آیات

یں اور اس دعوت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ دانش فراست اور بصیرت کارفرما تھی۔

عالمی شہرت یافتہ مُصنّف "موریس بکائیے" اپنی کتاب "بائیبل قرآن سائنس" میں لکھتے ہیں :-

"جب مَیں نے پہلے پہل قرآنی وحی و تنزیل کا جائزہ لیا تو میرا نقطۂ نظر کلیتہً معروضی تھا، پہلے سے کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہ تھا۔ مَیں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ قرآنی متن اور جدید سائنس کی معلومات کے مابین کس درجے مطابقت ہے۔ تراجم سے مجھے پتہ چلا کہ قرآن ہر طرح کے قدرتی حوادث کا اکثر اشارہ کرتا ہے۔ لیکن اس مطالعے سے مجھے مختصر سی معلومات حاصل ہوئیں۔ جب مَیں نے گہری نظر سے عربی زبان میں اس متن کا مطالعہ کیا اور ایک فہرست تیار کی تو مجھے اس کام کو مکمل کرنے کے بعد اس شہادت کا اقرار کرنا پڑا جو میرے سامنے تھی۔ قرآن میں ایک بیان بھی ایسا نہیں ملا جس میں جدید سائنس کے نقطۂ نظر سے حرف گیری کی جا سکے۔

اسی معیار کو میں نے عہد نامہ قدیم اور اناجیل کے لیے آزمایا اور ہمیشہ وہی معروضی نُقطۂ نظر قائم رکھا۔ اوّل الذکر میں مجھے پہلی ہی کتاب آفرینش سے آگے نہیں جانا پڑا اور ایسے بیانات مل گئے جو جدید سائنس کے مسلّمہ حقائق سے کُلّی طور پر عدم مطابقت رکھتے تھے۔"

(۱۰: ۱۴)

یہی صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں :-

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اناجیل کا مکمل طور پر مطالعہ کیا جائے تو عیسائیوں کو بدرجۂ غایت انتشار میں مبتلا کر دے۔" (۱۰ : ۶۶)

کائنات دُھواں ہی دُھواں تھی :-

آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل کسی کے تصوّر میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کائنات ابتدا میں دھواں ہی دُھواں تھی اور اس میں سے اجرام فلکی پیدا کیے گئے۔ ہاں جدید سائنس یہ کہتی ہے کہ کائنات کی تشکیل ایسے گیسی مادّے سے ہوتی تھی جو ہائیڈروجن اور ہیلیم کی اِس مقدار سے مرکّب تھا اور آہستہ آہستہ

گردش کر رہا تھا۔ یہ انجام کار متعدد ٹکڑوں میں بٹ گیا۔

اس دور کے سائنسدانوں نے اس دھوئیں کو اب بھی دیکھا ہے اور مشاہدہ کر رہے ہیں کہ کس طرح اس سے آج تک ستارے بن رہے ہیں۔ دیکھیے ڈیڑھ ہزار سال قبل اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو کیا علم عطا فرمایا۔ ارشاد باری ہے:۔

"ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ (حٰمٓ السجدہ : ۱۱)

"پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اُس وقت محض دھوآں تھا اُس نے آسمان اور زمین سے کہا "وجود میں آجاؤ، خواہ تم چاہو نہ چاہو"۔ دونوں نے کہا "ہم آ گئے فرماں برداروں کی طرح"

موریس بکائیے لکھتا ہے:۔

"کائنات کے ابتدائی مرحلہ میں "دخان" (دھوآں) کی موجودگی جس کا حوالہ قرآن مجید میں موجود ہے اور جس سے مراد مادّہ کے زیادہ تر گیسی حالت ہے صریحاً اس ابتدائی سدیم کے تصوّر سے مطابقت رکھتا ہے جو جدید سائنس نے پیش کیا ہے"۔ (۱۰ : ۱۴۳)

زندگی کی ابتدا پانی سے ہوئی :۔

دورِ جدید کے سائنسدان اس بات پر متفق ہیں کہ زندگی کی ابتداء پانی سے ہوئی۔ اور پانی تمام جاندار خلیات کا جزوِ اعظم ہے۔ اور پانی کے بغیر زندگی ممکن نہیں ہے، جب کسی دوسرے سیّارے پر زندگی کے امکان پر بحث کی جاتی ہے تو پہلا سوال ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ کیا وہاں حیات کو قائم رکھنے کے لیے کافی مقدار میں پانی موجود ہے؟ جرمنی کا ایک جیالوجسٹ ابراہم ورنر (۱۷۵۰ء۔ ۱۸۱۷ء) تمام تبدیلیوں کو ایک ہی سبب یعنی پانی کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ "پہاڑوں کی تعمیر پانی کی وجہ سے ہوتی تھی۔ پانی ہی سے وہ گیس بنی جو بطنِ زمین کے مواد کو باہر لاتی تھی اور ولکان کی آتش فشانی میں بھی پانی کا دخل تھا"۔ (۵ : ۸۶)

جس زمانے میں قرآن مجید نازل ہوا کسی شخص کے علم میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ زندگی کی ابتداء پانی ہی سے ہوئی لیکن قرآن مجید میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (الانبیاء : ۳۰)

"اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز کو پیدا کیا"

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّن مَّآءٍ (النور : ۴۵)

"اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا فرمایا"

موریس بکایئے لکھتے ہیں :-

"قرآن میں شامل حیات کی ابتداء کے تمام بیانات جدید سائنسی معلومات سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں۔ زندگی کی ابتداء سے متعلق جو اساطیر نزولِ قرآن کے وقت عام طور پر رائج تھے ان میں سے کوئی بھی قرآن کے متن میں مذکور نہیں ہے۔ (۱۰ : ۲۳۵)

دُنیا کی تمام اشیاء جوڑا جوڑا پیدا کی گئیں

اِس دَور میں سائنس دانوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ تمام کی تمام نباتات میں بھی ہر چیز جوڑا جوڑا ہے۔ ان میں ایک نر ہے اور ایک مادّہ۔

مگر یہ بات اس زمانے میں جبکہ قرآنِ مجید نازل ہو رہا تھا کسی شخص کو بھی معلوم نہ تھی۔ لیکن قرآن مجید میں بات وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

فَاَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ (لقمان : ۱۰)

"پس ہم نے زمین میں پودوں اور نباتات کے اچھے جوڑے لگائے"

وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ (الرعد : ۳)

"اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں"

سُبْحٰنَ الَّذِي خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا

لَا یَعْلَمُوْنَ ۔ (یٰسٓ : ۳۶)

" پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (نوعِ انسانی میں سے) یا اُن اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں ہیں۔"

نباتات میں سبز مادّے کی اہمیت :-

دورِ جدید میں سائنس دانوں نے دریافت کیا کہ جب پانی نباتات پر ڈالا جاتا ہے تو نباتات میں ایک سبز رنگ کا مادّہ پیدا ہوتا ہے جسے انگریزی میں کلوروفل Chlorophyll کہتے ہیں۔ یہی وہ مادّہ ہے جس کے ذریعے سے نباتات میں دانے اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بات حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھی لیکن اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۔ (الانعام : ۹۹)

" وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا ۔ اور اس کے ذریعے نباتات میں سے ہر چیز پیدا کی اور اس میں سبز مادّہ پیدا کیا جس کے ذریعے سے ہم دانوں کے ڈھیر پیدا کر لیتے ہیں۔"

حمل اور ہوائیں :-

ابھی ہم نے بیان کیا کہ نباتات میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ جدید سائنسی تحقیق یہ ہے کہ نر میں زرد رنگ کے ذرّات ہوتے ہیں جو پولن Pollen کہلاتے ہیں۔ اگر یہ ذرات مادہ تک نہ پہنچیں تو بیج اور پھل نہیں لگتے۔ قدرت ان ذرات کو مادہ پھل تک پہنچانے کے لیے کئی طریقے استعمال کرتی ہے۔ بعض پودوں میں دونوں قسم کے پھول ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں۔ جب ہوا یا بھونروں کے بیٹھنے سے شاخیں ہلتی ہیں تو پولن مادہ پھول پر گر پڑتا ہے، اگر مادہ اور نر پھول کے پودے الگ الگ ہوں تو عموماً ہواؤں سے کام لیا جاتا ہے۔ ہوائیں پولن کو اڑا کر مادہ پھولوں پر ڈال دیتی ہیں۔

بھونرے بھی یہی کام کرتے ہیں کہ جب وہ پھولوں کا رس چوسنے کے لیے نر پھول میں گھستے ہیں تو پولن کی کچھ مقدار ان کے پروں اور ٹانگوں سے چمٹ جاتی ہے۔ اور جب وہ مادہ پھول میں داخل ہوتے ہیں تو کچھ پولن وہیں چھوڑ آتے ہیں۔ دریاؤں میں اُگنے والے پودوں کا پولن پانی میں سفر کرتا ہے۔ پرندے، گلہری، چوہے اور کیڑے مکوڑے بھی یہی فرض انجام دیتے ہیں۔ چونکہ پولن کی تقسیم کا سب سے بڑا ذریعہ ہوائیں ہیں اس لیے قرآنِ مقدّس نے انہی کے ذکر پر اکتفا کی ہے۔ عربی زبان میں لقح کے معنی ہیں حمل کرنا "لقحت المرأۃ" یعنی عورت حاملہ ہو گئی۔

لواقح (یعنی حاملہ اونٹنیاں)۔ "رِیحٌ لَاقِحٌ" حمل کر دینے والی ہوا۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ ۔ (الحجر: ۲۲)

"ہم نے حاملہ کر دینے والی ہوائیں چلائیں۔"

قرآن مجید میں ایسی حقیقت کا ذکر آ جانا جس کا انکشاف آج سے دو سو سال پہلے ہُوا اس امر کا اعلان ہے کہ:

تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ کِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۔ (حٰمٓ السجدہ: ۲-۳)

"رحمٰن اور رحیم رب نے ایک باعلم قوم کے لیے ایک ایسی کتاب نازل کی جس کی آیات مفصّل ہیں اور وہ عربی زبان میں ہیں (حوالہ ۶: ۴۵)

دُودھ کے اجزائے ترکیبی بارے میں قرآن مجید کا انکشاف

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَاِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ (النحل: ۶۶)

"یقیناً جانوروں میں تمہارے لیے ایک سبق ہے۔ ہم تمہیں ان کے جسموں کے اندر کی اُس

چیز سے جو آنتوں کے مادہ اور خون کے اختلاط سے ہے، ایسا دودھ دیتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خالص اور فرحت بخش ہوتا ہے۔"

"موریس بکائیے" اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں :

"دودھ کے اجزائے ترکیبی پستان کے غدودوں سے رستے ہیں، پھر یوں ہوتا ہے کہ ان کو غذا کے ہضم ہونے سے بننے والی اس شے سے غذائیت ملتی ہے جو خون کی نالیوں کے ذریعے ان اجزا تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ خون اس شے کا جو کھانے سے حاصل ہوتی ہے جمع کرنے اور پہنچانے والا عامل ہے اور اسی سے پستانوں کے غدودوں کا تغذیہ ہوتا ہے۔ جہاں دودھ کی تولید ہوتی ہے یہ اسی طرح کا عمل ہے جس طرح کا دوسرے کسی عضو کے ساتھ ہوتا ہے۔

یہاں وہ ابتدائی عمل جو ہر دوسری چیز کو حرکت میں لے آتا ہے آنت اور خون کے مشمولات کو خود جدار الامعاء کی سطح پر باہم ملا دیتا ہے۔ یہ نہایت واضح تصوّر کیمیا اور علم اعضا میں تحقیقات کے نتیجے کے طور پر حاصل ہوا ہے، رسول خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں اس کا قطعاً علم نہیں تھا اور محض ماضی قریب میں اس کو سمجھا گیا ہے۔ دورانِ خون کی دریافت نزولِ قرآن کے تقریباً دس صدیوں بعد "ہاروے" نے کی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان تصوّرات کے حوالوں کی قرآن میں موجودگی کی وضاحت انسان کے بس کی بات نہیں اس لیے کہ وہ تصوّرات بعد میں وضع ہوئے۔" (۲۴۹:۱۰)

بلندی پر سانس کی تنگی

جس زمانے میں قرآن مجید نازل ہوا، لوگوں کا خیال تھا کہ جو شخص بلندی کی طرف جائیگا اسے زیادہ تازہ ہوا ملے گی اور اسے زیادہ فرحت اور خوشی حاصل ہوگی۔ لیکن جدید دور میں جب انسان نے ہوائی جہاز ایجاد کیا اور وہ تیس چالیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرنے لگا

اسے پتہ چلا کہ بلندی پر جاتے ہوئے اسے نسبتاً کم آکسیجن مہیا ہوتی ہے اور سانس لینے میں بہت دشواری لاحق ہوتی ہے۔ اس شدید گھٹن سے بچنے کے لیے ہوائی جہازوں میں مصنوعی طور پر آکسیجن پہنچانے کا انتظام رکھا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہ اس قدر بلندی پہ جانے کا تصور تھا اور نہ ہی آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کا لیکن قرآن مجید میں یہ آیت ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے:-

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ۔ (الانعام: ۱۲۵)

"پس (یہ حقیقت ہے کہ) جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے (بلندی کو جا رہا ہے)"

درد کا احساس جسم میں صرف جلد کو ہوتا ہے

جدید طب نے یہ دریافت کیا ہے کہ وہ اعصاب جو درد کا ادراک کرتے ہیں خواہ وہ درد چوٹ لگنے سے، جلنے سے یا شدید گرمی و سردی کی وجہ سے ہو وہ اعصاب فقط جلد میں ہی پائے جاتے ہیں یعنی اگر جسم میں سوئی چبھوئی جائے تو درد صرف جلد کی سطح پہ ہوگا لیکن اگر سوئی جلد سے آگے گزار دی جائے تو بقیہ گوشت میں فی الواقع درد نہیں ہوگا۔ یہ بات تو دورِ جدید کی تحقیق ہے، لیکن اس کی طرف اشارہ قرآن مجید میں موجود ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا۔ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔

(النسآء: ۵۶)

"جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا انہیں بالیقین ہم آگ میں

جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔"

یعنی درد اور تکلیف کا تعلق قرآن مجید میں صرف جلد سے بیان کیا گیا ہے اور مزید تکلیف پہنچانے کے لیے بار بار جلد ہی کو تبدیل کیا جائے گا۔

پہاڑ زمین کی میخیں ہیں

دورِ جدید میں یہ بات سائنس نے دریافت کی کہ زمین کے بیرونی حصہ (قشرِ ارضی) کے اس سخت حصے کے نیچے ایک نرم طبقہ بھی ہے، یہ پہاڑ اس نرم طبقے کے اندر داخل ہو کر زمین کی جڑوں کا کام کرتے ہیں اور زمین کو ہلنے اور کھسکنے سے بچاتے ہیں اور یوں زمین ایک خاص قسم کے توازن پر قائم رہتی ہے۔ یہ بات قرآن مجید میں ڈیڑھ ہزار سال قبل بیان کر دی گئی:

وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ (الانبیاء: ۳۱)

"ہم نے زمین پہ پہاڑ بنا دیئے تاکہ زمین انہی سمیت کہیں ڈھلک نہ جائے۔"

وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا (النبا: ۷)

"ہم نے پہاڑوں کو میخیں بنا دیا۔" (اور انہیں زمین میں گاڑ دیا)

سمندر میں تہ بہ تہ موجوں اور تہ بہ تہ اندھیروں کا قرآنی تصور:۔

آج سے ہزار ڈیڑھ ہزار سال قبل انسان کو یہ علم نہ تھا کہ سمندر میں کچھ موجیں سطحی ہوتی ہیں اور کچھ موجیں اس کے نیچے ہوتی ہیں۔ تہ بہ تہ موجوں کا یہ تصور بہت بعد کی دریافت ہے۔ اسی طرح سے لوگوں کے علم میں یہ بات بھی نہیں تھی کہ سمندر کی گہرائیوں میں اندھیرے ہیں اور یہ اندھیرے بھی اسی طرح تہ بہ تہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مچھلیوں کو جگنو کی طرح روشنی عطا کر کے ان اندھیروں میں روشنی کا انتظام کیا ہے

اسی طرح سے لوگوں کے تصوّر میں یہ بات بھی نہیں آسکتی تھی کہ ایک موج اوپر سے آنے والی روشنی کی کرن کو بالکل ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس کی روشنی کو زائل کر دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سُورج کی روشنی سمندر کی گہرائی تک پہنچتے پہنچتے بالکل ختم ہو جاتی ہے اور یہ بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ بادل سُورج کی بعض شعاعوں کو زمین تک آنے سے بالکل روک دیتے ہیں۔ لیکن یہ سب کے سب اسرار اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آیت میں بیان کر دیتے ہیں اور آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے :

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۔ (النّور : ۴۰)

"یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے، اس پر ایک اور موج، اور اس کے اوپر بادل، تاریکی پر تاریکی مسلّط ہے۔ آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے۔ جسے اللہ نُور نہ بخشے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔"

قرآن مجید میں سُورج اور چاند کا تصوّر

یہ بات جدید سائنسی دَور میں معلوم ہو سکی ہے کہ چاند میں جو روشنی ہے وہ اس کی اپنی نہیں ہے بلکہ سورج کی روشنی کا عکس ہے۔ اس کا اشارہ قرآنِ مجید میں ملتا ہے، وہ اس طرح کہ چاند کی روشنی سے انکار تو نہیں کیا گیا، اس کو روشن تو کہا گیا ہے لیکن روشنی کا منبع یا چراغ قرار نہیں دیا گیا۔ صرف سُورج کے لیے چراغ بلکہ گرم و روشن چراغ (سراجاً وھاجاً) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ جہاں یہ سراج کا لفظ استعمال ہوا ہے اور صیغۂ واحد میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید کے نزدیک چاند روشن تو ہے لیکن روشنی کا منبع نہیں ہے۔ مندرجہ ذیل آیتیں قابلِ غور ہیں :-

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا۔
(الفرقان : ۶۱)

"خدا بڑی برکت والا ہے جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور ان میں آفتاب کا نہایت روشن چراغ اور چمکتا ہوا چاند بھی بنایا۔"

وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا - (النباء: ۱۲-۱۳)

"اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان قائم کیے اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا۔"

یہاں چاند کو ایک ایسا جرم قرار دیا گیا ہے جس سے روشنی منعکس ہوتی ہے (قمراً منیراً)۔ آیت والفاظ کے اُسلوب سے صاف پتہ چلتا ہے کہ چاند کو روشن تو قرار دیا گیا ہے مگر روشنی کا منبع ومصدر قرار نہیں دیا گیا۔ اس کے برعکس سورج کو ایک شعلہ فگن سراج سے یا ایک گرم چراغ (وہّاج) سے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔

بقول موریس بکایئے "قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو ان معلومات کی تردید کرتی ہو جو ہمیں آج ان اجرام سماوی کے بارے میں حاصل ہے (۱۰: ۱۹۲)۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف سراجاً کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی صیغۂ واحد میں۔ اگر چاند کی بھی یہی پوزیشن ہوتی جو سورج کی ہے اور وہ بھی شعلہ فگن چراغ ہوتا تو سراجاً کی بجائے "سراجین" (دو چراغ) کے الفاظ استعمال کیے جاتے۔

سُورج اور چاند کے مداروں کا وجود

آج سے ہزار ڈیڑھ ہزار سال قبل دنیا میں اجرامِ فلکی کے مداروں کا کوئی تصوّر نہیں تھا اس لیے قرآنِ مجید کے مفسّرین کو لفظ فلک کی تشریح کرنے میں بہت دِقّت پیش آئی۔ موریس بکایئے اس موضوع پر لکھتے ہیں:۔

"قرآن کے قدیم مترجمین کو اس لفظ (فلک) نے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ جو چاند اور سورج کے مدوّر راستوں کا تصوّر قائم نہیں کر سکے تھے، اس لیے انھوں نے خلا میں ان کے

راستے میں کچھ ایسی شکلیں محفوظ کر لی تھیں جو یا تو کسی حد تک درست تھیں یا بالکل ہی غلط تھیں۔

حمزہ ابوبکر اپنے ترجمہ قرآن مجید میں اس لفظ کی وہ مختلف النوع تشریحات پیش کرتے ہیں جو دوسروں نے کی ہیں "ایک قسم کا "دُھرا" جو ایک آہنی سلاخ کے مثل ہوتا ہے جس کے گرد کوئی کل گھومتی ہے، ایک سماوی کُرہ، مدار، بروج کی علامتیں، رفتار، لہر۔۔۔"

لیکن پھر وہ حسب ذیل بیان جو دسویں صدی کے مشہور مفسّر طبری نے دیا ہے پیش کرتے ہیں۔

"جب ہمیں کسی بات کا علم نہ ہو تو ہمارا فرض ہے کہ ہم خاموشی اختیار کریں"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ سورج اور چاند کے مدار کا یہ تصوّر حاصل کرنے میں کس قدر ناکام رہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر یہ لفظ اس فلکیاتی تصوّر کو واضح کرتا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عام تھا تو ان آیات کی توضیح و تشریح کرنا انتہائی مشکل ہوتا، لہٰذا قرآن میں ایک بالکل ہی جدید تصوّر موجود تھا جس کی وضاحت صدیوں بعد تک نہیں کی جا سکی تھی" (۱۰ : ۱۹۷)

اب آئیے دیکھیں کہ قرآن مجید نے فلک یا مدار کا کیا تصوّر پیش کیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ○

(الانبیاء : ۳۳)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ یہ سب اپنے اپنے مداروں پر چل رہے ہیں"

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ○ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۔

(یٰسٓ : ۳۹-۴۰)

"اور چاند، اس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کی مانند رہ جاتا ہے۔ نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے

اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار پر تیر رہا ہے۔"

موریس بکائیے اس آیت کی شرح میں لکھتے ہیں :۔

"اس جگہ ایک اہم حقیقت کا واضح طور پر اظہار کیا گیا ہے وہ ہے سورج اور چاند کے مداروں کا وجود۔ اس پر مستنزاد وہ حوالہ ہے جو ان اجرام کی اپنی حرکت سے خلا میں سفر کرنے کے سلسلے میں دیا گیا ہے۔

ان آیات کے مطالعہ سے ایک منفی حقیقت بھی اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ سُورج ایک مدار پر حرکت کر رہا ہے لیکن اس بات کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے کہ زمین کے لحاظ سے یہ مدار کون سا ہو سکتا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت خیال کیا جاتا تھا کہ سُورج متحرک ہے اور زمین ساکن۔ یہ زمین کی مرکزیّت کا نظام تھا جو بطلیموس کے زمانہ سے مقبول چلا آ رہا تھا۔ جو دوسری صدی عیسوی کا سائنسدان ہے اس کا سلسلہ نکولاس کوپرنکس (۱۵۴۳ء) تک چلا جس کا دور سولھویں صدی عیسوی ہے۔ اگر حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں لوگ اس نظریہ کے حامی تھے لیکن قرآن کریم میں کہیں بھی اس کا اظہار نہیں ہوا۔ نہ یہاں نہ کہیں اور۔" (۱۰: ۱۹۶)

سُورج اپنی منزل کی جانب رواں ہے

قرآن مجید میں ہے :

وَالشَّمْسُ تَجْرِىْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۔ (یٰس : ۳۸)

"اور سورج اپنے ٹھکانے کی سمت دوڑا چلا جا رہا ہے۔ یہ سب زبردست علیم ہستی کا باندھا ہُوا انصاب ہے۔"

پندرھویں صدی عیسوی میں پولینڈ کے ایک منجم نکولس کوپرنکس (Nicholas Copernicus) نے یہ اعلان کیا کہ سورج ساکن ہے اور زمین اس کے گرد چکر لگاتی ہے، اس سے دنیائے علم میں ایک بھونچال آگیا۔

جب دنیا نے کوپرنکس کے اس نظریہ کو ایک حقیقت سمجھ لیا تو عالمِ اسلام میں ایک اضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی، اس لیے کہ قرآن مجید سورج کو متحرک قرار دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد اٹھارہویں صدی عیسوی میں سر فریڈرک ولیم ہرشل Herschel نے یہ اعلان کیا کہ سورج متحرک ہے۔ اس کا قول ہے:

"The sun is travelling through space".

"سورج خلا میں سفر کر رہا ہے"۔

(لائف بلین، گریٹ ڈیزائن U.S.A ۱۹۳۲ء، ص ۲۴۔ دیکھیے حوالہ ۶: ۲۴)

سورج کس طرف سفر کر رہا ہے۔ کیلیفورنیا کی ایک رصدگاہ کے ڈائریکٹر آر۔ جی ایٹکن Aitken کا اندازہ یہ ہے کہ سورج اپنے نظامِ شمسی سمیت اپنی کہکشاں کے ساتھ چوبیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کسی نامعلوم منزل کی طرف جا رہا ہے (۶: ۲۴)۔ جدید ترین انکشاف جو سائنس نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ سورج مجمع النجوم شلیاق کی جانب کسی نامعلوم مرکز کی طرف نہایت تیزی سے بھاگا جا رہا ہے۔ اس مرکز کو سولر ایپکس کہا گیا ہے۔

ایک منجّم کہتا ہے کہ سورج میں بھی دو قسم کی حرکت پائی جاتی ہے ایک کہکشاں کے ہمراہ خلا میں اور دوسری مرکز کہکشاں کے گرد۔

یہاں ایک اہم بات قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ کوپرنکس کے نظریہ سے متاثر ہو کر قرآن مجید پہ طعن و تشنیع کرتے رہے یا اس کی صداقت کے بارے میں مبتلا ہو گئے، انہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ سائنس کا ہر نیا انکشاف اور ہر نظریہ اس قابل نہیں ہوتا کہ جہاں وہ دینِ حق کی کسی بات سے ٹکرایا تو فوراً دینِ حق کو چھوڑ دیا جائے اور اسے قبول کر لیا جائے۔ نظریات، نظریات ہی ہوتے ہیں اور یہ روزانہ بدلتے رہتے ہیں اور ان کی بنیاد پر دین کے حقائق کو متزلزل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہی حال آج کل اُن لوگوں کا ہے جو ڈارون کے نظریۂ ارتقاء پر ایمان رکھتے ہیں اور اسلام کے بارے میں یا معذرتیں پیش کرتے ہیں یا دین کی بعض باتوں کی تاویل کرتے ہیں۔ ان حضرات کو نظریے میں اور

حقیقت میں فرق محسوس کرنا چاہیے۔ نظریہ روزانہ بدلتا ہے اور حقیقت وہ چیز ہوتی ہے جس کے غلط ہونے کا امکان باقی نہیں رہتا۔

یہ کائنات توسیع پذیر ہے

قرآن مجید کا انکشاف

یہ کائنات ہر دم پھیل رہی ہے اور یہ بات جدید سائنس کی دریافت ہے۔

اس وقت یہ نہایت محکم تصور ہے کہ ایک کہکشاں دوسری کہکشاں سے دُور ہٹتی جا رہی ہے یعنی تمام کہکشائیں ایک دوسرے سے ہٹتی جا رہی ہیں اور اس طرح سے کائنات کی جسامت بڑھتی جا رہی ہے اور جس قدر کہکشائیں ایک دوسرے سے دُور ہٹیں گی اتنا ہی کائنات کے حجم میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ جب کہکشائیں ایک دوسرے سے ہٹ جاتی ہیں تو خالی جگہ میں نئی کہکشائیں بن جاتی ہیں۔

کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل جبکہ عربوں کے پاس کوئی بھی فلک بینی کا آلہ موجود نہیں تھا، قرآن نے ایسی بات کہہ دی جس کا انکشاف ۱۹۴۸ء کے بعد کوہ پیلومر کی ایک بہت بڑی دُوربین نے کیا، اور وہ یہ کہ یہ کائنات پھیل رہی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۔ (الذاریات: ۴۷)

"ہم نے آسمان کو اپنے ہاتھوں سے بنایا اور ہم اس میں توسیع کرتے رہیں گے۔"

یہ بات قرآن مجید کے وحیِ منزّل ہونے کا ایک قطعی ثبوت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے وجود کی ایک کھلی نشانی۔

زمین سکڑ رہی ہے:-

اس دَور کے سائنسدانوں کا نظریہ ہے کہ زمین کے حجم میں آہستہ آہستہ کمی پیدا ہو رہی ہے۔

فلکیات کے مشہور ماہر سر جیمز جینز (۱۸۷۷ء - ۱۹۴۶ء) کا خیال یہ ہے کہ "آغاز میں ایک بہت بڑا ستارہ سورج کے قریب سے گزرا۔ زورِ کشش سے سورج کا ایک ٹکڑا کٹ کر دور خلا میں گھومنے لگا اور زمین کہلایا۔ شروع میں زمین کا درجۂ حرارت وہی تھا جو سورج کا ہے پھر رفتہ زمین ٹھنڈی ہونے لگی اور اب تک ہو رہی ہے۔ جب یہ گرم تھی تو اس کا حجم زیادہ تھا۔ ٹھنڈی ہو جانے کے بعد یہ سکڑنے لگی اور سکڑتی چلی جا رہی ہے (۶ : ۴۲)

یہ بات آج سے ایک ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے لوگوں کے تصور میں نہیں آ سکتی تھی، لیکن قرآن مجید میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا " (الرّعد: ۴۱)

"کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو اطراف (باہر) سے سکیڑتے چلے جا رہے ہیں"۔

فرعونِ موسیٰ کی لاش کے بارے میں

قرآن مجید کی پیش گوئی

قرآنِ مجید میں یہ پیش گوئی کی گئی تھی کہ فرعونِ موسیٰ کی لاش کو دنیا بھر کے لیے عبرت کی خاطر محفوظ کر لیا جائے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا وَعَدْوًا حَتَّىٰ إِذَا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ آمَنْتُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا الَّذِي آمَنَتْ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۔ آلْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۔ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَغَافِلُونَ ۔ (یونس: ۹۰-۹۲)

"اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار لے گئے۔ پھر فرعون اور اس کے لشکر ظلم اور زیادتی کی غرض سے ان کے پیچھے چلے۔ حتیٰ کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا "میں نے مان لیا کہ

خداوندِ حقیقی اس کے سوا کوئی نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لاتے اور میں بھی سر اطاعت جُھکا دینے والوں میں سے ہوں" (جواب دیا گیا) "اب ایمان لاتا ہے! حالانکہ اس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت بنے اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں"۔

اس موضوع پر ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے مولانا سید ابُوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ سے خط و کتابت کی اور خود بھی تحقیق کی لکھتے ہیں :۔

"عہدِ رسالت میں عرب اقوامِ عالم کی تاریخ تہذیب، تمدن ان کے آثار اور عُلوم و فنون سے مطلقاً نا آشنا تھے۔ انہیں یہ قطعاً معلوم نہ تھا کہ فرعون کتنے تھے اور وہ کب سے مصر پر حکومت کر رہے تھے۔ رہی کُھدائیاں تو مصر میں ان کا آغاز پچھلی صدی (اُنیسویں) کے آخر میں ہوا تھا اور فرعونِ موسیٰ کی لاش ۱۹۰۷ء میں ایک انگریز مفتش سر گرافٹن سمتھ کی کوششوں سے برآمد ہوتی" (۶ : ۱۲۰)

مولانا سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودی ڈاکٹر صاحب کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں :

"برٹانیکا کے مضمون "ممی" میں ذکر ہے کہ ۱۹۰۶ء میں ایک انگریز ماہر علم و تشریح سر گرافٹن ایلیٹ سمتھ نے ممیوں کو کھول کھول کر ان کے حنوط کی تحقیق شروع کی تھی اور چوالیس ممیوں کا مشاہدہ کیا تھا۔ گولڈنگ لکھتا ہے کہ ۱۹۰۷ء میں سمتھ کو منفطہ کی لاش ملی تھی (یہ منفطہ وہی فرعون ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے زمانے میں غرق ہُوا) اس کی پٹیاں کھولی گئیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کے جسم پر نمک کی ایک تہہ جمی ہوئی تھی جو کسی اور ممی کے جسم پر نہیں پائی گئی۔ گولڈنگ یہ بات بیان کرتا ہے کہ فرعون بحیراتِ مرّہ میں غرق ہوا تھا جو اس زمانے میں بحیرۂ احمر سے ملی ہوئی تھیں۔ آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ جزیرہ نما سینا کے مغربی ساحل پر ایک پہاڑی ہے جسے مقامی لوگ جبلِ فرعون کہتے ہیں۔ اس پہاڑی کے نیچے ایک غار

میں نہایت گرم پانی کا ایک چشمہ ہے جسے لوگ حمامِ فرعون کہتے ہیں اور سینہ بہ سینہ روایات کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ اسی جگہ فرعون کی لاش ملی تھی۔

میں ان معلومات سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بحیراتِ مُرّہ میں ڈوبنے کے بعد اس کی لاش پھُول کر سطحِ سمندر پر تیرنے اور حمامِ فرعون تک پہنچنے میں کافی وقت لگا ہوگا جس کے دوران میں اس کے گوشت پوست میں سمندری پانی کا نمک جذب ہوگیا ہوگا۔ یہ نمک اس کی لاش کو حنوط کرتے وقت خارج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تین ہزار برس کے دوران میں یہ رفتہ رفتہ اس کے جسم سے خارج ہو کر ایک تہہ کی صورت میں جم گیا تھا اور پٹیاں کھولی گئیں تو یہ نمک اس پر جما ہوا پایا گیا۔" (۶ : ۱۲۲)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تمام اسرار جو جدید سائنس کو اس دور میں معلوم ہوئے قرآن مجید میں کس طرح سے بیان ہو گئے ؟ وہ کون ہے جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آج سے چودہ سو سال پہلے یہ باتیں بیان کر دیں جبکہ نہ دُور بینیں تھیں نہ خورد بینیں اور نہ سائنسی تحقیق و تفتیش کے آلات۔

ہر سمجھ دار انسان یہ بات اچھی طرح سے سمجھ سکتا ہے کہ یہ باتیں قرآن مجید میں انسانی تخیّل کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں بلکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ اور صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی ہے۔ وہ فرماتا ہے:

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الفرقان : ۶)

"اے نبی کہہ دیجیے، اسے اس ہستی نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہے۔"

یہ تمام حقائق جو سائنس کو آج معلوم ہوئے لیکن محمد رسُول اللہ کو ڈیڑھ ہزار سال قبل معلوم تھے اپنی اپنی جگہ پر حجّتِ قاطعہ ہیں اور اللہ تعالیٰ سبحانہ کے وجود کی کھُلی ہُوئی نشانیاں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر روشن دلائل ہیں۔ ایسے دلائل جن کا کوئی ہوشمند انسان انکار نہیں کر سکتا۔

کم سے کم مدّتِ حمل

جنین کی پیدائش کی مدّت نو ماہ شمار کی جاتی رہی ہے۔ مگر دَورِ جدید میں سائنسی تحقیقات نے

بیان کیا کہ بچہ ماں کے پیٹ میں چھ ماہ کی مدت گزارنے کے بعد صحیح وسالم پیدا ہو سکتا ہے اور اس کے بعد بقید حیات بھی رہ سکتا ہے۔ گویا جدید سائنسی نقطۂ نگاہ سے جنین کی پیدائش کے لیے کم سے کم مدت نو ماہ کی بجائے چھ ماہ ہے۔

اب آیئے دیکھیں کہیں یہی بات قرآن مجید نے بالکل صراحت کے ساتھ ڈیڑھ ہزار سال قبل بیان تو نہیں کر دی۔

تفسیر ابن کثیر میں ایک اہم واقعہ بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ایک صاحب سیّدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں شکایت لے کر آئے کہ اس کی شادی کو صرف چھ ماہ کی مدت ہوتی ہے اور اس کی بیوی کے ہاں لڑکا پیدا ہو گیا ہے۔ بیوی کو اصرار تھا کہ بچہ اس کے خاوند کا ہی ہے، حرامی نہیں ہے لیکن اس کا خاوند اور خود امیر المومنین عورت کی بات کے قائل نہ ہوتے۔ ابھی اس عورت کو سزا سنانے ہی والے تھے کہ سیّدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپہنچے اور انہوں نے از روئے قرآن فیصلہ دیا کہ بچہ عورت کے خاوند کا ہی ہے اور عورت کو باعزت بری کر دینا چاہیے۔

سیّدنا علی کرم اللہ وجہہٗ کا استدلال یہ تھا کہ اگر قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیتوں کو ملا کر پڑھا جائے تو ثابت ہو جاتا ہے کہ بچہ جنے کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے نہ کہ نو ماہ۔ وہ دو آیتیں یہ ہیں:-

۱۔ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا۔ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا۔ (الاحقاف۔۱۵)	”ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا۔ اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور تکلیف ہی سے جنا۔ اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا ڈھائی برس میں ہوتا ہے۔
۲ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ۔ (البقرہ:۲۳۳)	مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جو پوری مدت دودھ پلوانا چاہے۔

پہلی آیت سے معلوم ہُوا کہ حمل کی مدت اور دُودھ پلانے کی مدّت کا مجموعہ ڈھائی برس ہے۔
دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ دُودھ پلانے کی مکمل مدت دو برس ہے۔
حمل کی مدت خود بخود معلوم ہوگئی یعنی ڈھائی برس سے دو برس تفریق کر دیں یعنی چھ ماہ!

باب ۲۱

چند اہم پیشین گوئیاں جو پوری ہوئیں

زمانۂ قربِ قیامت سے متعلق چند ایسی پیش گوئیاں احادیثِ نبویہ میں ملتی ہیں جو آج سے چودہ سو سال قبل حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمائیں۔ اور آج کے دور میں حرف بحرف پوری ہوگئیں۔ اس بات کی توجیہ سوائے اس کے اور کیا ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک سچے رسُول نے اللہ تعالیٰ سے ان کا علم حاصل کیا اور انسانیت (خصوصاً آج کے دور کی نسلوں) کو ان اہم باتوں سے خبردار کردیا۔

اس اعتبار سے یہ سچّی پیش گوئیاں بیک وقت وجودِ باری تعالیٰ، محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت صادقہ اور آخرت کے برحق ہونے پر پختہ اور قطعی دلائل ہیں۔ ذیل میں ایسی چند احادیث صرف اُردو ترجمہ کے ساتھ نقل کی جاتی ہیں:۔

۱۔ عظیم و حیران کن اُمور در پیش ہونگے

قال علیہ الصّلوٰۃ والسّلام: لاتقوم السّاعۃ حتیٰ تروا امورا عظاما لم تکونوا ترونہا ولا تحدّثون بہا انفسکم، (رواہ نعیم بن حماد فی کتاب المشہور بکتاب الفتن من حدیث سمرۃ بن جندب ورواہ احمد البراز والطبرانی فی الکبیر)

" رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: اُس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک تم ایسے بڑے اُمور نہ دیکھ لو جن کو اب تم نہیں دیکھتے اور نہ ہی ان کا تصوّر تمہارے ذہنوں میں ہے"

(جدید سائنسی ترقی، انسان کی جانب سے تسخیرِ کائنات اور خلا نوردی کی طرف واضح اشارہ

ہے۔عجیب وغریب سائنسی ایجادات مثلاً سلکی نظام (ریڈیو۔ٹیلی وژن۔ٹیپ ریکارڈ وغیرہ) طب وجراحی کے جدید کمالات، اور زندگی کی دیگر حیران کُن سہولتیں بھی اسی ضمن میں آتی ہیں)۔

۲۔عظیم وبلند عمارتوں کی تعمیر وزیبائش

قال علیہ الصلوٰۃ والسّلام: "اذا رأیت الحفاۃ العراۃ العالۃ رعاء الشاء یتطاولون فی البنیان فانتظر الساعۃ۔ (رواہ البخاری ومسلم)

(وقال علیہ الصلوٰۃ والسّلام: "لا تقوم الساعۃ حتیٰ یقبض العلم وتکثر الزلازل ویتقارب الزمان، وتظہر الفتن وحتیٰ یتطاولوا الناس فی البنیان (رواہ البخاری فی صحیحہ عن ابی ھریرۃ)

"رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: جب آپ ننگے پاؤں، برہنہ جسم فقیر لوگ اور بکریوں کے چرواہوں کو دیکھیں کہ وہ بڑی بڑی عمارتوں کے بنانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے لگیں تو قیامت کا انتظار کرنا! اور فرمایا: قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک علم اُٹھا نہ لیا جائے، زلزلے کثرت سے ہوں، زمانہ مختصر ہو جائے، فتنے ظاہر ہو جائیں اور لوگ عمارتوں کے بنانے میں ایک دوسرے پر فخر کریں۔"

مُحدّثین کا کمالِ ایمان دیکھیے کہ اِس حدیث کو نسلاً بعد نسلٍ منتقل کرتے چلے گئے اور پُورے ساڑھے تیرہ سو سال تک اس میں بیت گئے تا آنکہ یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوگئی۔ آج سے صرف پچاس سال پہلے دُنیا کے کسی شہر کی تصویر دیکھیے اور اس کا مقابلہ جدید تعمیر شدہ شہر سے کیجیے۔یہ بات خاص عرب ممالک پر صادق آتی ہے جہاں پر بہت بڑی اور اونچی عمارتیں بنانے کی دھن واضح نظر آتی ہے۔ریاض کے قریب "الخرج" میں راقم نے ایک مکان کرایہ پر لیا بڑا خوبصورت مکان تھا۔مالک مکان چرواہا بھی تھا اور جب کرایہ لینے آتا تو اکثر ننگے پاؤں ہوتا۔صدق اللہ تعالیٰ وصدق الرسول الکریم صلّی اللہ علیہ وسلّم۔

وقال علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام: "من اعلام الساعۃ واشراطھا ان یعمر خراب الدیار ویخرب عمرانھا، (رواہ الطبرانی عن ابن مسعود و ابن عساکر عن محمد بن عطیۃ۔

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"قیامت کی علامتوں اور شرائط میں سے یہ ہے کہ اُجڑے ہُوئے گھر آباد ہو جائیں گے اور آبادیاں اُجڑ جائیں گی۔"

(دیہاتی لوگوں کا تیزی سے شہروں کی طرف منتقل ہونا مراد ہے بہت سی دیہاتی آبادیاں اُجڑ گئیں اور شہر میں وسعت پیدا ہو گئی اور غیر آباد جگہیں آباد ہو گئیں)

وقال علیہ الصّلوٰۃ والسّلام:

"ان من اعلام الساعۃ واشراطھا، ان تزخرف المحاریب وتخرب القلوب"

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"بے شک قیامت کی نشانیوں اور شرطوں میں سے یہ ہے کہ مسجدوں کی محرابوں کی زیبائش کی جائے گی اور دل ویران ہو جائیں گے۔"

۳۔ زمین کی طنابیں کھنچ جائیں گی

(سواریاں انتہائی تیز رفتار ہونگی)

قال علیہ الصّلوٰۃ والسّلام: لا تقوم الساعۃ حتّٰی یتقارب الزمان وتزوی الارض زیا، ای تطوی ویضم بعضھا الٰی بعض۔ (رواہ الطبرانی فی الکبیر من حدیث ابی موسیٰ الاشعری)۔

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"اس وقت تک قیامت قائم نہ ہو گی جب تک کہ زمانہ مختصر نہ ہو جائے اور زمین سکڑ

نہ جاتے" (زمین کی طنابیں کھنچ جائیں گی)

(پوری دُنیا ایک شہر کی طرح ہو کر رہ گئی ہے۔ مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہو رہا ہے۔ ایک برّاعظم سے دوسرے برّاعظم جانا بالکل اس طرح ہو گیا ہے جیسے کسی شہر کے ایک محلّے سے دوسرے محلّے کی طرف جانا ہو)

قال علیہ الصّلوٰۃ والسّلام :۔

" ولتترکن القلاص فلا یسعیٰ علیھا " (رواہ مسلم فی صحیحہ عن ابی ھریرہ)

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا :

"تم اونٹنیاں بالکل چھوڑ دو گے اور تیز رفتاری کے لیے ان پر سواری نہیں کرو گے (اونٹنیوں سے کہیں زیادہ تیز رفتار سواریاں میسّر آجائیں گی)۔

قال علیہ الصلوٰۃ والسلام " یکون فی آخر الزمان رجال یرکبون علی المیاثر حتی یاتون ابواب المساجد، رواہ احمد والحاکم عن ابن عمرو المیاثر: کما فسرھا عمر بن الخطاب ھی السروج العظام، وقال علیہ الصلوٰۃ والسّلام :

" سیکون فی آخر امّتی رجال یرکبون علی السروج کاشباہ الرحال ینزلون علی ابواب المساجد" رواہ احمد فی مسندہٖ والحاکم فی صحیحہٖ عن ابن عمر"

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا :

" آخری زمانے میں لوگ ہوں گے جو بڑی بڑی گدیوں پر سوار ہو کر مسجدوں کے دروازوں تک آپہنچا کریں گے "

اور فرمایا :

"عنقریب میری اُمّت کے آخری لوگوں میں ایسے آدمی ہوں گے جو گدیوں پر سوار ہوں گے گویا کہ وہ (اونٹوں کے) کجاوے ہیں اور مسجدوں کے دروازوں میں جا اُترا کریں گے "

(آج ہم اس صفت کو کاروں کی شکل میں دیکھ رہے ہیں جن کی سیٹیں بڑے بڑے کجاووں کی

طرح ہی ہیں جن پر لوگ سوار ہو کر مساجد کے دروازوں تک جا پہنچتے ہیں)۔

ولقد سُئل الرسول صلّی اللہ علیہ وسلّم عن سرعۃ سیر الدجال فی الارض؟ قلنا یا رسول اللہ وما اسراعہ فی الارض؟ قال: "کالغیث استدبرہ الریح" ای کسرعۃ السحب، الحدیث رواہ مسلم فی صحیحہ وغیرہ من حدیث النواس بن سمعان۔

"اور تحقیق رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے پُوچھا گیا کہ دجّال کتنی تیزی کے ساتھ ساری زمین میں گھوم جائے گا، ہم نے کہا یا رسول اللہ زمین میں اس کی کیا رفتارِ سفر ہوگی؟ تو آپ نے (جواباً) فرمایا "اس بادل کی طرح جسے (تیز) ہوا دھکیل رہی ہو یعنی جس طرح بادل تیز چلتے ہیں" (آواز سے بھی زیادہ تیز رفتار ہوائی جہازوں کی طرف اشارہ ہے)۔

۴۔ نطق الجماد: (بے جان اشیاء باتیں کرنے لگیں گی)

قال علیہ الصلوٰۃ والسّلام: "انما امارات من امارات بین یدی الساعۃ اوشک الرجل ان یخرج فلا یرجع حتی یحدثہ نعلاہ وسوط ما احدث اھلہ من بعدہ۔

"رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"قیامت کی نشانیوں میں ایک یہ ہے کہ آدمی اپنے گھر سے نکلے گا تو واپس نہ لوٹ پائے گا حتیٰ کہ اس کے جوتے اور چھڑی اسے وہ کچھ نہ بتا دیں جو اس کے (چلے جانے کے) بعد اس کے گھر والوں نے کیا ہوگا"

(ٹیپ ریکارڈر کی طرف اشارہ ہے یا شاید اس سے بھی زیادہ حیران کُن ایجادات ہوں گی)

۵ - علمی ترقی اور دین سے ناواقفیت

قال علیہ الصّلوٰۃ والسّلام:

"من اقتراب الساعۃ کثرۃ القراء، وقلۃ الفقہاء وکثرۃ الامراء وقلۃ الأمناء"

"رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "قیامت کے قریب قاری کثرت سے ہوں گے اور علماء کم ہوں گے۔ رؤسا زیادہ ہونگے اور امانتدار لوگ کم ہوں گے"

وقال علیہ الصلوٰۃ والسّلام: "ان من اشراط الساعۃ ان یظھر القلم"

(رواہ احمد والبزار والطبرانی وغیرھم عن ابن مسعود)

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ قلم کا استعمال بکثرت ہوگا" (اہلِ قلم زیادہ ہوں گے)

وقال علیہ الصلوٰۃ والسلام: "سیأتی علی اُمّتی زمان یکثر فیہ القراء ویقل فیہ الفقہاء ویقبض العلم ویکثر الھرج" (الحدیث رواہ الحاکم والطبرانی عن ابی ھریرۃ)

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:-

"عنقریب میری اُمّت پر ایسا وقت آئے گا کہ قاری زیادہ ہوں گے اور علماء کی قلت ہوگی علم اُٹھالیا جائے گا اور قتل وغارت عام ہوگی"

وقال علیہ الصلوٰۃ والسّلام: یکون فی آخر الزمان عباد جھال وقُرّاء فسقۃ" (رواہ ابونعیم فی الحلیۃ والحاکم عن انس)

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"آخری زمانہ میں جاہل عبادت گذار اور فاسق قراء (بکثرت) ہوں گے"

۶۔ تجارت میں وسعت

قال علیہ الصّلوٰۃ والسّلام: "ان بین یدی الساعۃ تسلیم الخاصۃ وفشو التجارۃ حتی تعین المرأۃ زوجھا علی التجارۃ وقطع الارحام وفشو القلم وظھور الشھادۃ بالزور وکتمان شھادۃ الحق" (رواہ احمد والحاکم وصححہ والبخاری عن ابن مسعود)

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:۔

"قیامت کے قریب خاص لوگوں کی بات مانی جائے گی، تجارت عام ہو جائے گی حتیٰ کہ عورت تجارت (کے معاملہ) میں اپنے خاوند کا ہاتھ بٹائے گی۔ قطع رحمی ہوگی۔ قلم کا استعمال بکثرت ہوگا، جھوٹی گواہی کا ظہور ہوگا اور سچّی گواہی چھپائی جائے گی۔"

۷۔ خواتین کی زیب وزینت

قال علیہ الصّلوٰۃ والسّلام: "یکون فی اٰخر الزمان رجال، یرکبون علی المیاثر حتیٰ یأتون ابواب المساجد نساؤھم کاسیات عاریات، علیٰ رؤوسھن کاسنمۃ البخت العجاف، العنوھن فانّھنّ ملعونات" (رواہ احمد والحاکم عن ابن عمر)

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا

"آخری زمانے میں ایسے لوگ ہونگے جو پُر شکوہ گدّیوں والی سواریوں پر سوار ہو کر مسجدوں کے دروازوں تک آیا کریں گے۔ ان کی عورتیں لباس کے باوجود برہنہ ہوں گی اور ان کے سروں پر بختی اونٹوں کے کوہان کی مانند (دوپٹے) ہونگے۔ ان پر لعنت بھیجو، وہ ملعون ہیں۔"

۱۴۔ علمائے حق کا باقی رہنا

وروی عن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ انّہ قال: "لا تزال طائفۃ من اُمّتی علی الحق ظاھرین لا یضرّھم من یخذلھم حتیٰ یأتی امر اللہ" (رواہ مسلم والترمذی وابوداؤد عن ثوبان)

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"میری اُمّت میں سے ایک چھوٹی سی جماعت حق پر ہمیشہ قائم رہے گی جو لوگ ان سے الگ ہو جائیں گے وہ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے یعنی قیامت قائم ہو جائے۔"

۱۵۔ یہُود کا تسلّط اور دجّال کا خرُوج

جاء فی الحدیث الّذی رواہ ابن اسحاق بن بشر وابن عساکر کما فی (کنز العمال) عن ابن عباس رضی اللہ عنہ انّ رسُول اللہ قال عن الدجال الیھودی: "وتکون اٰیۃ خروجۃ ترکھم للامر بالمعروف والنھی عن المنکر، وتھاونھم بالدماء اذا ضیعوا الحکم واکلوا الربا، وشیدوا البناء، وشربوا الخمر، واتخذوا القیان ولبسوا الحریر، واظھروا بزۃ آل فرعون، ونقضوا العھد وتفقھوا لغیر الدّین، وزینوا المساجد، وخربوا القلوب وقطعوا الارحام، وکثرت القُرّاء وقلت الفقھاء، وعطلت الحدود، وتشبہ الرجال بالنساء، والنساء بالرجال، وتکافی الرّجال بالرّجال والنساء بالنساء، بعث اللہ علیھم الدجال فسلط علیھم۔"

قال ابن عباس: قال رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم "فعند ذلک ینزل اخی عیسیٰ بن مریم، وینزل عیسیٰ علیہ السّلام۔ فی صف المسلمین المجاھدین

بغیرا سمہا (رواہ الحاکم فی المستدرک)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"بے شک میری اُمت کے لوگ شراب پیا کریں گے البتہ اُس کا نام بدل لیا کریں گے۔"

وقال علیہ الصلوٰۃ والسلام: "لا تقوم الساعۃ حتیٰ یتسافد الناس تسافد البہائم فی الطرق" (رواہ الطبرانی عن ابن عمرؓ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ لوگ جانوروں کی طرح سر بازار زنا نہ کریں گے۔"

وقال علیہ الصلوٰۃ والسلام: "لا تقوم الساعۃ حتیٰ توجد المرأۃ نہاراً تنکح وسط الطریق، لا ینکر ذلک احدٌ فیکون امثلھم یومئذٍ الذی یقول لو نحیتھا عن الطریق قلیلاً، اعاذنا اللہ من ھٰذا" (روی الحدیث الحاکم عن ابی ہُریرہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"اُس وقت تک قیامت برپا نہ ہوگی حتیٰ کہ عورت سے دن دہاڑے سر بازار زنا کیا جائے گا جسے کوئی بُرا نہ جانے گا اور ان میں سے سب سے بہتر انسان وہ متصور ہوگا جو ان سے یوں کہے گا: یہاں یہ کام اگر راستے سے ذرا ہٹ کر کر لیا ہوتا تو مناسب ہوتا۔ اللہ ہمیں اس صورتِ حال سے محفوظ رکھے۔"

(ناروے، سویڈن اور ڈنمارک جیسے ممالک میں بڑی بڑی شاہراہوں پر ایسے کلب موجود ہیں جہاں اُس قسم کے (live Show) بر سرِ عام ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف پارکوں میں اسی قسم کے بے حیائی کے مناظر دیکھے جا سکتے ہیں۔ راقم سطور خود بھی اس کا شاہد ہے)

وقال علیہ الصلوٰۃ والسّلام: "ان من اشراط الساعۃ ان یُرفع العلمُ ویکثر الجھل ویکثر الزنا ویکثر شرب الخمر" (الحدیث رواہ البخاری و مسلم، و

رُفِعَ العلمُ موت العلماء وكثرة الجهل: الجهل بالدين) "

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ علم اٹھا لیا جائیگا اور جہالت بڑھ جائے گی اور زنا زیادہ ہو جائے گا اور شراب بکثرت پی جائے گی" (علم کے اُٹھ جانے سے مُراد علماء کی موت ہے، جہالت کے بڑھنے سے مُراد دین سے جہالت کا ہونا ہے)

۱۰۔ سُودی کاروبار کا غُبار کی طرح پھیلنا

قال علیہ الصّلوٰۃ والسّلام: "لیأتینّ علی النّاس زمان لا یبقی منهم الا اکل الربا فمن لم یاکل اصابه من غبارة" (روی الحدیث ابوداؤد وابن ماجه والحاکم عن ابی هُریرة)

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"لوگوں پر ایک ایسا زمانہ ضرور آئے گا کہ ان میں سے ہر ایک سُود خور ہوگا اور جو نہ کھائے گا اسے بھی اس کی کچھ نہ کچھ گرد پہنچ جائے گی"

(دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کی طرف اشارہ ہے جس میں تجارت، صنعت اور زراعت کا کوئی کاروبار سُودی قرضوں کے بغیر نہیں چل سکتا)

۱۱۔ دل کے دَورے اور ناگہانی موت:

قال علیہ الصلاۃ والسّلام: "من اقتراب الساعة موت الفجاة" (رواہ ابن ابی شیبه عن الشعبی)

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"ناگہانی موت قیامت کے قرب کی علامت ہے"

(اِس بات کا آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آج سے پچاس سال قبل ناگہانی اموات یا ایسی امراض جو ناگہانی موت کا باعث ہوں، کس قدر تھیں اور آج کل کس قدر ہوگئی ہیں۔ یہ سب کچھ ہماری نگاہوں کے سامنے ہوگیا ہے۔ اچھے بھلے تنومند انسان دل کے دوروں کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہ بات پہلے

۱۲۔ کلام حسین اور اعمال بد:

قال علیہ الصّلوٰۃ والسّلام: "انّہٗ سیکون فی اُمّتی اختلاف وفرقۃ، قوم یحسنون القول ویسیٔون العمل" (رواہ ابوشعیب الحرانی فی فوائد، وابوداؤد والحاکم فی المستدرک من حدیث قتادۃ وانس وابی سعید ورواہ احمد وابوداؤد، وابن ماجہ والحاکم من حدیث انس وحدہٗ)۔

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:۔

"یقیناً میری اُمّت میں اختلاف اور فرقہ بازی ہوگی، ایسے لوگ ہونگے جن کی باتیں اچھی ہوں گی اور اعمال بُرے ہوں گے"

۱۳۔ جہاد بالسّیف کی مُعطّلی

روی عن رسُول اللہ انّہٗ قال: "من اشراط الساعۃ سوء الجوار وقطیعۃ الارحام، وان یعطل السیف من الجہاد" (رواہ ابن مردویہ عن ابی ھریرۃ وابونعیم فی تاریخ اصبہان)

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:۔

"قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ پڑوسیوں سے بدسلوکی ہوگی، رشتے ٹوٹ جائیں گے اور جہاد سے تلوار روک لی جائے گی"

۱۴۔ علمائے حق کا باقی رہنا

وروی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ انہ قال: "لا تزال طائفۃ من اُمتی علی الحق ظاھرین لا یضرھم من یخذلھم حتیٰ یأتی امر اللہ" (رواہ مسلم و الترمذی و ابوداؤد عن ثوبان)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میری اُمت میں سے ایک چھوٹی سی جماعت حق پر ہمیشہ قائم رہے گی جو لوگ ان سے الگ ہوجائیں گے وہ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے یعنی قیامت قائم ہوجائے"۔

۱۵۔ یہود کا تسلط اور دجال کا خروج

جاء فی الحدیث الذی رواہ ابن اسحاق بن بشر و ابن عساکر کما فی رکنز العمال) عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ قال عن الدجال الیھودی: "وتکون آیۃ خروجۃ ترکھم للامر بالمعروف والنھی عن المنکر، وتھاونھم بالدماء اذا ضیعوا الحکم واکلوا الربا، وشیدوا البناء، وشربوا الخمر، واتخذوا القیان ولبسوا الحریر، واظھروا بزۃ آل فرعون، ونقضوا العھد وتفقھوا لغیر الدین، وزینوا المساجد، وخربوا القلوب وقطعوا الارحام، وکثرت القُرّاء وقلت الفقھاء، وعطلت الحدود، وتشبہ الرجال بالنساء، والنساء بالرجال، وتکافی الرجال بالرجال والنساء بالنساء، بعث اللہ علیھم الدجال فسلط علیھم"۔

قال ابن عباس: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "فعند ذلک ینزل اخی عیسیٰ بن مریم، وینزل عیسیٰ علیہ السلام۔ فی صف المسلمین المجاھدین

الّذین یجاھدون الدجّال والیھود ویقاتلونھم، فیقتل الدجّال و یدخل الناس جمیعاً فی دین اللہ ولا یبقی علی وجہ الارض احد الا دخل الاسلام۔

وروی عن رسول اللہ انّہٗ قال: "لتقاتلن المشرکین حتیٰ یقاتل بقیتکم الدجّال علی نھر الاردن انتم شرقیّہ وھم غربیّۃ" قال راوی الحدیث: ولا ادری این الاردن یومئذٍ من الارض۔ رواہ البزار بسند حسن والطبرانی وابن مندہ فی الصحابی من حدیث نھیک ابن صریم السکونی۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہودی دجّال کے متعلق فرمایا کہ "اس کے ظاہر ہونے کی علامت یہ ہے کہ لوگ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو چھوڑ دیں گے، قتل وغارت کو معمولی بات خیال کریں گے، اور سُود خوری کریں گے، شاندار و پختہ عمارتیں بنائیں گے جبکہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ نہیں کریں گے۔ شراب پئیں گے گویّوں سے لُطف اندوز ہوں گے، ریشم پہنیں گے۔ آلِ فرعون کی زیبائش کا مظاہرہ کریں گے، عہد وپیمان توڑ ڈالیں گے غیر دینی علوم میں خوب دسترس حاصل کریں گے، مسجدوں کو خوب سجائیں گے، دلوں کو ویران کریں گے، قطع رحمی کریں گے، قاریوں کی بہتات ہوگی، علماء کم ہوجائیں گے، حدود اللہ معطّل کردی جائیں گی، مرد عورتوں کی مشابہت اور عورتیں مردوں کی مشابہت کریں گی، مرد مردوں کے ساتھ (دل لگی کرنے میں) کفایت کریں گے اور عورتیں عورتوں کے ساتھ کفایت کریں گی تو اس وقت اللہ تعالیٰ ان میں دجّال کو بھیجے گا اور اسے ان پر مسلّط کردے گا۔"

ابنِ عباس رضؓ نے کہا کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:۔

"ان حالات میں عیسیٰ علیہ السّلام کا نزول ہوگا وہ مسلمانوں کی صف میں اُتریں گے جو دجّال اور یہودیوں کے ساتھ جہاد ولڑائی کریں گے تو دجّال مارا جائے گا اور لوگ سب کے سب اللہ کے دین میں داخل ہوجائیں گے۔ رُوئے زمین پر ایک آدمی بھی ایسا نہ ہوگا جو اسلام میں داخل نہ ہوگا۔"

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے مروی ہے :

"تم ضرور مشرکین سے جنگ کروگے حتیٰ کہ تمہارے باقی ماندہ لوگ نہر اردن پر دجّال سے جنگ کریں گے، تم مشرقی جہت میں ہوگے اور وہ مغربی جہت میں ہوں گے۔"

راوی حدیث کہتے ہیں کہ معلوم نہیں اردن اس دن اس زمین کے کس خطہ پر ہوگا ؟

لقد روی عن رسول اللہ انہ قال بعد تحدثہ بعلامات خروج الدّجال :

"..... انما احدثکم ھٰذا لتعقلوہ وتفھموہ وتفقھوہ فاعملوا علیہ و حدثوا بہ من خلفکم، و لیحدث الآخر الآخر، فان فتنتہ اشد الفتن، روی الحدیث نعیم ورواہ الحاکم فی المستدرک۔"

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دجّال کے متعلق بتانے کے بعد فرمایا :

"مَیں یہ سب کچھ تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں تاکہ تمہیں اس کی صحیح معرفت نصیب ہوجائے اور اس کا فتنہ اچھی طرح سمجھ آجائے اور اصل صورتِ حال کا پہلے سے اندازہ ہو تاکہ صحیح وقت پر صحیح تدبیر کر سکو اور آنے والی نسلوں کو متنبّہ کر سکو اور وہ آگے نسل کو ایک دوسرے کو بتائیں کیونکہ اس کا فتنہ سب فتنوں سے شدید تر ہوگا۔"

حصّہ پنجم

کائنات کا تصوّرِ جدید

— سائنسی نظریات اور حقائقِ ثابتہ میں فرق ،

— حرکیاتِ حرارت کا دوسرا قانون اور کائنات کا نقطۂ آغاز ،

— کائنات کے بارے میں جدید سائنسی تصوّر اور اثباتِ توحید ،

— اَن دیکھی دُنیا۔ (ایٹم ، ہوا ، درد ، کششِ ثقل ، ریڈیائی لہریں ، جذبات ، (منطقی اثباتیت اور ایمان بالغیب ، نظریاخبر)

— دانشِ اعلیٰ (حقیقتِ حیات ، وحدت و دانش ، جبلّت)

— لیمارک اور ڈارون کا نظریہ اور ارتقاء (جنین کا جسمانی نظام ، ناک کا عمل حقیقتِ ارتقاء)

— فلسفۂ مادیّت

مادیّت کے دو روپ ۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت

سرمایہ دارانہ نظام ، اشتراکی نظام اور اسلام کا معتدلانہ نظام ۔ مادیّت کی شکست ۔

باب ۲۲

سائنسی نظریات اور حقائقِ ثابتہ میں فرق

مشہور سائنسدان جارج گیمو کا خیال ہے کہ یہ کائنات آج سے لاکھوں سال پہلے ایک جمع شدہ اور سمٹے ہوتے مواد کی صورت میں تھی، یہ مواد ایک تودہ یا قرآنی اصطلاح میں رتق Patch تھا کہ اچانک ایک دھماکہ ہوا اور اس تودے کے آتشیں ٹکڑے فضا میں برابر منتشر ہوتے چلے گئے اور اسی وقت سے انتشار کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ ٹکڑے ایک دوسرے سے بعید تر ہوتے جا رہے اور اس طرح سے کائنات کی وسعت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

جارج گیمو ہی نہیں بلکہ دورِ جدید کے قریب قریب تمام سائنس دانوں کا یہی نقطۂ نظر ہے۔ سائنس دان اپنے اس نقطۂ نظر پر کب تک قائم رہتے ہیں اور کب اپنی رائے بدل لیتے ہیں، یہ ہمارے لیے اہم نہیں۔ انیسویں صدی تک سائنسدان کوپرنیکس کے نظریہ کو درست سمجھتے رہے اور ان کے نزدیک سورج بالکل ساکن تھا۔ اس کے بعد ہرشل کے آنے سے نہ صرف سورج بلکہ نظام ہائے شمسی متحرک نظر آنے لگے۔ اگر آج پھر سائنس دانوں کا ایک گروہ سورج یا نظام ہائے شمسی کو ساکن کو ساکن قرار دے دے تو حقائق کی واقعیت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا اور نہ ہی قرآن مجید میں بیان کردہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر متزلزل ہو گی کہ

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ۔ (یٰس۔ ۳۸)	"سورج اپنے مستقر (ٹھکانے) کی جانب رواں ہے یہ ایک زبردست اور عظیم حکمت والے کا بنایا ہوا نظام ہے۔"

اہم بات یہ ہے کہ سائنس یا فلسفہ کے وہ نظریات جن میں اٹکل پچو اور ظن و تخمین کو دخل ہے،

وہ روز روز بدلتے رہتے ہیں لیکن حقائق اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ قرآن مجید وحی الٰہی ہے، اس میں حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ اگر آج کے دَور میں سائنسدان اپنے نظریات میں قرآنی حقائق سے قریب تر آرہے ہیں تو یہ قرآن مجید کی صداقت کا ثبوت نہیں بلکہ یہ سائنس دانوں کی صداقت پہ دلیل ہے، انہیں شاباش ملنی چاہیے۔ قرآن مجید بلکہ تمام الٰہیات ہماری داد و تحسین کے محتاج نہیں ہیں۔ یہ تو وہیں رہیں گے جہاں یہ ڈیڑھ ہزار سال قبل تھے۔ حکماء اور سائنسدانوں کی عقلوں پر پردے پڑیں یا یہ پردے کچھ سرک جائیں، حقائق قرآنیہ اور صداقتِ ایمانیات میں کچھ فرق نہیں پڑے گا۔

ہزاروں بار رہا دل بجلیوں کے ہم کاب آئے
مگر زندہ و پائندہ ہے شاخِ آشیاں اپنی

زیادہ دُور کی بات نہیں۔ ۱۹۵۴ء میں ایک ہائی اسکول میں سائنس ماسٹر صاحب ہمیں قانون بقائے مادہ پڑھا رہے تھے۔ مادہ کے بقا پر آسمان سائنس اور بلندیٔ عقل پر فائز گفتگو فرما رہے تھے۔ میرے مُنہ سے یہ بات نکل گئی کہ "ماسٹر صاحب اگر مادہ صرف صورت بدلتا ہے اور کبھی فنا نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا تو پھر ہمارا قیامت پر ایمان تو گیا۔"

فرمانے لگے "اگر تمہارا ایمان سائنس کے حقائق کے سامنے نہیں ٹھہر پاتا تو اسے جانے دو۔"

مَیں نے اپنی کم علمی کے باوجود پھر عرض کیا:

"مادہ کو کب سے بقا حاصل ہے؟"

فرمانے لگے: "ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی"

مَیں نے عرض کی: "جناب تو اسے اللہ تعالیٰ نے کبھی پیدا نہیں کیا؟"

اب ماسٹر صاحب تھوڑی دیر تو پریشان ہوتے، پھر زیرِ لب مُسکرا کر مجھے یوں دیکھا گویا میں سائنس لیبارٹری میں داخل ہونے کے لائق نہ تھا۔ آخر کہہ ہی دیا:

"مسٹر مرتضیٰ! مَیں عقائد کے موضوع پر تو بات نہیں کرتا لیکن قانون بقائے مادہ کی رُو سے مادہ

کے پیدا ہونے یا اسے پیدا کرنے والے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

یہ سائنس ماسٹر صاحب بظاہر مسلمان بھی تھے اور سید و ہاشمی کی اولاد بھی، لیکن قانون بقائے مادہ کے ایک جھٹکے سے ان کے ایمان و اسلام بھرشٹ ہو گئے اور ایسے جہل در جہل کا شکار ہوئے کہ وجودِ خالق اور عملِ تخلیق پر ایمان رکھنے والے ان کی نظر میں احمق و جاہل ٹھہرے۔

اب اگر وہ شاہ صاحب (سائنس ماسٹر صاحب) مجھے کہیں مل جائیں (خدا کرے میری یہ سطور اُن تک پہنچ جائیں)، تو ان سے پوچھوں کہ شاہ جی وہ آپ کا "قانونِ بقائے مادّہ" کدھر گیا؟ وہ تو داستانِ پارینہ بن کر رہ گیا۔ اب دنیائے علم میں اس پر یقین کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ اب مادہ توانائی میں تبدیل ہو رہا ہے اور توانائی مادہ میں، اور یہ دونوں مجموعی طور پر ایسے انجام کو پہنچ رہے ہیں کہ نہ وہ رہے گا اور نہ وہ۔

اصل خرابی یہ ہے کہ لوگ حقائق ثابتہ اور نظریات میں صحیح فرق قائم نہیں رکھتے۔ نظریات جن کی بنیاد میں سائنسی تحقیق کے ساتھ ساتھ ظن و تخمین، اٹکل پچو اور ٹامک ٹوئیاں شامل ہوتی ہیں، اس سچائی کی حامل نہیں ہوتیں جو سچائی محض سائنسی تحقیق پر مبنی حقائق ثابتہ میں ہوتی ہے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ قرآن و حدیث میں بیان کردہ کوئی بات سائنسی تحقیق اور سائنس کے حقائق ثابتہ سے نہیں ٹکراتی۔ اگر کبھی اختلاف ہُوا ہے تو سائنسی نظریات سے ہُوا ہے جو روز اپنا قبلۂ نظر بدلتے رہتے ہیں۔ اس کی بہترین مثالیں قانون بقائے مادہ اور ڈاروِن کا نظریۂ ارتقاء ہیں۔ قرآن مجید میں بار بار ظن و تخمین کی مخالفت اور بُرہانِ قطعی کی حمایت کی گئی ہے یا علمِ قطعی کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔

ذیل کی آیات پر غور فرمائیں:۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔ (الاسراء: ۳۶)

"اور جس بات کی تجھ کو تحقیق نہ ہو اس پر عمل درآمد مت کیا کر، کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب کی (قیامت کے دن) پوچھ گچھ ہو گی۔"

"اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا" (النجم: ۲۸)

"صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں اور یقیناً بے اصل خیالات امر حق (کے اثبات) میں ذرا بھی سفید نہیں ہوتے۔"

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ (البقرۃ ۱۱۱)

"آپ کہیے کہ (اچھا) تم (ان کے استحقاق عبادت پر) اپنی دلیل پیش کرو اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو۔"

اِیْتُوْنِیْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ (الاحقاف: ۴)

"میرے پاس کوئی کتاب جو اس سے پہلے کی ہو یا کوئی اور مضمون منقول لاؤ اگر تم سچے ہو۔"

اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۔ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى" (النجم: ۲۳)

"(بلکہ) یہ لوگ صرف بے اصل خیالات اور اپنے نفس کی خواہش پر چل رہے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے (بواسطہ رسول) ہدایت آچکی ہے۔

کائنات کے حادث ہونے کے بارے میں ہم گذشتہ صفحات میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں اور بہت سے معروف سائنسدانوں کی تحریروں سے اقتباس پیش کر چکے ہیں۔ اب ہم حرکیات حرارت کے دوسرے قانون کی کچھ مزید تشریح کریں گے۔

حرکیاتِ حرارت کا دوسرا قانون اور کائنات کا نقطۂ آغاز:-

حرکیاتِ حرارت کا دوسرا قانون صرف اتنی سیدھی سی بات کہتا ہے کہ حرارت صرف ایک ہی سمت میں منتقل ہوتی ہے اور وہ یوں کہ زیادہ گرم شئے کی طرف سے کم گرم شئے کی طرف۔ انتقال حرارت کم گرم شے سے زیادہ گرم شئے کی طرف نہیں ہوسکتا۔

جی ہے۔ وان وائلن اپنی کتاب Fundamentals of classical thermo dynamics میں اس کی مثال یُوں دیتے ہیں کہ قہوہ کے گرم کپ میں جو گرمی موجود ہے وہ آہستہ آہستہ کمرے کے کم درجۂ حرارت کی جانب منتقل ہوتی ہے اور اس وقت تک منتقل ہوتی رہتی ہے جب تک قہوہ اور کمرہ کا درجۂ حرارت بالکل ایک جیسا نہیں ہو جاتا۔ جس وقت قہوہ اور کمرہ کے درجۂ حرارت ایک درجہ پر آجائیں گے اس وقت انتقالِ حرارت کا عمل ختم ہو جائے گا۔

مطلب یہ ہُوا کہ حرارت میں یہ رُجحان پایا جاتا ہے، وہ منتقل ہوتی ہے اور کم گرم اشیاء کی طرف منتقل ہو کر پھیلتی ہے اور بالآخر سب اشیاء کو اپنے درجۂ حرارت سے قریب تر لاتی ہے اور خود اپنی حرارت ان کی طرف منتقل کر کے ان سے قریب تر ہو جاتی ہے اور بالآخر جانبین کا درجۂ حرارت بالکل برابر ہو جاتا ہے اور حرارت کی حرکت یا انتقال کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔

حرارت کا یہی عمل پُوری کائنات میں جاری ہے۔ کائنات میں بعض اشیاء (مثلاً سُورج) مستقل طور پر حرارت منتقل کر رہے ہیں معلوم ہُوا کہ قہوے کے کپ کی طرح آہستہ آہستہ ان کی ساری حرارت کائنات کی دیگر اشیاء کی طرف منتقل ہو کر پوری کائنات کا درجۂ حرارت ایک جیسا ہو جائے گا۔ اس وقت حرارت کے انتقال کے عمل میں پُوری کائنات ختم ہو جائے گی۔ ہر قسم کی حرکت، انتقال، تخلیقی عمل، اور ہر قسم کی سرگرمی ختم ہو جائے گی اور یہ اس کائنات کا نقطۂ انجام ہو گا۔

اس سے یہ بات بھی اصولی طور پر معلوم ہُوئی کہ کائنات کی ساری موجود حرارات جو اس وقت پھیل چکی ہے اور پھیل رہی ہے، آج سے لاکھوں سال پہلے ضرور کسی ایک ہی نقطہ پر مرکوز ہو گی جہاں سے یہ پھیلنا شروع ہوئی۔ یہی نقطہ اس کائنات کا نقطۂ آغاز ہونا چاہیے۔

تو اس طرح سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کا لازماً ایک نقطۂ آغاز ہے اور ایک نقطۂ انجام۔ اوّل الذکر کا تعلق اس وقت سے ہے جب کہ کائنات کا جمع شدہ Concentrated مواد، یا تودہ یا رتق اچانک کسی دھماکہ سے پھٹا اور اس نے پُوری کائنات میں کواکب بکھیر دئیے اور یُوں انتقالِ حرارت کا عمل شروع ہو گیا۔

مختلف نظام ہائے شمسی میں موجود کواکب کے اندر مستقل طور پر دھماکے ہو رہے ہیں اور ان دھماکوں کے نتیجے میں شدید حرارت پیدا ہو کر کائنات میں پھیل رہی ہے۔ اب حرکیات حرارت کے دوسرے قانون کی رُو سے ایک وقت لازماً ایسا آنا چاہیے جب کواکب کے اندر مزید دھماکوں اور پیدائش حرارت کی سکت باقی نہ رہے، ان کی گرمی منتقل ہوتے ہوتے پوری کائنات کے درجۂ حرارت کے برابر ہو جاتے اور کائنات کی سرگرمی بالکل ختم ہو کر رہ جائے۔ یہ اس دنیا کا عملاً خاتمہ ہو گا۔

یہ تو تھا جدید سائنس کا نقطۂ نظر یعنی یہ کہ

۱۔ کائنات شروع میں ایک تودہ اور جمع شُدہ مواد تھا۔

۲۔ اچانک دھماکہ سے پھٹ گئی اور نظام ہائے شمسی اور کواکب وجود میں آ گئے۔

۳۔ یہ نظام ہائے شمسی اور کواکب ایک دوسرے سے دُور ہٹ رہے ہیں اور کائنات پھیل رہی ہے۔

ہر چند کہ یہ نقطۂ نظر قرآنی نقطۂ نظر سے بہت قریب ہے لیکن اس کے باوجود غیر مکمل، ناقص اور بے روح۔ اب آیئے قرآن مجید کا نقطۂ نظر دیکھیں اور معاملہ عقلِ سلیم کے حوالے کر دیں۔ خود ہی فیصلہ ہو جائے گا کہ کونسا نقطۂ نظر زیادہ با ربط، معقول اور معنی خیز ہے۔

سائنس نے کہا کہ "اچانک دھماکہ ہو گیا" قرآن کہتا ہے کہ یہ دھماکہ ہم نے خود کیا اور بہت تاریک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت ـــــ ایسا منصوبہ جو کروڑہا کروڑ سال بغیر کسی نقصان و حادثہ کے رُو بہ عمل رہے۔

سائنس نے کہا کہ کواکب ایک دوسرے سے دُور ہٹ رہے ہیں اور کائنات وسیع تر ہو رہی ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ ان کواکب اور ان کے نظام ہائے شمسی کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا ہے اور ہم خود کائنات کو وسعت دیتے چلے جا رہے ہیں۔ ہر ستارہ اپنے اپنے مدار پر بے کھٹکے چل رہا ہے۔ یہ سب کچھ کسی اتفاق و حادثہ کا نتیجہ نہیں ہے کہ ایک زبردست، مُدبّر اور صاحبِ حکمت کا منصوبہ ہے جس کے سامنے پوری کائنات مطیع و منقاد ہے اور اس کے مطابق عمل کرنے پر طوعاً و کرہاً مجبورِ محض۔ سائنس اشیاء اور واقعات کی جس قدر توجیہ کرے، کہیں نہ کہیں مادّہ کو سببِ حقیقی قرار دے دیتی ہے

اور واقعات کی توجیہ کا رُخ مادّہ کی طرف پھیر دیتی ہے۔ ہر چند کہ دَورِ جدید کے سائنسدان واقعات میں علّت و معلول کا رشتہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہ کہنے لگے ہیں کہ ہر عمل کے پس پردہ صانعِ حقیقی کا ہاتھ نظر آتا ہے لیکن کئی جگہ ان کا یہ نظریہ پھیلی ہوئی مادیّت کے دھندلکوں میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس قرآنِ مجید میں ہر چیز کا سببِ حقیقی ایک ذاتِ باری تعالیٰ کو قرار دیا گیا ہے۔ اسی کا ارادہ، اسی کا ایک لفظ "کُن" ہر تخلیق کا راز ہے۔

اب درجِ ذیل آیات کو غور سے پڑھ لیں اور بغیر کسی تعصّب کے دل ہی دل میں خود ہی فیصلہ کر لیں کہ کون سا نقطۂ نظر قرینِ صواب ہے، وہ کونسی بات ہے جسے عقلِ سلیم بغیر چون و چرا کے قبول کرتی ہے اور جس پہ دل خود بخود ڈھلکتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ۔ (الذّاریات: ۴۷)

"آسمانوں کو ہم ہی نے ہاتھوں سے بنایا اور ہم (اس کو) وسعت دینے والے ہیں"

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ (یٰسٓ: ۸۲، ۸۳)

"اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ وہ (ذات) پاک ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹ جانا ہے"

اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا۔ (الانبیاء: ۳۰)

"آسمان اور زمین ایک ڈھیر تھے، پھر ہم نے انہیں پھاڑ دیا"

باب ۲۳

کائنات کا جدید سائنسی تصوّر اور اثباتِ توحید

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

"عالم کے حادث یا قدیم ہونے کی بحث جو ایک مدّتِ دراز سے دہریوں اور خدا پرستوں کے درمیان چلی آ رہی تھی، اب جدید سائنس نے اس کا قریب قریب حتمی فیصلہ ہی خدا پرستوں کے حق میں کر دیا ہے۔ اور دہریوں کے لیے مادّے کو ازلی اور ابدی قرار دینے کی مشکل ہی سے کوئی گنجائش باقی رہ گئی ہے۔ پرانی مادہ پرستی کا سارا انحصار اس دعوے پر تھا کہ مادّہ فنا نہیں ہو سکتا، اس کی صرف صورت بدلی جا سکتی ہے مگر ہر تغیّر کے بعد مادہ مادہ ہی رہتا ہے اور اس کی مقدار میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جاتا تھا کہ عالم میں مادّے کی ابتدا اور انتہا نہیں ہے لیکن اب جوہری توانائی Atomic Energy نے اس پورے تخیّل کی بساط الٹ دی ہے۔ اب مادّہ قوت میں تبدیل ہوتا ہے اور قوّت مادّے میں۔ اب حرکیاتِ حرارت Thermo dynamics کے دوسرے قانون نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ مادّی عالم نہ ازلی ہو سکتا ہے اور نہ ابدی اس کو لازماً ایک وقت شروع اور ایک وقت ختم ہونا چاہیے۔ اب مختلف علومِ طبیعی کی شہادتوں سے کائنات کا ایک وقتِ آغاز متعیّن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پھر کائنات کا جو نظریہ آج کل زیادہ تر مقبول ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہ کائنات یک لخت ایک ہی تخلیقی انفجار Explosion سے وجود میں آئی تھی نہ کہ کسی طویل تدریجی عمل سے۔ اس کا مادّہ تخلیق کیا انتہائی کثافت اور انتہائی حرارت کی حالت میں تھا اور ابھی اس کی عمر پانچ منٹ کی تھی کہ ایک عظیم انفجار سے وہ پھٹی۔ تیس منٹ کے اندر اندر تمام کیمیاوی عناصر

پیدا ہو گئے اور پھر مادّے سے بے شمار فلکی نظام بنے۔ یہ گویا موجودہ سائنس کی زبان سے قرآن کے ارشادات کی تفسیر ہو رہی ہے، جن میں فرمایا گیا ہے:

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ۔ (النحل: ۴۰)

"ہم جس چیز کا ارادہ کرتے ہیں اُس کے لیے ہمیں بس یہ کہنا ہوتا ہے کہ ہو جا! اور بس وہ ہو جاتی ہے۔"

أَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا۔ (الانبیاء: ۳۰)

"آسمان اور زمین ایک ڈھیر تھے، پھر ہم نے انہیں پھاڑ دیا۔"

موجودہ سائنس نے دہریت اور مادہ پرستی کے ساتھ ساتھ شرک کی بھی پوری طرح کمر توڑ دی ہے۔ آج یہ ثابت ہو گیا ہے کہ پوری کائنات ایک ہی مادے سے بنی ہے اور ایک طرح کے قوانین اس میں کارفرما ہیں۔ یہ عظیم کارگہ ہستی جس میں کم از کم ایک لاکھ نظامِ فلکی Galaxies پائے جاتے ہیں اور جس کے صرف ایک نظام میں ہمارے سورج جیسے ایک ارب سورج اپنے اپنے نظامِ شمسی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کے عناصر ترکیبی سب جگہ یکساں ہیں اور وہ وہی عناصر ہیں جن سے ہماری زمین اور اس کی مخلوقات بنی ہیں، آج بعید ترین تاروں کا بھی جو مشاہدہ کیا گیا ہے اس میں وہ عناصر پہچانے گئے ہیں جو ہماری زمین پر عام ہیں اور قوانینِ فطرت کی عالمگیری ہی انسان کو اس قابل بنا رہی ہے کہ وہ زمین سے اُٹھ کر فضائے بسیط میں جائے اور دوسرے سیّاروں پر پہنچنے کے لیے نقشے سوچ سکے۔ ان معلومات نے اس وہم و گمان کے لیے بھی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی کہ یہ کائنات مختلف خداؤں کے درمیان بٹی ہوئی ہے۔ آج یہ بات کھل گئی ہے کہ

هُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلٰهٌ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ۔ (الزخرف: ۸۴)

"وہی ایک آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی اور وہی ایک حکیم و علیم ہے۔"

"وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْأَرْضِ (الانعام: ۳)

"اور وہی اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور زمینوں بھی ہے" (۳ : ۷۰)

وجود باری تعالیٰ اور پھر توحید کا کھلا کھلا ثبوت اس کائنات میں نظام کی وحدت ہے۔ چھوٹی سی چھوٹی شے سے لے کر بڑی سے بڑی چیز جسے بھی دیکھیے ایک ہی نظام اور ایک ہی بندھن حتیٰ کہ حرکت کی ایک ہی شکل میں پروئی ہوئی ہے۔

ایٹم کو دیکھیے۔ اس کا الیکٹرون گھڑی کی سوئی کی حرکت کے برعکس Anti-Clock-wise گھومتا ہے یعنی اُوپر کی جانب دائیں سے بائیں کی طرف حرکت کرتا ہے۔ زمین بھی اسی طرح انٹی کلاک وائز طرز پر گھومتی ہے۔ سورج بھی گھڑی کی سوئیوں کے برعکس حرکت کرتا ہے۔ بالکل اسی طرز پر چاند بھی اور دوسرے اقمار بھی اسی طرح Anti-Clock-wise حرکت کرتے ہیں۔ پھر دیگر سب سیارگان، ان کا مجموعہ کبریٰ، نظامِ شمسی سب کے سب اسی انداز پر حرکت کر رہے ہیں۔

اور دیکھیے، ایٹم میں الیکٹرون بیضوی (انڈے کی طرح) اہلیلجی طرز پر حرکت کرتا ہے۔ زمین سورج کے گرد بیضوی طرز پر چکر لگاتی ہے۔ بالکل اسی طرح سے زہرہ، نیپٹون، مشتری اور دیگر تمام سیارگان اسی طرح بیضوی (Oval) اہلیلجی طرز پر چکر لگاتے ہیں۔

زمین کا محور سیدھا نہیں ہے، جھکا ہوا ہے (۲۳½ کے زاویہ پر مائل ہے)۔ چاند کا محور بھی جھکا ہوا ہے۔ مریخ کا محور بھی جھکا ہوا ہے، خود سورج کا محور بھی جھکا ہوا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اسی نسبتِ زاویہ سے ایٹم کے اندر بھی نیوٹران اور الیکٹرون کے مابین وہی نسبت ہے جو سورج اور اس کے گرد چکر لگانے والے سیارگان کے مابین نسبت پائی جاتی ہے۔

پھر دیکھیے کہ دنیا میں موجود تمام ذرات، تمام ایٹم ایک زوجیت (جوڑا جوڑا ہونا) پر قائم ہیں۔ ایٹموں میں مثبت اور منفی برقپارے پائے جاتے ہیں۔ غرضیکہ دنیا کی ہر چیز منفی اور مثبت برقپاروں کی زوجیت کا مظہر ہے۔ نباتات کی طرف آئیے تو دورِ جدید میں پتہ چلا ہے کہ یہاں بھی مادہ و نر کی زوجیت موجود ہے۔ حیوانوں میں، انسانوں میں، حتیٰ کہ انسانوں کی تیسری جنس مخنثوں میں بھی نر اعضائے تناسل اور مادہ اعضائے تناسل صاف نظر آتے ہیں:

سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا "پاک ہے وہ ذات جس نے تمام مقابل قسموں
مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ کو پیدا کیا نباتاتِ زمین کے قبیل سے بھی اور
وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ (یٰسٓ : ۳۶) (خود) ان آدمیوں سے بھی اور ان چیزوں میں
سے بھی جن کو (عام لوگ) نہیں جانتے۔

اسی طرح سے پوری زمین میں، سورج میں، تمام ستاروں میں یہی زوجیت، یہی الیکٹرون اور پرٹون کی زوجیت اور نیوٹرون جیسے مرکزے کا وجود پایا جاتا ہے۔

کیا یہ وحدتِ نظام اس بات کی کھلی کھلی شہادت نہیں کہ اس کائنات کا ایک ہی خالق ایک ہی مالک و منتظم اور ایک ہی ربِّ ذوالجلال ہے۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

رابرٹ گرانٹ اٹیلکن اے بی، اے ایم۔ ایس سی ڈی اپنے مضمون "ستاروں کی دنیا میں" لکھتے ہیں:۔

اُن صدیوں کا پرنکیس کے پیش کردہ تصوّرِ کائنات میں مزید وسعت پیدا ہوتی۔ اس وسعت میں ابھی تک اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اس کی انتہا کہیں نظر نہیں آتی۔

دُوربین سے معلوم ہُوا ہے کہ سُورج، مشتری اور دیگر سیّارے زمین کی طرح اپنے محور پر بھی گھُوم رہے ہیں۔ ۱۶۸۸ء میں انگلستان کے ایک منجم ایڈمنڈ ہیلی[1] Edmund Halley نے ثابت کیا کہ کچھ یا تمام ستارے آسمان میں اپنی پوزیشن بدل رہے ہیں، ساکن نہیں ہیں، بلکہ تیزی سے حرکت کر رہے ہیں۔ سو سال بعد ہرشَل نے اعلان کیا کہ سُورج بھی خلا میں محوِ سفر ہے۔ اور اُس کا راستہ ستاروں کے دو جھرمٹوں لیترا اور ہرقلیس کے قریب سے گزر رہا ہے۔ تازہ مشاہدات سے ہرشَل کی تائید ہوتی ہے۔

کائنات کا وہ قدیم تصوّر، کہ اس کے مرکز میں ایک تنگ سی زمین یا سُورج ہے۔ ختم ہو

---

[1] ایڈمنڈ ہیلی (۱۶۵۶-۱۷۴۲ء) برطانوی منجم نیوٹن کا ساتھی۔

چکا ہے اور اس کی جگہ ایک غیر محدود یا غیر معین کائنات کے تصور نے لی ہے جس کا ہر نقطہ غیر معمولی رفتار سے محو پرواز ہے۔ ہماری زمین نہ صرف اپنے محور اور مدار پر گھوم رہی ہے بلکہ سورج کے ہمراہ ستاروں کی دنیا میں بخطِ مستقیم بھی سفر کر رہی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص خلا میں ایک نہایت پیچیدہ راستے پر جا رہا ہے۔ ہماری زمین بیک وقت تین سفر کر رہی ہے۔ اوّل، ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے محوری گردش۔ دوم اڑسٹھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مداری گردش۔ سوم چوالیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کے ہمراہ سفر۔

اس رفتار کا اندازہ ہم ستاروں کی اُن باقاعدہ یا بے قاعدہ بدلتی ہوئی پوزیشن سے لگاتے ہیں۔ جنہیں صرف دُوربین دیکھ سکتی ہے۔ اگر اس رفتار کو ہماری آنکھ دیکھ پاتے تو بڑے سے بڑے شیر دل کا پتہ بھی آب ہو جاتے۔ اور اُس کی عقل چکرا جاتے۔ سورج کے علاوہ باقی ستارے اور اُن کے چاند بھی اسی رفتار سے خلا میں محوِ سفر ہیں۔ اور جب ہم ستاروں کی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس تیزی و تندی کے باوجود ان کی رفتار میں وہ توازن، ہم آہنگی اور آئین کی پابندی ہے کہ جُوں جُوں ہم اپنے مشاہدات کا تجزیہ کرتے ہیں تو نظم و نسق کی ایک ایسی واضح تصویر آنکھوں میں کھچ جاتی ہے جو بے جان سالمات کی اتفاقیہ ترکیب و رفتار کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔"

سر آلیور لاج، ڈاکٹر آف سائنس اپنے مضمون "کائنات کا منصوبہ و مقصد" میں لکھتے ہیں:۔

سُورج کی روشنی کا بہت بڑا حصہ خلا میں پھیل جاتا ہے۔ اور اس کی ایک چھوٹی سی کسر زمین پر آتی ہے اسی سے ہوائیں چلتی، گھٹائیں بنتی، دریا بہتے، پودے اُگتے اور ذی حیات زندہ رہتے ہیں نظامِ شمسی کب سے قائم ہے؟ ہمیں علم نہیں۔ ہمیں اتنا ہی معلوم ہے کہ زندگی کسی نہ کسی شکل میں شروع سے موجود تھی، البتہ ذہن و دماغ کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ بعض پُراسرار عوامل صدیوں مصروفِ عمل رہے۔ تب کہیں فضا عقل و آگہی کے لیے ہموار پائی۔ یہ عوامل بدستور مصروفِ کار ہیں اور ایک عظیم تر ذہانت کے منتظر۔

اس کائنات کی تفسیر و تشریح صرف فزکس اور کیمسٹری کے اصولوں سے نہیں ہو سکتی۔ مثلاً

حیوانات کو لیجیے۔ کیا ان کی عادات، حرکات اور سکنات کی کوئی توجیہ ان علوم کی روشنی میں ممکن ہے، کائنات میں غور و فکر ہمیں ایک ہی نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ یہاں کوئی تخلیق بے مقصد نہیں فرض کیجیے کہ کسی حادثے سے زمین کی تمام آبادی ختم ہو جاتی ہے۔ اور سینکڑوں صدیوں بعد مریخ کا کوئی سائنسی مشن زمین پہ آتا ہے۔ وہ ٹوٹی ہوئی تعمیرات، پلوں اور سڑکوں کو دیکھ کر یہ کبھی نہیں کہے گا کہ یہ چیزیں فزکس اور کیمسٹری کے عمل سے ظہور میں آئی تھیں۔ بلکہ یہ سمجھے گا کہ زمین پر کسی وقت کوئی صاحب عقل مخلوق آباد تھی جس نے یہ سب کچھ کسی نہ کسی مقصد کے لیے بنایا تھا۔

ایک سرجن اس اعتماد پر جسم کے کسی خراب حصے کو کاٹ دیتا ہے کہ یہ حصہ از خود از سر نو پیدا ہو جائے گا، اندمال و تلافی کا یہ عمل کیسے ہوتا ہے، بدستور ایک راز ہے۔ ہماری اس مادی دنیا میں ایک روحانی دنیا بھی موجود ہے جس کی طرف ہم امداد و تعاون کے لیے بار بار لپکتے ہیں۔ ہمارا بولنا، پڑھنا لکھنا اور سوچنا جسمانی اعمال ہیں اور روحانی بھی۔ جب ہم لکھ رہے ہوتے ہیں تو ہاتھ اور دماغ بیک وقت مصروفِ کار ہوتے ہیں۔ جب ہم کسی ڈرائنگ روم میں حسین آرائشی اشیا دیکھتے ہیں تو معاً ذہن ان کے دانش مند صانع کی طرف چلا جاتا ہے۔ نگار خانہ فطرت بھی جمیل مناظر سے لبریز ہے، کیا ان کا کوئی صانع نہیں؟

قدیم کھنڈرات میں زمانہ قبل از تاریخ کے نقش و نگار دیکھ کر ذہن اُس دانش آرٹسٹ کی طرف چلا جاتا ہے جس نے وہ نقش بنائے تھے۔ یہ نباتات، حیوانات اور جمادات نہ صرف آرٹ کے حسین نمونے ہیں بلکہ پلان و مقصد کے عظیم شواہد بھی۔ ان تمام کی تعمیر و تشکیل ایٹم سے ہوئی تھی۔ یہ انہی کی ترتیب کا اعجاز ہے کہ نباتات حیوانات و جمادات سے الگ ہو گئے۔ اور ان کی اتنی انواع بن گئیں کہ انسانی ذہن ان کے تنوع اور تعداد کے تصور ہی سے سر بسجود ہو جاتا ہے۔

"When we come to philosophize on existence,

we must transcend the limitations of

physical science and admit the working and

operation of a super human guiding and

directing power".

(آلیورلاج)

(جب ہم زندگی کی حقیقت پر غور کرنے لگیں تو ہمیں چاہیے کہ فزیکل سائنس کی محدود فضا کو پھلانگ کر اُس مافوق البشری طاقت کو تسلیم کریں جو ہر شے کو تکمیل کی راہوں پہ ڈال کر اُس کی رہنمائی کر رہی ہے)۔

آرتھر سٹو آرٹ ایو (ایف آر، ایس۔ ڈی ایس سی) اپنے مضمون "تفسیر کائنات" میں لکھتے ہیں:

"اس خلا کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کروڑوں لہریں بیک وقت روشنی کی رفتار سے ہر سمت جا رہی ہیں اور ایک دوسرے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ ان کا طول جُدا جُدا ہوتا ہے۔ اسی خلا سے روشنی بھی گزرتی ہے۔ اگر ہم ایک سو واٹ کا ایک بلب دس گھنٹے کے لیے جلائیں تو بجلی کا ایک یونٹ خرچ ہوگا اور اس کے لیے ہمیں کم از کم تیس پیسے ادا کرنا ہوں گے۔ بجلی کا کچھ وزن بھی ہوتا ہے۔ حساب لگایا گیا ہے کہ ایک پونڈ بجلی خریدنے کے لیے ہمیں ۵۰ کروڑ ڈالر خرچ کرنا پڑیں گے۔ سورج ہر روز ایک سو ساٹھ ٹن روشنی زمین کو دیتا ہے اس کی قیمت ۸ کروڑ ملین ڈالر بنتی ہے۔ سورج یہ کام پچھلے دس ارب سال سے کر رہا ہے اور نہ جانے کتنے ارب سال اور کرتا رہے گا۔ کوئی ہے جو روشنی کی قیمت کا اندازہ لگا سکے؟ اگر کسی دن آسمان والے اہلِ زمین کے سامنے روشنی کا بل پیش کر دیں۔ اور ساتھ ہی دھمکی دے دیں کہ اگر فلاں تاریخ تک یہ بل ادا نہ ہوا تو کائنات کی تمام روشنیاں گل کر دی جائیں گی، تو اے زمین والو! بتاؤ کیا کرو گے؟

یہ خلا جو ہر قسم کی روشنی اور توانائی کی لہریں زمین تک پہنچاتا ہے بالکل خالی نہیں۔ بلکہ اثیری مواد سے پُر ہے۔ یہ مواد مادی اشیاء کی طرح ٹھوس نہیں اور نہ بالکل روحانی ہے۔ سرِدست کائنات کے متعلق ہمارا تصور یہ ہے کہ یہ مادہ اور اثیر سے مرکب ہے اور اثیر توانائیوں کی گزرگاہ ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ دس لاکھ نوری سال تک کی مسافتیں ماپی جا چکی ہیں۔ اور فلک شناس ایسی مسافتوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو دس کروڑ نوری سال سے بھی زیادہ ہوں۔

اس کائنات میں ایک طرف سدیم کہکشاں، ستاروں کی بے کراں مسافتیں اور توانائی کی بے شمار لہریں ہیں اور دوسری طرف مہین برقی ذرّات اور بنیادی عناصر مثلاً ہیلیم، سوڈیم۔ کمرومیم وغیرہ ہیں، جن سے اشیاء کی تشکیل ہوئی۔ انہی سے زمین بنی اور انہی سے سورج چاند اور کواکب تیار ہوتے۔ ایٹم دجوہر) بجلی کے مثبت و منفی ذرّات کا مجموعہ ہے۔ یوں تو ایٹم کی ساخت بہت سادہ ہے لیکن نباتات و حیوانات میں یہ بہت پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ ایک پودا بظاہر ایک سادہ سی چیز نظر آتا ہے لیکن درحقیقت وہ ایک نہایت پیچیدہ فیکٹری ہے جس میں پتے شاخیں پھول اور خوش ذائقہ پھل ڈھل رہے ہیں۔ اور عجیب تر یہ کہ اس کے پاس اپنے جیسی مزید فیکٹریاں بنانے کا سامان (بیج) بھی موجود ہے۔ آم کی گٹھلی سے آم۔ مالٹے کے بیج سے مالٹا اور گائے کے پیٹ سے بچھڑا پیدا ہونا تخلیق کا حیرت انگیز اعجاز ہے۔ وہ کون سی قوت ہے جو شیر کے بچّے کو شیر بناتی اور آم کے پودے کے ساتھ آم لگاتی۔ نو رو ئیدہ نہال اور نو مولود بشر کا رابطہ اپنی نوع سے قائم رکھتی ہے۔ اس سوال کا جواب ابھی تک ہمیں نہیں مل سکا۔

ایٹم، مثبت و منفی ذرّاتِ برق سے ترکیب پاتا ہے۔ مثبت کے گرد ایک سے لے کر بانوے تک منفیے (الیکٹران)، اُسی طرح چکّر کاٹتے ہیں جیسے سورج کے گرد سیّارے۔ ہر منفیہ ایک مدار سے کود کر دوسرے میں جا سکتا ہے۔ اس کی خصوصیات میں سے ایک یہ کہ یہ وائرلس سٹیشن کی طرح توانائی لیتا بھی ہے اور دیتا بھی۔

اللہ کا کمالِ تخلیق دیکھنا ہو تو اُونٹ اور ہاتھی کو نہ دیکھیے بلکہ ان باریک رنگین اور اُڑتی ہوئی مکھیوں کو دیکھیے جو پھولوں اور پھلوں کے پاس ملتی ہیں۔ اُن کی نہ ٹانگیں نظر آتی ہیں نہ منہ اور نہ سر۔ با ایں ہمہ وہ ہر لحاظ سے مکمل ہوتی ہیں۔ یہی کیفیت کائنات کے ان مہین ذرّات کی ہے کہ چھوٹا ہونے کے باوجود یہ تخلیق کا شاہکار ہیں۔

باب ۲۴

اَن دیکھی دُنیا

علّت و معلول میں یکسانیّت

سائنس میں تجربہ و مشاہدہ کی بنیاد یہ اصول ہے کہ ہر نتیجہ کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔ مُسبّب اور نتیجہ کا یہ رشتہ وقتی و عارضی نہیں بلکہ مستقل ہے۔ مثلاً گرمی آگ کا نتیجہ ہے۔ آگ سبب ہے اور گرمی نتیجہ۔ یہ کل بھی تھا، آج بھی ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔ آگ اور گرمی کا رشتہ یہاں بھی ہے اور دنیا کے ہر حصّہ میں یہ رشتہ برقرار رہے گا۔

سبب اور نتیجہ کا یہ رشتہ ہر جگہ اور ہمیشہ برقرار رہتا ہے، ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ اسی رشتہ کی بنا پر ہم قوانینِ فطرت مُرتّب انداز میں سمجھتے ہیں بلکہ انہیں اپنے الفاظ میں مُرتّب کر لیتے ہیں۔

سبب و نتیجہ یا علّت و معلول کی اس یکسانیت کی بنیاد پر ہم تمام واقعات و حالات کو علّت و معلول کی کڑی میں پروتے چلے جاتے ہیں۔ ہر واقعہ یا نتیجہ کا سبب، پھر اس کا سبب ڈھونڈتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ ہم اس یقین کے ساتھ کرتے ہیں کہ ہر واقعہ کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوگا۔ ہر معلول کی کوئی نہ کوئی علّت ضرور ہوگی۔

سرحدِ ادراک سے پرے

علّت و معلول کو کڑی در کڑی پروتے پروتے ایک مقام ایسا بھی آجاتا ہے جہاں ہم کسی معلول کی دجہ بیک وقت علّت بھی ہوتا ہے، اگلی کڑی دریافت نہیں کر پاتے۔ واقعہ یا نتیجہ موجود ہے مگر اس کا سبب نظر نہیں آرہا۔ دیکھنے، چھونے، سُننے، سُونگھنے اور چکھنے کی قوتیں بے بس ہو جاتی ہیں۔ راستہ باقی ہے، منزل بہت آگے ہے مگر حواسِ خمسہ نے ساتھ چھوڑ دیا، آنکھیں دُھندلانے لگیں سرحدِ ادراک

حیوانات کو لیجیے۔ کیا ان کی عادات، حرکات اور سکنات کی کوئی توجیہ ان علوم کی روشنی میں ممکن ہے، کائنات میں غور و فکر ہمیں ایک ہی نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ یہاں کوئی تخلیق بے مقصد نہیں فرض کیجیے کہ کسی حادثے سے زمین کی تمام آبادی ختم ہو جاتی ہے۔ اور سینکڑوں صدیوں بعد مریخ کا کوئی سائنسی مشن زمین پہ آتا ہے۔ وہ ٹوٹی ہوئی تعمیرات، پلوں اور سڑکوں کو دیکھ کر یہ کبھی نہیں کہے گا کہ یہ چیزیں فزکس اور کیمسٹری کے عمل سے ظہور میں آئی تھیں۔ بلکہ یہ سمجھے گا کہ زمین پر کسی وقت کوئی صاحب عقل مخلوق آباد تھی جس نے یہ سب کچھ کسی نہ کسی مقصد کے لیے بنایا تھا۔

ایک سرجن اس اعتماد پر جسم کے کسی خراب حصے کو کاٹ دیتا ہے کہ یہ حصہ از خود از سرِ نو پیدا ہو جائے گا، اندمال و تلافی کا یہ عمل کیسے ہوتا ہے؟ بدستور ایک راز ہے۔ ہماری اس مادّی دُنیا میں ایک روحانی دنیا بھی موجود ہے جس کی طرف ہم امداد و تعاون کے لیے بار بار لپکتے ہیں۔ ہمارا بولنا، پڑھنا لکھنا اور سوچنا جسمانی اعمال ہیں اور رُوحانی بھی۔ جب ہم لکھ رہے ہوتے ہیں تو ہاتھ اور دماغ بیک وقت مصروفِ کار ہوتے ہیں۔ جب ہم کسی ڈرائنگ روم میں حسین آرائشی اشیا دیکھتے ہیں تو معاً ذہن ان کے دانش مند صانع کی طرف چلا جاتا ہے۔ نگار خانۂ فطرت بھی جمیل مناظر سے لبریز ہے، کیا ان کا کوئی صانع نہیں؟

قدیم کھنڈرات میں زمانۂ قبل از تاریخ کے نقش و نگار دیکھ کر ذہن اُس دانش آرٹسٹ کی طرف چلا جاتا ہے جس نے وہ نقش بنائے تھے۔ یہ نباتات، حیوانات اور جمادات نہ صرف آرٹ کے حسین نمونے ہیں بلکہ پلان و مقصد کے عظیم شواہد بھی۔ ان تمام کی تعمیر و تشکیل ایٹم سے ہوئی تھی۔ یہ انہی کی ترتیب کا اعجاز ہے کہ نباتات، حیوانات و جمادات سے الگ ہو گئے۔ اور ان کی اتنی انواع بن گئیں کہ انسانی ذہن ان کے تنوّع اور تعداد کے تصوّر ہی سے سربسجود ہو جاتا ہے۔

"When we come to philosophize on existence,

we must transcend the limitations of

physical science and admit the working and

سمجھ میں آتی ہے۔کیا مان لوں کہ میرے سر میں درد نہیں ہو رہا ؟

دنیا میں بیسیوں چیزیں ایسی ہیں جو ہمارے حواسِ خمسہ اور ادراکِ عقلی کی زد سے دُور ہیں، کیا ان سب کے وجود سے انکار کر دیں ؟

تو آیئے آپ کو ایک اَن دیکھی دنیا کی سیر کرا دیں۔ وہ اَن دیکھی دنیا جس کے وجود سے آپ انکار نہیں کر سکیں گے۔ اہلِ نظر تو صرف چلنے والے کے نقشِ پا کو دیکھتے ہیں اور کسی خاص شخص کے اس جگہ پر آنے کا ثبوت مہیّا کر لیتے ہیں۔ قدموں کے یہ نشان اس جگہ پر اس شخص کے وجود کی دلیل بن جاتے ہیں، ہمارے ہاں دیہاتوں میں پاؤں کے نشانوں سے چوروں کا سراغ بھی لگا لیا جاتا ہے لیکن ہم تو محبوب کے وجود کی بات کریں گے۔

کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی
ابھی اِس راہ سے کوئی گیا ہے !

خلیے

گزشتہ صفحات میں اس بات کا ذکر ہو رہا تھا کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو نظر میں نہیں آتیں لیکن موجود ہوتی ہیں۔ خلیوں اور ایٹم میں الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران کی دنیا بھی اَن دیکھی دُنیا ہے۔ جب اس کے عجائبات پر غور کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی تخلیق اس طرح سے نمایاں ہو جاتی ہے کہ انسان وجد میں آ جاتا ہے۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق ۳۴ سائنسدانوں کے مضامین پر مشتمل ایک کتاب ایک عظیم منصوبہ Great design کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" نباتات اور حیوانات کے بنیادی اجزاء خلیے Cells کہلاتے ہیں۔ ہر خلیہ کئی عناصر مثلاً ہائیڈروجن، آکسیجن وغیرہ سے مرکّب ہوتا ہے۔ دنیا کا ہر پودا اور ہر جاندار انہیں سے تیار ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب ہر جانور کی تکوین انہیں سے ہوتی ہے تو ان کا ایک مجموعہ

خرگوش، دوسرا ہرن، تیسرا بیل اور چوتھا سانپ کیسے بن گیا۔ ماہرینِ حیات کا جواب یہ ہے کہ یہ سب کمال ترتیب سے ہے۔ ہرن کے خلیوں کی ترتیب دیگر تمام جانوروں کے خلیوں سے جدا تھی۔ اسی اختلافِ ترتیب سے ایک خرگوش اور دوسرا شیر بن گیا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ ترتیب دینے والا کون ہے۔ سائنس کے پاس اس کا کوئی جواب موجود نہیں ہے۔

لیکن مذہب کہتا ہے : اللہ!

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ۗ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ (فاطر: ۱۱)

"اللہ نے تمہیں پہلے چکنی مٹی سے پیدا کیا تھا، پھر نطفہ سے تمہاری تخلیق شروع کر دی، اس نے تمہارے جوڑے بنائے اور عورت جو کچھ پیٹ میں اٹھائے پھرتی ہے یا جنتی ہے، یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہے"

ایٹم

بے جان اشیاء مثلاً لوہا، پتھر، سونا وغیرہ میں خلیے نہیں بلکہ برق پارے ہوتے ہیں۔ ان کی ترتیب اور تعداد کے اختلاف سے ایک مجموعہ سونا بن جاتا ہے دوسرا چاندی اور تیسرا لوہا۔ ہائیڈروجن کے جوہر میں صرف ایک منفی الیکٹران ہوتا ہے اور آکسیجن میں آٹھ اور کیلشیم میں بیس"۔

(۵ : ۱۱)

"یہ کائنات بجلی کے مہین ذرات سے تعمیر ہوتی ہے۔ یہ دو قسم کے ہوتے ہیں، منفیہ (الیکٹران) ثباتیہ (پروٹان) جسے مرکزہ بھی کہتے ہیں۔ ان دونوں کے ملاپ سے جوہر (ایٹم) بنتا ہے اور کئی جواہر سے مالیکیول تیار ہوتا ہے اور ایک ایٹم کا ٹھوس حصہ وہی ہوتا ہے جسے مرکزہ کہتے ہیں اور باقی جگہ خالی ہوتی ہے۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ اگر ہر ایٹم سے اس کی خالی جگہ چھین لی جائے تو تین من بھاری انسان کا وزن ریت کے ایک ذرے سے بھی کم ہو جائے گا۔ اور زمین کا قطر جو اب ۸ ہزار میل ہے صرف نصف میل رہ جائے گا"۔ (ریڈرز ڈائجسٹ، فروری ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۴۲)

نیویارک کا ایک سائنسدان رابرٹ پلمب نیویارک ٹائمز میں لکھتا ہے کہ بادو باراں کا وہ طوفان جو ۸۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا ہو ایک منٹ میں اتنی توانائی استعمال کرتا ہے جتنی کہ ریاستہائے متحدہ کا نظامِ برق پچاس برس میں پیدا کرتا ہے۔ (ایضاً و ۵: ۱۶)

جیمز آرنلڈ گراڈ تھرالیم اے ایس سی ڈی اپنے مضمون "ضوفشانی" Radiation میں لکھتے ہیں:

"مادہ کیا ہے؟ یہ برق پاروں میں مقیّد توانائی کا نام ہے۔ اگر اس توانائی کو ہم کسی طرح آزاد کر سکیں تو یہ خلا میں نہایت تیز رفتاری سے کسی طرح پرواز کرنے لگے گی۔ اس کی صورت ایک ہی ہے کہ یہ زمین کسی ستارے سے اس طرح ٹکرا جائے کہ تمام رشتے بندھن اور رابطے ٹوٹ جائیں اور برق پارے آزاد ہو جائیں۔

کائنات کی بنیادی حقیقت ضوفشانی Radiation یا توانائی ہے۔ یہ کہیں شعاع کی صورت اختیار کر لیتی ہے، کہیں لہر اور کہیں ذرّے کی۔ اس متنوع کائنات میں توانائی ہی رشتۂ وحدت کا کام دیتی ہے۔ آغازِ آفرینش میں خلائے پرسکون تھا، کہیں سے برق پارے بیچ میں آکودے اور اضطراب سا پیدا ہو گیا۔ ان میں سے کچھ توانائی میں تبدیل ہو گئے اور کچھ مادہ Matter بن گئے۔

سائنس اَن گنت صدیوں سے رازِ حیات حل کرنے میں مشغول ہے۔ اس نے تلاش و تحقیق کی بے شمار وادیاں طے کیں۔ بڑی پیچیدہ راہوں سے گذری۔ بے شمار الجھی ہوئی گتھیاں سلجھائیں اور اب اس صداقت تک جا پہنچی ہے جس کا اعلان خدا نے موسیٰؑ نے ولادتِ مسیح سے پندرہ سو سال پہلے کیا تھا:

"Let there be light and there was light".

ترجمہ: "اللہ نے کہا اُجالا ہو جائے اور فوراً اُجالا ہو گیا"

دو حوالے (۵: ۱۳۳، ۳۴، ۱۳۸)

منطقی اثباتیت اور ایمان بالغیب

اس موقع پر منطقی اثباتیت Logical positivism کی طرف اشارہ کردینا بھی ضروری ہے۔ جدید دور کے اس فلسفے میں یہ بات بہت شد و مد کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ جو امر یا جو چیز حواسِ خمسہ کے ذریعے محسوس نہ کی جاسکے وہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ بالفاظِ دیگر جو چیز نظر نہ آئے وہ سرے سے وجود ہی نہیں رکھتی۔ از راہِ تفنّن عرض ہے کہ اس قسم کی کٹ حجتی آج سے تقریباً ساڑھے تین ہزار سال پہلے حضرت مُوسیٰ علیہ السّلام کی قوم کے بعض لوگوں میں بھی پائی جاتی تھی۔ انہوں نے بھی یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہم اس وقت تک خدا کو نہیں مانیں گے جب تک خدا ہمیں اپنی آنکھوں سے نظر نہیں آجائے گا۔

منطقی اثباتیت سے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ عرض ہے کہ اس فلسفے کو ماننے والے ایک استاد اپنی کلاس میں پڑھا رہے تھے اور اندازِ گفتگو یہ تھا کہ دیکھیے آپ لوگوں کو یہ کتاب نظر آرہی ہے۔ طلباء نے جواب دیا کہ جی نظر آرہی ہے۔ ارشاد ہُوا "تو یہ کتاب موجود ہے"۔ پھر پوچھا کہ "یہ دیوار نظر آرہی ہے؟" طلباء سے جواب ملا "نظر آرہی ہے"۔ تو اُستاد نے فرمایا: کہ "دیوار موجود ہے"۔ پھر پوچھا کہ "یہ قلم آپ کو نظر آتا ہے؟" طلباء نے جواب دیا: "جی نظر آتا ہے"۔ اُستاد نے کہا: "یہ قلم موجود ہے"۔ پھر پُوچھا "تمہیں خدا نظر آرہا ہے؟" طلباء نے کہا: "جی نہیں نظر آرہا"۔ تو اُستاد صاحب فرماتے ہیں کہ "اگر خدا نظر نہیں آرہا ہے تو خدا موجود نہیں ہے"۔ اسی اثناء میں ایک ذہین طالب علم نے کھڑے ہو کر طلباء سے پوچھا کہ "کیا آپ کو استاد صاحب کی عقل نظر آرہی ہے؟" طلباء نے کہا نہیں، تو اس طالب علم نے جواب دیا کہ "اُستاد صاحب میں عقل نہیں ہے"۔

قرآن مجید اس اندازِ فکر کی شدّت سے مخالفت کرتا ہے۔ ارشاد ہے:

"بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ" (یُونس: ۳۹)

"بس صرف اس لیے جھٹلا دیا کہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی یا دائرۂ علم میں نہ آسکی (حواسِ خمسہ کی گرفت میں نہ آسکی) اور ابھی اس کی حقیقت ان پر کھلی نہیں"۔

دنیا میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں جن کا وجود ہے اور وہ نظر نہیں آتیں۔ مثلاً ہوا۔ ہوا چلتی ہوئی نظر نہیں آتی، ہاں گرد و غبار نظر آتا ہے۔ درختوں کی ٹہنیاں ہلتی ہوئی نظر آتی ہیں مگر یہ تو ہوا کی علامتیں ہیں، نشانیاں اور آثار ہیں، ہوا تو نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی نشانیاں آیاتِ بیّنات تو ہر طرف بکھری ہوئی نظر آتی ہیں مگر اس کی ذات نظر نہیں آتی۔ آپ کہتے ہیں کہ مجھے شدید درد ہو رہا ہے۔ درد کے آثار تو چہرے پر نظر آتے ہیں مگر درد نظر نہیں آتا۔ زمین کی کششِ ثقل، فضا میں ریڈیائی لہریں، ہمارے جذبات، غم، غصّہ، خوشیاں نہ نظر آتی ہیں اور نہ حواسِ خمسہ سے محسوس کی جا سکتی ہیں۔ ہاں ان کے آثار و علامات ضرور نظر آتے ہیں۔ کیا ان سب چیزوں کے وجود کا انکار کر دیں؟

سب چیزیں موجود ہوتی ہے لیکن اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ کیا یہ سب چیزیں غیر موجود ہو جاتی ہیں۔ سب چیزیں موجود ہوتی ہیں لیکن آنکھوں کے سامنے اگر دو ہزار واٹ کا بلب روشن کر دیا جائے تو آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

نظر یا خبر؟

کسی چیز کے ثبوت کے لیے اس کی رُویت اور اس کا نظر آنا ضروری نہیں ہوتا۔ ہم کمرے میں موجود ہوتے ہیں، باہر سُورج کی روشنی ہوتی ہے۔ سورج نظر نہیں آ رہا ہوتا لیکن سُورج کے وجود کا اقرار کرتے ہیں، کسی مکان سے دھواں اُٹھ رہا ہوتا ہے لیکن آگ نظر نہیں آ رہی ہوتی مگر آگ کے وجود کا یقین ہو جاتا ہے۔ کسی شخص کے پاؤں کے نشان نظر آتے ہیں وہ شخص نظر نہیں آتا۔ مگر اس کے باوجود اس کا سُراغ پا لیتے ہیں۔

عملی دنیا میں نظر سے زیادہ خبر کی وقعت ہے۔ حواسِ خمسہ کی کیفیت تو عام طور پر ان چار اندھوں کی کیفیّت سے ملتی جُلتی ہے جو ایک ہاتھی کو مختلف زاویوں سے ٹٹول رہے تھے کسی نے سونڈ پر ہاتھ لگایا تو کہا کہ ہاتھی سانپ کی طرح ہوتا ہے۔ کسی نے اس کے پاؤں کو ہاتھ لگایا تو کہا کہ ہاتھی ستون کی طرح ہوتا ہے۔ اور کسی نے اس کے جسم پر ہاتھ لگایا تو کہا کہ وہ دیوار کی طرح ہوتا ہے۔

وعلیٰ ہٰذا القیاس . . . عملی زندگی کا تعلق خبر اور ایمان بالغیب سے ہے۔ ہم اپنی زندگی کے ۹۵ فیصد اُمور صرف دوسروں سے سُنی سنائی باتوں پر اعتماد کر کے طے کرتے ہیں۔ ایک بیمار شخص ڈاکٹر کی ہر ہر بات پر پُورا پُورا اعتماد کرتا ہے اور ایمان بالغیب لاتا ہے۔ ایک شخص عدالت میں مقدمہ لڑتے ہوئے وکیل کی ہر اُلٹی سیدھی بات پر پُورا پُورا اعتماد کرتے ہُوئے اس پر ایمان بالغیب لاتا ہے۔ ہم روزانہ اخبار پڑھتے ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن پر خبریں سُنتے ہیں، سب باتوں پر اعتماد کرتے ہیں، اگر یہ اعتماد نہ ہو اور ہر چیز کو دیکھنا شرط قرار پا جائے تو زندگی گذارنا ناممکن ٹھہرے۔ مجھے جاپان جانے کا اتفاق نہیں ہُوا تو کیا میں جب تک جاپان کو دیکھ نہ لُوں تو ملک جاپان کے وجود سے انکار کیے رکھوں۔ کہنے والا مجھے کہہ سکتا ہے کہ میاں ابھی چلو ٹکٹ خریدو اور ٹوکیو کے شہر میں جا کر دیکھ لو کہ جاپان موجود ہے۔ میرا جواب یہی ہو گا کہ ہاں بھئی ہو گا مگر صرف تمہارے لیے، اس لیے کہ تم دیکھ چکے ہو اور جب تک میں دیکھ نہیں لیتا اس وقت تک میرے لیے جاپان کا وجود نہیں ہے۔ کیا یہ جواب اصولاً درست ہو گا لیکن ایک معقول شخص کا رویّہ یہی ہے کہ میاں جب تم کہتے ہو کہ جاپان میں پہنچ کر جاپان کو دیکھ سکتے ہو تو دیکھنے سے پہلے ابھی اس کے وجود کا اقرار کر لینے میں کیا حرج ہے۔ اصولی طور پر تو اس کا وجود مان لینا چاہیے۔

یہی بات اللہ والے بھی کہتے چلے آتے ہیں (ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر) کہ جب وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور اس کا قُرب نصیب ہو گا تو تم اس کا مشاہدہ کر سکو گے لیکن اس مشاہدہ سے پہلے ابھی مان لینے میں کیا حرج ہے۔ اصولی طور پر تو مان لینا چاہیے۔

میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ فلسفہ کا مطالعہ کرتے ہُوئے کئی مرتبہ گھرا پانی آیا، ڈبکیاں کھانے لگا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان کی چولیں ڈھیلی ہونے لگیں۔ اس موقعے پر ایک سہارا تھا جس نے ڈوبنے سے بچا لیا اور کنارے پر باریابی بخشی۔ اور وہ تھا محمدؐ عربی پر اعتمادِ کامل کا سہارا! ان پر ایمان بالغیب کا سہارا! اتنا تو یقین کامل ہے اور تھا کہ محمدؐ عربی اتنی عظیم شخصیت ہے کہ اس کے مُنہ سے جھوٹ نہیں نکل سکتا اور وہ پھر اس راہ میں اکیلے نہیں ہیں، لاکھوں انبیاء، اولیاء، صُلحاء، شہداء ان کے جلو میں چلے

آرہے ہیں۔ کیا یہ سب کے سب جھوٹ بول رہے ہیں؟ ان سب کو جھوٹا کہنے سے پہلے اپنی عقل کا علاج کیوں نہ کروا لوں؟ پھر یہی ہوتا رہا کہ جب غوطے آنے لگتے تو ضمیر کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلتی:

مجھے عشق کے پر لگا کر اُڑا　　میری خاک جگنو بنا کر اُڑا

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے　　دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے　(اقبالؒ)

یہ سوزِ صدیق کیا ہے؟ یہ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شخصیت کبریٰ پر مکمل ایمان ہے اور وہ بات جو سمجھ میں آنے والی نہیں اس پر بھی یقینِ کامل لے آنے کا نام ہے، اگر وہ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے منہ سے نکل گئی ہو۔

تو ہر چیز کا وجود اس بات کا محتاج نہیں ہے کہ اسے ننگی آنکھ سے دیکھا جاتے یا حواسِ خمسہ سے محسوس کیا جائے۔ زندگی کے پچانوے فی صد سے زیادہ معاملات خبر سے متعلق ہیں، نظر سے نہیں۔

نظر درد و غم و سوز و تب و تاب
تو اے ناداں قناعت کر خبر پر　(اقبالؒ)

باب ۲۵

دانشِ اعلیٰ

آئن سٹائن کہتا ہے:

"باشعور زندگی جس کا دھارا ازل سے ابد کی طرف رواں ہے، فطرت کا بہت بڑا راز ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس پر، نیز کائنات کی حیرت انگیز ساخت پر غور کریں اور اس دانشِ اعلیٰ کا سُراغ لگائیں جس کا اظہار فطرت کے ہر منظر سے ہو رہا ہے۔"

(۵ : ص ۱۸)

یہ کائنات اس قدر منظّم، مُرتّب، پیچیدہ، دقیق و صحیح تدبیر کا مظہر اور اس قدر حسین ہے کہ اس کے خالق و مُدبّر کا تصوّر از خود ذہن میں آتا ہے اور اس دانشِ اعلیٰ پہ قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ کائنات کے حسن و رعنائی اور اس میں موجود تدبیر و حکمت سے اور کیا ناانصافی ہوگی کہ اسے کسی حادثہ یا اتفاق کا نتیجہ قرار دے دیا جائے اور احسن الخالقین سے منہ موڑ لیا جائے۔

یہ تو بالکل ایسا ہے کہ کوئی شخص یوں کہے کہ رنگ کا ڈبہ زمین پر گر گیا اور فرش پہ مونا لیزا کی تصویر بن گئی۔ یا یہ کہ سیاہی کاغذ پر بکھر گئی اور زمین کا نقشہ بن گیا، یا یوں کہا جائے کہ کسی چھاپہ خانہ میں اچانک دھماکہ ہوا اور ڈکشنری تیار ہو کر باہر آگئی۔

تخلیقی فن پارہ جس قدر پیچیدہ، مُرتّب اور حسین ہوگا وہ اسی قدر اپنے خالق کے تخلیقی حسن کا غمّاز ہوگا۔

حقیقتِ حیات

آرتھر سٹوآرٹ ایو۔ ایف آر ایس۔ ڈی ایس سی اپنے مقالہ "تفسیرِ کائنات" میں لکھتے ہیں:

"حیات کیا ہے؟ اس سوال کا صحیح جواب ابھی تک نہیں مل سکا۔ بعض کہتے ہیں کہ زندگی حرکتِ ذرّات کی تخلیق ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں۔ کیونکہ حرکت ایک خارجی عامل ہے اور زندگی ایک داخلی حقیقت۔ نیز فطرت کا ایک ایسا رازِ سربستہ جسے انسانی عقل آج تک کھول نہیں سکی۔ پھر ذرّات شعور سے محروم ہیں۔ اور انسان شعور کی بلند ترین قسم یعنی عقل سے آراستہ ہے۔ یہ کون تسلیم کرے گا کہ لاشعور شعور کو جنم دے سکتا ہے۔

گو حیات ایک داخلی شعلہ ہے لیکن اس پر باہر سے کنٹرول کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ کام ہمارے سپرد کیا جاتا تو ہم مدّت سے ختم ہو چکے ہوتے۔ کون ہے جو خون کے سرخ و سپید ذرّات کی کمی پوری کرتا۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑتا اور زخموں میں گوشت بھرتا:

(زندگی کہاں سے آئی؟ اس سوال کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ مادہ سے پیدا ہوئی اور مادّہ ازلی و ابدی ہے۔ دوسری یہ ہے کہ یہ عدم سے نکلی یعنی زندگی موت کی تخلیق ہے۔ تیسرا یہ کہ یہ آفتاب کی الٹرا وائلٹ شعاعوں کی کارستانی ہے۔ بعض کاسمک پریشر Cosmic pressure وغیرہ کو عواملِ حیات میں شمار کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی جواب حقیقت کی ترجمانی نہیں کرتا۔ کیونکہ حیات ایک نہایت پیچیدہ چیز ہے۔ ترکیب تو رہی ایک طرف، ایک خلیے کی ساخت تک کو سمجھنا مشکل ہے۔ رہا انسان کا اعصابی و عروقی نظام تو یہ تخلیق کا اتنا بڑا شاہکار ہے کہ انسان اسے آج تک نہیں سمجھ سکا۔ انسانی جذبات کا مرکز کہاں ہے۔ فکر، تخیّل، غم، مسرّت اور محبّت کی امواج کہاں سے اٹھتی ہیں۔ رُوح کیا ہے اور دل کیا؟ یہ مسائل ہمارے فہم کی رسائی سے باہر ہیں)۔" (۵ : ۱۴۱)

وحدت و دانش

ڈیوڈ فریسز ھیرس ڈاکٹر آف سائنس اپنے مقالہ "کائنات میں وحدت و دانش" میں لکھتے ہیں:-

"زمین بیک وقت تین گردشیں کر رہی ہے۔ ایک گردش اپنے گرد۔ دوسری سورج کے گرد،

اور تیسری سارے نظامِ شمسی کے ہمراہ کسی نامعلوم مرکز کے گرد۔ بعض اس تیسری گردش کو کسی نامعلوم منزل کی طرف سفر قرار دیتے ہیں۔ زمین کا بیک وقت یُوں گردشیں کرنا کہ ہمیں اس کا احساس تک نہ ہو، تخلیق وصنّاعی کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ درست کہا تھا سر جیمز جینز نے:

"The trembling universe must have been

balanced with almost unthinkable precison".

"(اس کانپتی ہوئی کائنات کو کسی غیر مرئی ہاتھ نے ناقابلِ تصوّر چابک دستی سے متوازن کیا ہوگا)۔

ہمارا واسطہ دو جہانوں سے پڑتا ہے۔ ایک کائناتِ اکبر جو ارض وسما پہ مشتمل ہے۔ اور دوسری کائناتِ اصغر، یعنی ذرّات اور خلّیوں کی دنیا۔ چھوٹی دنیا بڑی دُنیا کی نقل ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے "سیّارے" (الیکٹرانز) مرکز کے گرد نہایت تیزی سے گھوم رہے ہیں۔ اور وحدتِ کائنات پر شہادت دے رہے ہیں۔ ستاروں کی وسعتیں ہوں یا ذرّات کی تنگنائیاں۔ ہر جگہ حیات کا ایک ہی انداز ہے اور ہر تخلیق میں مقصد کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

کائنات ایک نہایت منظّم مربُوط اور مُحکم تخلیق ہے۔ یہ نظم وربط بعید ترین کہکشاں میں بھی پایا جاتا ہے اور باریک ترین ایٹم میں بھی خالقِ کائنات کے ہاں حجم اور وزن کوئی اہمیّت نہیں رکھتے۔ اُس کی نظر ترتیب متانت اور استقامت پر رہتی ہے۔"

جب ہم جاندار اشیاء پہ نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ہر جگہ مقصد۔ پلان۔ ترتیب۔ آرڈر اور نظم و نظر آتا ہے۔ ہر جاندار ماحول کے سانچے میں ڈھل رہا ہے۔ کچھ جانور ایسے ہیں۔ جو صرف خشکی پہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ کچھ ہوا میں۔ کچھ کھاری پانی اور کچھ میٹھے پانی میں جی سکتے ہیں۔ مچھلی کی ایک نوع سمندر کی اُن گہرائیوں میں رہتی ہے جہاں روشنی نہیں پہنچ سکتی۔ کچھ ایسے جانور بھی ہیں جو برفوں میں رہتے ہیں۔ اور بعض دیگر خطِ اُستواء کی سخت گرمی میں۔ قدرت نے جانوروں کی حفاظت کا بھی حیرت انگیز

انتظام کیا ہے کہ جو جانور جس ماحول میں رہتا ہے اُسے وہی رنگ دے دیا ہے تاکہ وہ نظر نہ آئے۔ تیتر، طوطا، خرگوش اور ہرن اس کی واضح مثالیں ہیں"۔

کائنات میں باہمی احتیاج کا سلسلہ بھی عالمگیر ہے۔ پودوں کا انحصار زمین کے نمکیات اور بکٹیریا پر ہے اور حیوانات کا پودوں پر۔ یہ انحصار محض اتفاق نہیں بلکہ ایک پلان کا نتیجہ ہے، اور ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ باغ میں کوئی غنچہ کھل نہیں سکتا جب تک ستاروں کی شعاعوں سے مستفیض نہ ہو۔

(انسان نے مختلف کاموں کے لیے مختلف لیور بنائے اس نے کنوئیں پر چرکھڑی لگائی۔ زمین جوتنے کے لیے ہل بنایا۔ کوہ کنی کے لیے کدال ایجاد کیا، وقس علیٰ ہذا۔ اسی قسم کا انتظام انسانی جسم میں بھی ہے۔ مثلاً ایک لیور سر اُٹھانے اور جھکانے کے لیے۔ دوسرا بدن کو سہارا دینے اور تیسرا اشیاء کو اٹھانے کے لیے ہے۔ پھر جسم کے ہر جوڑ پر قبضے لگے ہوتے ہیں۔ ہمارے کندھے، گھٹنے۔ ٹخنے اور ہماری کلائی کہنی اور کمر کو مضبوط قبضوں نے جکڑ رکھا ہے۔ بدن میں عروق کا جال بچھا ہُوا ہے اور جا بجا والو لگے ہوتے ہیں۔ ہوا غذا کی نالیوں میں نہیں جا سکتی اور نہ غذا ہوا کی نالی میں۔ اس طرح کے والو شریانوں میں بھی ہیں جوڑوں کو تیل دینے کا انتظام بھی بہت مکمل ہے۔ آنکھ اور کان کی ساخت اتنی ماہرانہ اور حکیمانہ ہے کہ انسان غور سے دیکھے تو خالقِ اکبر کی ثنا پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا حیوانی جسم کی یہ پیچیدہ مشینیں مثلاً آنکھ، کان۔ زبان، جگر، دل، پھیپھڑے وغیرہ کسی خالق کے بغیر ہی تیار ہو گئے تھے۔ کیا ان کی تکمیل بے پناہ علم کے بغیر ممکن تھی؟ کیا ان کے خالق کے سامنے کوئی پلان اور مقصد نہیں تھا؟)

اگر ہمیں کوئی کہے کہ آنکھ اور کان ایک خودکار مشین کی تخلیق ہیں تو ہمارا پہلا سوال یہ ہوگا کہ اس خودکار مشین کا صانع کون تھا؟

ارتقاء آہستہ خرام تبدیلیوں کا نام ہے۔ تبدیلیوں کا یہ عمل لاکھوں سال جاری رہا اور ایک ہی نوع مثلاً طوطے یا مرغابی کی درجنوں اقسام بن گئیں۔ ایک ہی پھول مثلاً گلاب درجنوں اشکال و الوان

میں نمودار ہونے لگا اور مختلف خطہ ہائے زمین میں انسانوں کی صورتیں اور رنگتیں بدل گئیں۔

"One plan, many variations

One design, many modifications,

One truth, many versions."

(ایک ہی پلان لیکن کئی شکلیں۔ ایک ہی منصوبہ لیکن کئی تبدیلیاں۔ ایک ہی صداقت لیکن کئی تعبیریں۔)

فطرت ان تبدیلیوں اور تعبیروں سے اکتاتی نہیں بلکہ وہ کہیں کچھ بڑھا کر اور کہیں گھٹا کر نئی صورتیں پیدا کرتی رہتی ہیں۔ اور ہر صورت نہایت دلکش اور نظر نواز ہوتی ہے۔ درست کہا تھا ٹینی سن (۱۸۰۹-۱۸۹۳ء) نے:۔

"What a marvellous imagination God Almighty has!"

(خدائے عظیم کے تخیل میں کس قدر ندرت و رعنائی ہے۔)

آدمی پہلے ماں کے رحم میں ایک بیضہ (انڈہ) تھا پھر وہ رفتہ رفتہ ۶ فٹ اونچا جوان بن گیا۔ کیا یہ سب کچھ بے مقصد تھا؟ آئن سٹائن اور غار میں رہنے والے وحشی آدمی کے درمیان سینکڑوں ارتقائی منازل ہیں جن سے حیات کو گزرنا پڑا۔ ارتقاء از سرتا پا ایک حکیمانہ پلان ہے اور اس کا واضع سراپا دانش ہے۔

کائنات میں ایک اور وحدت سُر تال، ہم آہنگی یا زیر و بم کی ہے۔ کروڑوں سیّارے ایک مقرّرہ رفتار سے محوِ سفر ہیں۔ اور مقررہ اوقات پر مشرق سے نکل کر مغرب کی طرف جا رہے ہیں۔ زمین پر معیّنہ اوقات پر موسم آ جا رہے ہیں۔ انسان کا دل ایک منٹ میں بہتّر (۷۲) مرتبہ دھڑک رہا ہے۔ اور پھیپھڑے ایک منٹ میں ۱۸ بار پھیل اور سکڑ رہے ہیں۔ یہ سُر تال میں یکسانیت آئینِ فطرت ہے۔ یہ تندرو سیّارے میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور دھڑکتے ہوئے دل میں بھی۔ درست کہا

تھا برطانیہ کے ایک شاعر سیموئیل راجرز نے :-

"The very law which moulds a tear
and bids it trickle from its source,
the law preserves the earth a sphere,
and guides the planets in their course".

(جو قانون آنسو بناتا اور اسے آنکھ سے ٹپکاتا ہے وہی قانون زمین کو متوازن رکھتا اور سیاروں کو ان کی گزرگاہوں پر چلاتا ہے)

ان تفاصیل سے دو باتیں واضح ہیں :-

اوّل :- کہ کائنات میں ایک ایسی دانش مصروفِ عمل ہے جس کی تخلیقی قوتیں حیرت انگیز اور جس کا علم بے پناہ ہے۔

دوم :- فطرت میں اس لحاظ سے بھی وحدت ہے کہ اس کی ہر تخلیق انتہا درجے کی پیچیدہ اور فہمِ انسانی کے لیے ایک چیلنج ہے۔ جب انسان کوئی چیز بناتا ہے تو اس کی مشینوں کی گڑگڑاہٹ سے گرد و نواح میں زلزلہ سا آجاتا ہے۔ دوسری طرف قدرت کی کروڑ در کروڑ مشینیں یوں چل رہی ہیں کہ کہیں سے کوئی ہلکی سی آواز بھی نہیں نکلتی۔ آم کا درخت ایک مکمل فیکٹری ہے جس میں شاخیں، پتے اور جڑیں ڈھل رہی ہیں۔ بور امبیوں میں تبدیل ہو رہا ہے اور امبیاں آم بن رہی ہیں۔ آم میں گٹھلی، صوف، مٹھاس، خوشبو اور لذیذ رس پایا جاتا ہے۔ اگر کوکا کولا کی بوتل بھرنے کے لیے ایک لمبی چوڑی مشین درکار ہے تو آموں میں رس بھرنے کے لیے بھی کتنی مشینیں چل رہی ہوں گی۔ لیکن کمالِ صنّاعی دیکھیے کہ یہ تمام مشینیں خموش ہیں۔ اگر ان سے آواز نکلتی تو یہ زمین رہائش کے قابل نہ رہتی۔ اور تمام جانور اس سے اُسی طرح بھاگ نکلتے جیسے ٹرین کے آنے سے اردگرد کے جانور دوڑ پڑتے ہیں۔ کوئی ہے جو ان مشینوں یعنی درختوں اور پودوں کو گن سکے۔ یہ خموشی بھی وحدتِ کائنات پہ ایک شہادت ہے۔

فہم و دانش انسان ہی کا خاصہ نہیں۔ بلکہ یہ جوہر حشرات، طیور اور حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے۔ پرندے اس مہارت سے آشیاں بناتے اور بچوں کی پرورش کرتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ نحل اس چابک دستی سے شہد بناتی ہے کہ انسان اس کے علم سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ چند پھلوں اور پھولوں کے رس سے شہد جیسی مفید، لذیذ، خوش ذائقہ اور خوش بو چیز تیار کرنا کوئی کھیل نہیں۔ ہے دنیا میں کوئی کیمسٹ جو علم الکیمیا کے تمام فارمولے استعمال کرنے کے بعد شہد کا ایک قطرہ بھی بنا سکے۔ باایں ہمہ انسانی عقل کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ انسان عقل کے زور سے ارض و سما پر دو پہ چھا رہا ہے۔ اور ساری کائنات اس کی غلامی کا دم بھرنے لگی ہے۔ یہ شہد یا آم یا سیب اس لیے نہیں بنا سکتا کہ یہ اللہ کی تخلیق ہیں اور اللہ کی ہر تخلیق سراپا اعجاز ہوتی ہے۔ دماغ کے لحاظ سے انسان ساری کائنات کا سردار ہے لیکن کائناتی دماغ کے سامنے اس کی حقیقت نہیں۔

تو ہم کہہ رہے تھے کہ کائنات میں وحدت ہے۔ اور دلائل یہ کہ:

۱۔ آسمان کے ستاروں اور زمین کے ذرّوں کی روش ایک سی ہے۔ سب کے سب اپنے مدار پر مصروفِ گردش ہیں۔

۲۔ ساری کائنات بجلی کے مثبت و منفی ذرّات سے بنی ہے۔

۳۔ برف کہیں بھی برسے اُس کے برسنے کا انداز ایک سا ہوتا ہے۔ اس کے نرم نرم گالے اس خموشی سے زمین پہ قدم رکھتے ہیں کہ ہلکی سی صدا بھی پیدا نہیں ہوتی۔

۴۔ آنکھ چیونٹی کی ہو یا ہاتھی کی۔ اس کی تشکیل میں ایک ہی فارمولے سے کام لیا گیا ہے۔

۵۔ نباتات، حیوانات کے خلیے، جواہر اور سالمات ساخت میں ایک جیسے ہیں۔ اور سب کے سب خدائی پلان کے مطابق۔

کیا اس بے کراں کائنات میں ایک بھی ایسا منظر ہے جس سے یہ مترشح ہوتا ہو کہ یہ کائنات ذرّات کی اتفاقیہ آمیزش سے وجود میں آئی تھی؟ قطعاً کوئی نہیں۔ یہ ایک عظیم پلان کا نتیجہ ہے جو ایک بلند ترین دانش نے سوچا تھا۔

"We are at a loss to know which

to admire the more,

the mathematical accuracy

or the beauty of the design"

(سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کس کی زیادہ تعریف کریں۔ پلان کی ریاضیانہ صحت یا اس کے حُسن کی؟)

(۵ : ص ۱۰۶-۱۱۲)

سمندر کا پانی نمکین کیوں ہوتا ہے؟

ہنری ای آرم سٹرانگ ڈاکٹر آف سائنس لکھتے ہیں:-

"زندگی جیسا کہ نظر آرہی ہے، پانی، روشنی اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کا کھیل ہے تمام حیوانات ونباتات مشینیں ہیں جو سُورج کی توانائی سے چل رہے ہیں۔ ان میں سے جب کوئی چیز ختم ہو جاتی ہے تو پھر آہستہ آہستہ تحلیل ہو کر پھر ہوا، پانی اور مٹی میں مل جاتی ہے۔" (۵ : ۱۰۰)

سمندر کے پانی میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص حکمت یُوں نظر آتی ہے کہ سمندر کا پانی نمکین ہے میٹھا نہیں ہے۔ اگر پانی میٹھا ہوتا تو شاید متعفّن ہو جاتا اور اس میں سے شدید بُو آتی۔

برف سے متعلق قاعدۂ استثنائیہ

ایک عام قاعدہ ہے کہ جب پانی عام درجہ حرارت سے ٹھنڈا کیا جاتے تو اس کا حجم گھٹتا ہے اور یہ نیچے کی طرف جاتا ہے لیکن برف کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے عجیب قاعدۂ استثنائیہ رکھا ہے کہ پانی جب اس قدر ٹھنڈا ہو جاتا ہے کہ برف بن جائے تو اس کا حجم اور بڑھ جاتا ہے اور وہ نیچے کو جانے کی بجائے سطح سمندر کو اوپر اُٹھاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پورے کا پورا سمندر برف بن جاتا اور اس میں کوئی جاندار زندہ نہ رہ سکتا۔

جبلّت

سر جے آرتھر تھامسن ایم اے، ایل ایل ڈی اپنے مضمون "عجائباتِ حیات" میں لکھتے ہیں:-

"انسان کی بنائی ہوئی کوئی مشین نہ تو از خود چلتی اور نہ اپنی مرمّت کر سکتی ہے لیکن حیوانی مشین اپنی مرمّت، دیکھ بھال اور سلجھاؤ خود بخود کرتی ہے۔ یہ ازل سے مادّے کو توانائی میں اور توانائی کو مادّے میں تبدیل کر رہی ہے۔ اور اس میں ہماری کوششیں شامل نہیں۔ ۔ ۔ ۔

دنیا کا بڑے سے بڑا فاضل یہ بتانے سے قاصر ہے کہ انڈے کی زردی اور سفیدی سے چوزا کیسے بن جاتا ہے۔ مکڑی کا بچّہ بڑا ہو کر پہلی مرتبہ کسی اُستاد کی مدد کے بغیر جالا کیسے بن لیتا ہے اور شہد کی مکھی شہد کیسے بنا لیتی ہے۔ ماہرین یہ کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں کہ اس کی وجہ جبلت Instinct ہے اور یہ نہیں بتاتے کہ جبلّت کیا چیز ہے اور اس میں اتنی دانش کہاں سے آگئی کہ اس نے نحل کو شہد بنانا، مکڑی کو جالا بننا، دیمک کو سُرنگ تیار کرنا، عقاب کو جھپٹنا اور سانپ کو رینگنا سکھایا۔" (۵ : ۵۸)

ارنسٹ ولیم میک براُنڈ اپنے مضمون "کائنات کی وحدت و یکتائی" میں رقمطراز ہیں:-

یہ بات بڑی حیران کن ہے کہ بڑے سے بڑا جانور بھی شروع میں خلیہ یا مہین انڈہ ہوتا ہے اور ایمیبا کی طرح نظر آتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دو میں تقسیم ہونے کے بعد ایمیبا کے دونوں حصے آزادانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور حیوانی خلیے کے حصّے (بعد از تقسیم) ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں نشو ونما کے دوران ان خلیوں میں کافی تبدیلیاں آتی ہیں۔ اور ان کے مختلف گروہ مختلف فرائض سنبھال لیتے ہیں۔ کوئی ہاتھ بنانے لگتا ہے۔ کوئی پاؤں، کوئی دل، کوئی جگر اور کوئی مختلف رطوبتیں نہ جانے ان بے شعور انڈوں کو دل و دماغ جیسی پیچیدہ مشینیں بنانے کا فن کون سکھاتا ہے؟

جب ہم ان انڈوں کی مختلف تبدیلیوں پہ نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان میں ارتقاء کی پوری تاریخ جھلکتی نظر آتی ہے۔ یہ جانور اُن تمام منازل سے گزرتے ہیں جو ان کی انواع نے ابتدا سے اب تک

طے کی تھیں۔ اور وہی کچھ کرتے ہیں جو ان کے آباؤ اجداد کرتے رہے۔ اس کی ایک مثال ایل مچھلی ہے فرض کیجیے کہ یہ ایشیا، افریقہ یا یورپ کی کسی ندی میں پلتی ہے۔ پھر نہ جانے اس کے دماغ میں کیا آتا ہے، وہ گھر سے نکل کر مختلف ندیوں اور دریاؤں سے ہوتی ہوئی سمندر میں پہنچ جاتی ہے وہاں سے جزائر برمُوداکا رُخ کرتی ہے۔ یہ جزائر ریاستہائے متحدہ کے ساحل سے چھ سو میل مشرق میں واقع ہیں۔ یہ سفر تین سال میں ختم ہوتا ہے۔ وہاں یہ سمندر کی گہرائی میں انڈے دے کر مر جاتی ہے جب ان انڈوں سے بچے نکلتے ہیں تو یہ ہزاروں میل کا سفر کر کے اُسی ندی میں پہنچ جاتے ہیں جہاں سے ان کے والدین آئے تھے اور مرنے سے کچھ عرصہ پہلے یہ پھر جزائر برمودا کو لوٹ جاتے ہیں۔ یہ عجیب و غریب سلسلہ نامعلوم زمانوں سے جاری ہے اور شاید ابد تک جاری رہے گا۔

اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ لاکھوں سال پہلے امریکہ کا برّاعظم یورپ اور افریقہ سے متصل تھا اور دونوں کے درمیان پانی کی ایک خلیج حائل تھی جس میں یورپ کے دریا گرتے تھے۔ اور یورپ کی ایل اس خلیج میں انڈے دیتی تھی۔ بعد میں جب دونوں برّاعظم ایک دوسرے سے دُور ہٹ گئے۔ اور وہ خلیج سمندر بن گئی تو ایل اپنی عادت کو نہ بدل سکی۔ اور اس کا سفر جاری رہا۔

بحرالکاہل میں بعض دُور افتادہ جزائر اوشنیک جزائر کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں ایسے پرندے رہتے ہیں۔ جو اور کہیں نہیں ملتے۔ ڈارون (۱۸۰۹-۱۸۸۲ء) کے ایک رفیقِ کار الفرڈ ریس (۱۸۲۳-۱۹۱۳ء) کا خیال یہ ہے کہ ان پرندوں کو کوئی آندھی اڑا کر وہاں لے گئی تھی لیکن اس نظریہ پر کوئی شہادت نہیں مل سکی۔ طویل مشاہدہ کے بعد معلوم ہُوا کہ بلو در (ایک پرندہ) جو برٹش کولمبیا (جنوبی امریکہ) میں رہتا ہے۔ سردیوں کے آغاز میں ہر سال بحرالکاہل کے جزائر ہوائی میں چلا جاتا ہے۔ اور سردیاں وہیں گزارتا ہے۔ تئیس سو (۲۳۰۰) میل کی یہ مسافت وہ ایک ہی اُڑان میں طے کرتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے بچے جب پہلی دفعہ اس سفر پر روانہ ہوتے ہیں تو کسی رہنما کے بغیر وہ اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ بچوں کا وقتِ سفر بڑوں سے الگ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بہت پہلے ہوائی جزائر کولمبیا کے بہت قریب ہے۔ بعد میں جب برہائے اعظم ایک دوسرے سے

دُور سرکے تو یہ جزائر بھی پرے ہٹ گئے۔

سوال یہ ہے کہ بحر و بر کی ظلمتوں میں ایل اور ہلیو ورکی رہنمائی کون کرتا ہے؟

(ہم جانتے ہیں کہ حیات کا جو تصوّر ہم پیش کر رہے ہیں وہ ان عُلماء کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہوگا جو اجسامِ حیوانی کو فزکس اور کیمسٹری کی روشنی میں سمجھنا چاہتے ہیں۔ علم الجنین (رحمِ مادر میں بچے کی تشکیل کا علم) کے طلبہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبُور ہیں کہ نخر مایہ اور خلیوں کے علاوہ کچھ اور بھی ہے جو بچّے کی تشکیل میں حصّہ لیتی ہے اور وہ مادّی نہیں۔ آج کوئی شخص یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ انسان محض ایک مشین ہے جو فزکس اور کیمسٹری کی مدد سے تیار ہوئی ہے۔ بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ ہر زندہ شے میں ایک دماغ نہاں ہے جو خالقِ کائنات کا خاص عطیّہ ہے۔ یہی دماغ حالات کا مقابلہ کرتا اور نشو و نما پر نظر رکھتا۔ اور اسی سے حیات تکمیل کی راہوں پہ بڑھتی ہے۔)

"Can anyone seriously suggest that this directing and regulating power originated in chance encounters of atoms? Can the stream rise higher than its fountain."

(ولیم میکبرائیڈ)

(کیا کوئی شخص سنجیدگی سے یہ کہہ سکتا ہے کہ کائنات میں نظم و ضبط قائم رکھنے والی اور راہ دکھانے والی قوّت جواہر کی اتفاقیہ آمیزش سے پیدا ہو گئی ہے۔ کیا کوئی ندی اپنے منبع سے بلند تر سطح پر بہہ سکتی ہے؟)

اس پُر بہار فطرت کے حسین مناظر سے لطف اندوز ہونا لیکن ان میں خالقِ مناظر اور اُس کی صفات کا عکس نہ دیکھنا دلیل کم نظری ہے۔)

"He who planted ears shall He not hear".

(جس ہستی نے ہمیں کان عطا کیے، کیا وہ خود وصفِ سماعت سے محروم ہے؟") (۷۵:۵)

باب ۲۶

لیمارک اور ڈاروِن کا نظریّہ ارتقاء

اس نظریے کی تان یہاں آکر ٹوٹتی ہے کہ مادہ فی الحقیقت اپنا خالق آپ ہے۔ جس چیز کی مادّہ کو ضرورت ہوتی ہے وہ اپنی احتیاج اور ضرورت کے مطابق اپنے اندر سے آہستہ آہستہ خود بخود پیدا کر لیتا ہے اور جس چیز کی اسے ضرورت نہیں ہوتی وہ آہستہ آہستہ خود بخود ختم ہو جاتی ہے، بالفاظِ دیگر مادہ کی تخلیق، تنظیم و ترتیب اور اس میں حسن پیدا کرنے کے لیے کسی خالق کے بیرونی ہاتھ کی ضرورت نہیں ہے اور نہ کسی خالق کا وجود ہے۔

فرانس کے ایک سائنس دان لیمارک جین (Lamarch Jean) نے کہا تھا کہ "عادت یا معمول کے بدل جانے سے حیوانات مجبور ہو جاتے ہیں کہ بعض اعضاء کو زیادہ اور بعض کو کم استعمال کریں۔ زیادہ استعمال ہونے والوں کا حجم size بڑھ جاتا ہے اور کم استعمال ہونے والوں کا کم ہو جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر عادت کے بدلنے سے ان کی ساخت بدل جاتی ہے۔ ارتقاء دراصل تبدیلیِ عادت کی تعریف ہے۔" (۵ : ۷۶)

لیمارک نظریّہ ارتقاء کے بانیوں میں سے ہے اور ڈاروِن نے اس سے کافی استفادہ کیا۔ القصّہ ان کے نظریے کے مطابق انسان یا حیوان کے جسم کی وہ چیز جو استعمال میں نہ آ رہی ہو اسے رفتہ رفتہ ختم ہو جانا چاہیے۔ اور جو چیز زیادہ استعمال ہو رہی ہو اسے بڑھتے چلے جانا چاہیے۔

جنین کا جسمانی نظام

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ چیز جو کبھی بھی استعمال نہیں ہوئی بلکہ اسے کہیں مستقبل بعید میں جا کر استعمال ہونا ہے آخر اس کے وجود میں آنے اور بڑھتے رہنے کی ڈاروِن کے نظریّہ ارتقاء

ہیں کیا توجیہ ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ جانور کے پیٹ میں بچہ بہت سے ایسے اعضا لیے ہوتے ہے، جنہیں وہ استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ ان اعضاء کو استعمال کرنے کی صورت میں اسے شدید نقصان کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ماں کے پیٹ میں ہر بچہ اپنے سینے میں پھیپھڑے لیے ہوتے ہے۔ وہ ان پھیپھڑوں کو ہرگز ہرگز استعمال نہیں کر سکتا بلکہ اگر جنین کے پاس ذرا سی بھی ہوا پہنچ جائے تو اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ پھیپھڑے کس طرح وجود میں آگئے۔ اور کیوں وجود میں آئے اگر لیمارک کا نظریۂ ارتقاء درست ہے اور مادّہ اپنی فوری ضرورت کے تحت اپنے اعمال کے ذریعے اپنے آپ کو خود بخود پیدا کرتا ہے تو پھیپھڑوں کے ماں کے پیٹ کے اندر پیدا ہونے کی کوئی گنجائش نہیں یہ پھیپھڑے نہ تو بچّہ پیٹ کے اندر استعمال کرتا ہے اور نہ کر سکتا ہے بلکہ ان کی ضرورت تو اسے ماں کے پیٹ سے نکلنے کے چند ماہ گزرنے کے بعد پیش آئے گی۔ اس کی توجیہ ان کے نظریۂ ارتقاء میں ہرگز ہرگز ممکن نہیں ہے بلکہ اس کی توجیہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک مُدبّر ہستی ہے جو کہ ایک طویل پروگرام ذہن میں رکھتی ہے اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بچّے کے جسم میں پھیپھڑے اور دوسرے اعضاء بنا رہی ہے جو کہ کئی ماہ بعد جا کر استعمال ہونا ہیں۔ یہ بات صرف پھیپھڑے کے لیے نہیں بلکہ پُورے نظامِ تنفّس کے لیے ہے۔ اس کی سانس کی نالی، اس کی ناک، اس کی ہر وہ چیز جس کا تعلق سانس لینے سے ہے وہ ماں کے پیٹ میں تیار ہو جاتی ہے حالانکہ اس کی وہاں کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

یہی حال ماں کے پیٹ میں جنین کی آنکھوں کا ہے۔ بچّہ ماں کے پیٹ میں اشیاء کو دیکھتا نہیں ہے لیکن کئی ماہ بعد آنے والی ضرورت کی پیش بندی کے لیے اس کو آنکھیں ماں کے پیٹ میں ہی عطا کر دی جاتی ہیں۔ اور ان کی نشوونما ماں کے پیٹ میں ہی مسلسل ہوتی چلی جاتی ہے۔

تو ثابت ہُوا کہ کسی چیز کا استعمال ہونا یا اس کی فوری ضرورت کا درپیش ہونا اس کے وجود میں آنے کا سبب نہیں ہے بلکہ بہت سی ایسی چیزیں بھی وجود میں آجاتی ہیں جن کی ضرورت بہت عرصے

کے بعد پڑتی ہے۔ یہی حال ماں کے پیٹ میں بچے کے نظامِ ہضم کا ہے۔ بچہ سیدھے ماں کے پیٹ سے ماں کی ہضم شدہ غذا اپنی ناف کے ذریعے جذب کر لیتا ہے۔ اسے کسی چیز کو ہضم کرنے کی ماں کے پیٹ میں ضرورت پیش نہیں آتی۔ لیکن غور سے دیکھیے اس کا نظامِ ہضم، اس کا معدہ، بڑی آنت، چھوٹی آنت، غذا کی نالی حتیٰ کہ تمام کی تمام چیزیں از خود نشوونما پا رہی ہیں حالانکہ وہاں نہ تو ان کے استعمال کی ضرورت ہے اور نہ کوئی ارتقائی تقاضا درپیش ہے جس کی وجہ سے کوئی ایسی ضرورت درپیش ہو کہ یہ اشیاء خود بخود ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے پیدا ہوں اور پھر نشوونما پاتی چلی جائیں۔ یہی حال جنین کے نظامِ عصبی اور بہت سے دوسرے اعصاب کا ہے کہ وہ صرف آئندہ مستقبل بعید کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پیدا کی جاتی اور نشوونما دی جاتی ہے ان کی نشوونما میں فوری ارتقائی قوت درپیش نہیں ہوتی۔ ماں کے پیٹ سے پیدا ہو جانے کے بعد انسان کے جسم میں بہت سے اعضاء ایسے نظر آتے ہیں جو اپنی کوئی ضرورت پوری نہیں کر رہے بلکہ جسم کے بعض دیگر اعضاء کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ اور ان کے خادم کے فرائض سر انجام دیتے ہیں مثلاً ناک کو ہی لیجیے۔ (ھ: ۷۷، ۷۹، ۱۰۷)

ناک کا عمل

ذرا اپنے ناک کے عمل پر غور فرمایئے۔ یہاں پر ڈارون کا نظریۂ ارتقاء ناکام ہوتے ہوئے نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ ناک جو کچھ بھی کرتی ہے وہ اپنے لیے نہیں بلکہ پھیپھڑوں کے لیے کرتی ہے۔ ناک کے اندر ایک طویل، پیچیدہ، منحنی اور نرم ہڈی ہے جو نتھنوں کو جُدا کرتی ہے اور ہوا ان دو نتھنوں میں سے ہوتی ہوئی اور پھر سانس کی نالی میں سے گزرتی ہوئی پھیپھڑوں کی طرف جاتی ہے۔ ناک میں کئی خم کھاتی ہوئی یہ نرم ہڈی ہوا کو صاف کرنے کا کام دیتی ہے۔ اس ہڈی پر رطوبت لگی ہوتی ہے تاکہ گرد و غبار اور جراثیم اس رطوبت سے چپک جائیں اور سانس کی نالی یا پھیپھڑے تک پہنچنے سے پہلے پہلے صاف ہو جائیں اور پھر یہ ہڈی اس قدر طویل ہے کہ ہوا اس کے دیواروں میں سے گزرنے

ہوتے پھیپھڑے کے درجۂ حرارت کو اختیار کر لیتی ہے۔ اگر گرمیاں ہوں تو ناک کی یہی ہڈی گرم ہوا کو ٹھنڈا کر دیتی ہے اور اگر سردیاں ہوں تو ٹھنڈی ہوا کو گرم کر کے بھیجتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سردیوں میں ناک سُرخ نظر آتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سردیوں میں ناک کو ہوا گرم کرنے کے لیے زیادہ خون کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ سُرخ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سے سانس لیتے ہوئے ہوا اگر خشک ہو تو ناک کی یہ ہڈی سانس لیتے ہوتے اس میں رطوبت شامل کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ہوا بہت مرطوب ہو تو ناک کی یہی ہڈی رطوبت میں کمی واقع کر دیتی ہے تاکہ پھیپھڑے بالکل صحیح ہوا اخذ کر سکیں۔ یہاں پر ہم نظریۂ ارتقاء ماننے والوں سے یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر جسم کا ہر عضو اپنی اپنی مصلحت کے مطابق کام کرتا ہے تو ناک تو اپنی مصلحت کے لیے کوئی کام نہیں کر رہی، یہ تو صرف پھیپھڑے کے دربان اور سنسر بورڈ کا کام کر رہی ہے۔ یہ تو صرف پھیپھڑے کی خدمت کر رہی ہے، اپنی خدمت کے لیے تو کچھ بھی نہیں کر رہی بلکہ صرف قربانی دیتی ہے۔ باہر کی ہوا کی گندگی، جراثیم اور سردی کو برداشت کرتی ہے اور اکثر نزلہ اور زکام کا مظہر بنے رہتی ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی عظیم ہستی خالق ہے جو پھیپھڑوں کے لیے ناک سے یہ کام لے رہی ہے اور جسم کے مختلف اعضاء میں باہمی تعاون کی صورت پیدا کر رہی ہے۔

اس موقع پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناک، پھیپھڑے، ہوا کی نالی، معدہ اور آنتیں وغیرہ ماں کے پیٹ میں کسی فوری ارتقائی ضرورت کے تحت وجود میں نہیں آئے بلکہ ماں باپ کی طرف سے ورثہ میں ملے ہیں۔

بہت اچھا! مگر ہمارا اصل سوال یہ ہے کہ جب یہ اعضاء پہلی مرتبہ وجود میں نہیں آئے ہونگے تو اس وقت کیا صورت پیش آئی ہو گی۔ کیا یہ اعضاء پہلی مرتبہ ماں کے پیٹ میں وجود میں نہیں آئے، اگر پہلی مرتبہ بھی ماں کے پیٹ میں وجود میں آئے تو سوال جوں کا توں باقی رہا۔ ماں کے پیٹ میں تو ناک، آنکھ، اعضائے تنفس و اعضائے ہضم کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہ ارتقائی نہ غیر ارتقائی۔

اور اگر یہ اعضاء ماں کے پیٹ سے باہر رفتہ رفتہ وجود میں آتے ہیں تو پھر ہمارا سوال اور بھی زیادہ مشکل ہے اور وہ یہ ہے کہ کتنا عرصہ تک انسان اعضائے تنفس اور اعضائے ہضم کے بغیر زندگی گزارتا رہا ہے؟ کیا سانس لیے بغیر اور کچھ کھائے پیے اور ہضم کیے بغیر وہ چند لمحے بھی گزار سکتا ہے؟ اس کا جواب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کو ایک ہی مرتبہ کامل طور پر پیدا فرما دیا!

حقیقتِ ارتقاء:-

ایم۔ایم۔مٹکاف (ڈاکٹر آف سائنس) اپنے مضمون "کائنات کا حکیمانہ پلان اور حیوانات" میں لکھتے ہیں:

"کیا کائنات کا وجود کسی حکیمانہ پلان (منصوبے) کا نتیجہ ہے، یا یہ سب کچھ محض اتفاق ہے؟ اس حقیقت پر کافی شہادت موجود ہے کہ یہ کائنات ایک منصوبے اور نقشے کے مطابق وجود میں آئی تھی؟

اگر ہم حیات پر ایک متجسّسانہ نظر ڈالیں تو جو چیز ہمیں سب سے زیادہ متاثر کرے گی وہ ہے حیات کا ماحول سے نباہ۔ مثلاً مچھلی کو دیکھیے، اسے پانی میں رہنے اور تیرنے کے لیے تمام وہ ساز و سامان عطا ہوا جس کی اسے ضرورت تھی۔ مثلاً لمبوترا جسم جو پانی کو بآسانی چیر سکے۔ آگے کو دھکیلنے والی دم۔ دائیں بائیں دو چپو۔ توازن قائم رکھنے کے لیے ایک بلیڈر۔ سانس لینے کے لیے گلپھڑے اور ایسی ہی کئی دیگر اشیاء۔

پرندوں پر نظر ڈالیے، انہیں بھی وہ تمام چیزیں ملیں جو انہیں درکار تھیں مثلاً ہوا کی ایک تھیلی۔ گرم گیس سے پُر کھوکھلی ہڈیاں اور باہم مربوط پنکھ۔ یہ بے شمار حشرات۔ گھونگے اور کیڑے اپنے ماحول کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ماحول سے نباہ ہر ذی حیات کا خاصہ بن چکا ہے۔

جب کوئی جانور ایک طرزِ حیات کو چھوڑ کر دوسرا طرزِ حیات اختیار کرتا ہے تو وہ ماحول سے

نباہ کا انداز بھی بدل لیتا ہے۔ مینڈک کا بچہ جب تک پانی میں رہتا ہے۔ مچھلی کی طرح گلپھڑوں سے سانس لیتا ہے اور جب خشکی پہ آتا ہے تو اس کا وہ بلیڈر جس سے وہ تیرنے میں مدد لیتا تھا پھیپھڑہ بن جاتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی والے جانور جو خشکی پر رہتے ہیں انہیں آبی زندگی کا کوئی ساز و سامان نہیں ملتا۔ اور یہ ماں کے پیٹ ہی سے پھیپھڑوں کا مکمل نظام ساتھ لاتے ہیں۔

اس نباہ کی ایک اور مثال دل کی ہیئت میں تبدیلی ہے۔ مچھلی کی ایک نوع ایمفیاکسس Amphioxus کہلاتی ہے۔ اس کا دل ایک ٹیوب کی طرح ہے جو بار بار سکڑتی اور پھیلتی ہے اور یوں خون کو آگے دھکیلتی ہے۔ مچھلی کی دیگر انواع میں یہی ٹیوب سخت ہو کر خانوں میں بٹ جاتی ہے۔ ان خانوں کو ایک دوسرے سے ایک یک طرفہ والو جدا کرتا ہے۔ ان مچھلیوں میں گردشِ خون کا راستہ مقرر ہے، کہ یہ پہلے گلپھڑوں میں پہنچتا ہے اور وہاں سے آکسیجن لے کر جسم میں پھیل جاتا ہے۔ ہوا میں سانس لینے والے جانوروں کا نظامِ دل مختلف ہے یہ پھیپھڑوں سے آکسیجن حاصل کرتے ہیں۔ اور ان کے دل میں دو نالیاں ہوتی ہیں۔ ایک دل کے دائیں طرف اور دوسری بائیں جانب۔ دائیں نالی خون کو پھیپھڑوں کی طرف دھکیلتی ہے۔ وہاں سے یہ دل کی بائیں نالی میں آجاتا ہے۔ اور پھر جسم میں پھیل جاتا ہے۔

دیکھا آپ نے کہ ماحول کے دباؤ سے دل نے کتنی شکلیں بدلیں۔ کسی وقت وہ ایک ٹیوب تھا۔ پھر وہ پورا غیر منقسم دل بنا اور اعلیٰ حیوانات میں اس کے دو حصے ہو گئے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آنکھ ایک نہایت پیچیدہ، نازک اور ناقابلِ فہم تخلیق ہے۔ انسانی ذہن سوچ ہی نہیں سکتا کہ یہ زندگی کے کن مراحل سے کب اور کیسے گزری؟ تخلیق و صناعی کے ان معجزات کو دیکھ کر انسان حیرت میں کھو جاتا ہے اور اس نتیجہ تک پہنچنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ کائنات پلان اور مقصد کے بغیر نہیں ہے یہاں اتنے ہی پلان (سکیم) ہیں جتنی اشیاء، یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر شے پر ایک الگ آرٹسٹ مقرر ہے جو اس کی تشکیل و تزئین میں مصروف ہے، اور ساتھ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ہر چیز اپنے ماحول میں

فٹ ہونے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کر رہی ہے اور اگر وہ اس کوشش میں ناکام ہو جائے تو مٹ جاتی ہے۔ اس کی مثال وہ قدیم بحری یا بری جانور ہیں جن کے جسم بڑھتے بڑھتے کئی سو کیوبک فٹ تک پھیل گئے تھے لیکن آلاتِ ہاضمہ ان کا ساتھ نہ دے سکے اور وہ ہلاک ہو گئے۔

حیوانات میں کتنی ہی ذہانت کیوں نہ ہو، انہیں تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ ان میں صلاحیّتِ حیات ماحول میں فٹ ہونے سے پیدا ہوئی ہے۔ نباہ کا یہ عمل از خود نہیں ہو رہا، بلکہ کوئی دانش پسِ حجاب مصروفِ کار ہے۔

انسان کائنات کا ایک جزء ہے۔ یہ صاحب خرد ہے، اس کے اقدامات بامقصد ہوتے ہیں۔ یہ عزت، وفا اور دیگر اوصافِ حسن و جمال سے متّصف ہے اور یہ خیر و شر کی تمیز بھی کر سکتا ہے۔ کیا خود کائنات ان اوصاف سے خالی ہے؟ کیا یہ جزو کل سے زیادہ دانش مند ہے؟

انسان دو چیزوں کا مجموعہ ہے جسم اور رُوح کا۔ رُوح جسم کی محرّک، آمر اور کنٹرولر ہے یہ حکم دیتی ہے اور جسم تعمیل کرتا ہے خدا کائنات کی رُوح ہے اور اس لیے کائنات کا آمر و ناظم بھی۔

فطرت ظہور کے لیے بے تاب ہے، اس کا حُسن نہ صرف کوہساروں، ستاروں اور بہاروں میں نظر آتا ہے بلکہ انسان میں بھی پایا جاتا ہے۔ انسان ہر وقت خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور ظہورِ فطرت کا بہترین انداز یہی ہے]۔

[۵: ص ۱۴۵]

باب ۲۷

فلسفۂ مادّیت

اس میں شک نہیں کہ دَورِ جدید کے انسان نے اپنی چند روزہ دنیوی زندگی کو سنوارنے کے لیے اس قدر محنت کی کہ بہترین سے بہترین آسائشیں مہیا کر لیں۔ وہ فضا میں عقاب اور باز سے زیادہ تیز رفتاری سے اُڑ رہا ہے۔ سمندر میں مچھلیوں اور دریاؤں میں مگرمچھ کی طرح سے تیر تا پھر رہا ہے مگر افسوس کہ اسے زمین پر انسان کی طرح سے چلنا پھرنا نہیں آرہا وہ اپنی زندگی کے مقصد سے غافل ہے۔ اس کی زندگی معنویت سے محروم اور اس کی شخصیت بے رُوح ہو کر رہ گئی ہے۔

وہ مذہب اور اخلاق کی قیود سے آزاد ہو کر کچھ عرصے کے لیے تو پھولا نہ سمایا لیکن اُسے پتہ چل گیا کہ اس کا انجام سوائے پریشانی اور غم کے اور کچھ نہیں۔ اس وقت فلسفۂ مادیت کے زیر اثر زندگی گزارنے والا ہر انسان اس قدر پریشان ہے کہ وہ ذہنی امراض کے ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے مجبور ہے۔ وہ اپنے طریقۂ زندگی سے تنگ آچکا ہے۔ اس کو اپنی ذات سے اور اپنے ماحول سے نفرت ہے۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق اپنی تصنیف 'میری آخری کتاب' صفحہ ۶۹ میں بی۔ بی۔ سی کے نشریہ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۷۳ء (صبح ۶ بج کر ۱۰ منٹ) کے حوالے سے رقمطراز ہیں۔

"دنیا اس صورتِ حال سے اتنی تنگ ہے کہ ۲۶ مارچ ۱۹۷۳ء کو برطانیہ کے ایک شہر نوٹنگھم میں ۵۰ ہزار آدمیوں نے ناجائز بچوں اور اسقاطِ حمل کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا۔ بی۔ بی۔ سی کے ایک مبصر نے بتایا کہ ۱۹۷۲ء میں صرف نوٹنگھم میں ایک لاکھ ۵۹ ہزار ۲۵۰ بچے

پیدا ہوئے تھے، یعنی اندازاً ۴۵۰ بچے روزانہ۔

مغرب میں یہی ذلیل ترین گروہ ہے، غلیظ، بدکردار، تمام اخلاقی ضوابط کا منکر اور لوگوں کے سامنے کھلے بندوں فواحش کا ارتکاب کرنے والا۔ یہ گروہ ۱۹۳۰ء کے بعد ظاہر ہوا۔ آزادانہ جنسی فعل میں اتنی کشش تھی کہ تیس پینتیس برس میں اس کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی۔ ان میں نصف کے قریب دوشیزائیں تھیں۔ یہ لوگ اپنے گھروں سے نکل کر دنیا کے ہر حصے میں پہنچ گئے۔ خوب بدکاری کی، چرس، چانڈو، افیون اور بھنگ کا بے تحاشا استعمال کیا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ وہ اس طرح سے سکونِ قلب پائے گا لیکن اسے رسوائی، ذلت، نفرت اور غلاظت کے سوا اور کچھ نہ ملا۔ چنانچہ ان میں احساسِ زیاں پیدا ہوا اور ۱۹۷۵ء کے اواخر میں ۔ ۱۰ لاکھ ہیپیوں نے شکاگو میں اس صدی کا سب سے بڑا جلوس نکالا۔ ان کے ہاتھوں میں کئی لاکھ banners (کتبے) تھے جن پر مکتوب تھا:

"مذہب کی طرف واپس چلو"

یہ آواز چالیس سال کے تلخ تجربات، مسلسل رسوائی اور عالمی نفرت کا نتیجہ تھی"۔

(۶۹:۶)

مادیت کے دو روپ ــــ سرمایہ داری اور اشتراکیت

دورِ جدید میں فلسفۂ مادیت عملاً دو شکلوں میں نظر آتا ہے :

(۱) مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں۔

(۲) روس اور چین وغیرہ کے اشتراکی نظام کی شکل میں۔

سرمایہ دارانہ نظام :-

اس نظام میں عوام کو آزادی دی جاتی ہے اور اسی آزادی کے نعرے میں آزاد معیشت

اختیار کی جاتی ہے جس میں کارخانہ دار اور مزدور کو اپنی اپنی جگہ پوری پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہیں ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کریں، دونوں میں جس طرح سے سودا ہو وہ اپنی اپنی مزدوری اور اُجرت طے کر دیں اس آزاد معیشت کے خوبصورت نعرے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کارخانہ دار اور جاگیردار نے پورے ملک کی دولت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ اس طرح کہ اس نے اِفراطِ زر اور مہنگائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک مزدور کو اس کی پوری اُجرت دینے کی بجائے اسے اس بات پہ راضی کر لیا کہ وہ کم اُجرت پہ کام کرے۔ مہنگائی اور افراطِ زر کے زمانے میں ایک مزدور کے سامنے دو صورتوں میں سے ایک ہی صورت ہے یا تو وہ بالکل ہی کام نہ کرے اور شام کو خود بھی بھوکا مرے اور اس کے بچے بھی۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنی مزدوری کا حق مثلاً سو روپے لینے کی بجائے دس روپے لینے پر مجبور ہو جائے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کارخانہ دار مزدور کو سو روپے دینے کی بجائے دس روپے پکڑا دیتا ہے اور اس کی مزدوری کے نوّے روپے اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے۔ اس طرح سے وہ لاکھوں مزدوروں کی مزدوری ہڑپ کر کے ملک کی دولت کو اپنی مٹھی میں لے لیتا ہے، یعنی وہ امیر تر بن جاتا ہے اور غریب غریب تر۔ اس طرح سے سرمایہ دار ایک کارخانہ کی جگہ دس کارخانے وہ چار سالوں میں ہی لگا لیتا ہے اور اس کے باوجود جو رقم اس کے پاس استعمال سے بچ رہتی ہے اسے وہ سُود پہ لگا کر اپنی رقم میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے اور اہلِ ضرورت، غربا، مساکین کے پیٹ کاٹنے لگ جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں لامحدود ملکیت کا حق ہے۔ یعنی جو شخص بھی چاہے وہ اربوں، کھربوں ڈالروں کی دولت کا مالک بن جائے اور اس پر کسی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ بیچارے غریب مزدور چیختے چلّاتے رہ جاتے ہیں لیکن انہیں اپنا حق کبھی نہیں مل پاتا۔ یہی سرمایہ دار جمہوریت کے خوشنما نام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اقتدار پر مستقل قبضہ رکھتے ہیں اور غریب عوام کو رشوت دے کر ان سے ووٹ خرید لیتے ہیں اور عام لوگوں کو کبھی اقتدار کے پاس نہیں پھٹکنے دیتے۔

اشتراکی نظام

سرمایہ دارانہ نظام کے ظلم کے خلاف ایک ردِّ عمل کی صورت میں انسانی فکر نے ایک اور نظام پیش کیا لیکن اس سے بھی زیادہ ظالمانہ۔ اشتراکی نظام کے علمبرداروں نے یہ سوچا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ظلم کی اصل وجہ "حقِ ملکیت" ہے چنانچہ انہوں نے انسان کو حقِ ملکیت سے ہی محروم کر دیا۔ وہ یہ بھول گئے کہ اصل خرابی حقِ ملکیت میں نہیں بلکہ لامحدود حقِ ملکیت میں تھی۔ اصل خرابی ان لوگوں کے حقِ ملکیت میں تھی جو کروڑپتی تھے۔ ان لوگوں کے حقِ ملکیت میں کوئی خرابی نہیں تھی جن کے پاس صرف اتنی جائداد یا زمین کا ٹکڑا تھا جس سے وہ اپنا اور اپنے بچوں کا زراعت کر کے پیٹ پالا کرتے تھے وہ یہ بھی بھول گئے کہ حقِ ملکیت ہر انسان کا فطری حق ہے اگرچہ اس حد تک نہیں کہ وہ دوسروں کے حق میں ڈاکہ ڈالنے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ملک کی دولت کا بڑا حصہ بیس بائیس خاندانوں کے حصے میں آجاتا ہے اور وہ بھی ناجائز طریقے سے۔ یہ فی الواقع ضروری ہے کہ ان لوگوں کی ناجائز دولت کو چھین کر غرباء میں تقسیم کر دینا چاہیے، لیکن ان لاکھوں غریب کاشتکاروں کا کیا قصور ہے جن کے پاس بمشکل چند بیگھے زمین ہے اور وہ اسی پر گزارہ کرتے ہیں۔ اشتراکیت میں پوری کی پوری زمین خواہ کسی کے پاس زیادہ ملکیت میں ہو خواہ کم، سب کی سب چھین کر قومی ملکیت میں دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ جب اشتراکیت کی تنفیذ کرتے ہوئے شروع میں اشتراکیوں نے روس کے کاشتکاروں سے ان کی زمینیں چھینیں تو انہوں نے سخت مقابلہ کیا اور لاکھوں افراد گولیوں کا نشانہ بن گئے۔

امریکہ کا ایک نامہ نگار لکھتا ہے کہ "۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۲ء تک لینن نے ایک کروڑ بیس لاکھ روسی قتل کیے تھے۔" (ریڈرز ڈائجسٹ اپریل ۱۹۵۴ء صفحہ ۱۳۴)

بعد میں سٹالن نے جو ۱۹۲۴ء میں لینن کے مرنے پر برسرِ اقتدار آیا تھا ۱۹۵۳ء تک برسرِ اقتدار رہا اس نے کروڑ اور ڈیڑھ کروڑ کے درمیان انسان موت کے گھاٹ اتارے تھے (ایضاً صفحہ ۱۴۰)

یہ نہتے لوگ ٹینکوں سے کہاں تک لڑتے، بالآخر انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور بددل قیدیوں کی طرح کام کرنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کی پیداوار ختم ہوگئی۔ ملک روس زراعت میں خودکفیل نہ رہا۔ اسے غلّہ اور تمام اشیاء امریکی بلاک سے بھیک کے طور پر مانگنی پڑیں۔ آج سے کوئی چالیس برس پہلے حکومت نے ان مزدوروں کو زمین کے ۲ بز کا مالک بنا کر کہا کہ اس کی پیداوار تمہاری ہوگی تم جہاں چاہو اور جس طرح چاہو خرچ کرو۔ آپ یہ سُن کر حیران ہونگے کہ اس ۲ بز سے ملک کی بہ بز ضروریات پُوری ہونے لگیں۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے شخصی ملکیت ۲ بز سے بڑھا کر ۵ بز کر دی گئی اور ملک خودکفیل ہوگیا۔" (۶ : ص ۷۷)

اسلام کا معتدلانہ نظام

صاف پتہ چلتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت دونوں افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ ایک انتہا پر وہ ہیں اور دوسری انتہا پر وہ۔ سرمایہ دارانہ نظام نے امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بنا دیا۔ اس کے مقابلے میں اشتراکیت نے حقِ ملکیّت ختم کر کے پُورے ملک کو ایک جیل خانہ بنا دیا۔ حکومتی جماعت خود سب سے بڑی سرمایہ دار بن گئی جس کے پاس پُورے ملک کی دولت، پولیس، عدالت سب کی سب قُوّتیں جمع ہوگئیں اور وہ سب سے بڑا ظالم بن کے بیٹھ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اشتراکی نظام میں کسی شخص کو چیخنے چلّانے اور احتجاج کرنے کی بھی اجازت نہ رہی اور پُورے ملک کے باشندے قیدی بن کر رہ گئے۔

اس افراط و تفریط کے دوران آپ کو اسلام کا ایک نظام نظر آئے گا جس میں حقِ ملکیّت ہے مگر لامحدود نہیں۔ جس میں آزاد معیشت ہے لیکن کارخانہ دار کو مزدُور پر ظلم کرنے کا اور اس کی مزدُوری اپنی جیب میں ڈالنے کا کوئی حق نہیں۔ اس لیے کہ اُجرت مقرر کرنا کارخانہ دار اور مزدُور کا باہمی کام نہیں ہے بلکہ اس میں حکومت بھی ایک نگران کی حیثیت سے دونوں کے حقوق کی پوری پُوری حفاظت رکھتی ہے اور مزدُور کو کارخانہ دار اور جاگیردار کے ظلم سے ہر طرح بچا لیتی ہے۔ پھر یہ کہ اسلام کا نظام

دولت کو چند ہاتھوں میں سمٹنے نہیں دیتا بلکہ مختلف طریقوں سے جن میں وراثت سب سے اہم طریقہ ہے کئی ہاتھوں میں بانٹ کے رکھ دیتا ہے سب سے اہم یہ کہ سُود کی لعنت، جو کہ ارتکازِ زر کا اصل ذریعہ ہے ممنوع قرار دے دی گئی اور کوئی شخص بغیر محنت کیے محض سرمایہ کے زور پر سرمایہ نہیں کما سکتا۔

ان تینوں نظاموں کا مطالعہ کرنے کے بعد صاف پتہ چلتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام انسان کے بناتے ہوتے ہیں اور اسلام کا بنایا ہُوا نظام ایک ایسی مُدبّر ہستی کا بنایا ہُوا ہے جو کسی افراط و تفریط کا شکار نہیں اور زمانے کی لمبان خواہ کتنی ہی آگے کو بڑھ جاتے یہ نظام اپنے اندر اتنی لچک، عالمگیری اور آفاقیت رکھتا ہے کہ ہر جگہ اور ہر دَور میں اسی طرح سے کامیابی سے ہمکنار ہو گا جس طرح سے اپنے اوائل میں ہُوا۔

مادّیت کی شکست

(ہنس وریش۔پی۔ایچ۔ڈی۔ایس ڈی سی) اپنے مضمون "مادیّت کی شکست" میں لکھتے ہیں:-

"مادیت ایک نظریہ ہے جس کی تعلیم فلاطون و ارسطو کے یونان میں دی جاتی تھی۔ اس کے مطابق یہ کائنات صرف مادّہ سے تیار ہوتی ہے۔ رُوح مادہ ہی کی ایک صورت ہے، انسانی دماغ اور عقل بھی مادّی ہیں۔ انسانی تگ و دو صرف مادّی لذّات کے لیے ہے۔ زندگی کا انجام موت کی تاریکی ہے۔ اور آگے کچھ بھی نہیں جنّت و جہنّم اور خدا و ملائکہ کا تصور باطل ہے۔ اس نظریے کے مبلّغ آج بھی موجود ہیں۔ اشتراکی ممالک تمام کے تمام مادّہ پرست ہیں۔ اور اس قسم کے لوگ مذہب پسند ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں۔

اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں سائنس مادیّت کی گرفت میں آچکی تھی۔ کچھ سائنسدان مذہب پرست بھی تھے لیکن اُن کی تعداد بہت کم تھی۔ مادّہ پرستوں کی رائے یہ تھی کہ اس کائنات میں نہ کوئی پلان ہے نہ مقصد اور نہ کسی نوع کی رہنمائی۔ اشیاء عناصر کی آمیزش سے ظہور میں آتی ہیں

اور صرف وہی باقی رہتی ہیں جن کی تعمیر محکم ہو۔ ان کے ہاں جاندار و بے جان میں کوئی خاص فرق نہیں۔ جان بھی مادہ ہی کی ایک شکل ہے اور عناصر کی کارستانی۔ اس نظریہ پر بڑی لے دے ہوتی اور اس کے ہر پہلو پر اعتراض کیے گئے۔ ان میں سے ایک یہ کہ شعور ایک غیر مادی چیز ہے یہ مادہ سے کیسے پیدا ہوا، اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ شعور دماغ کی تخلیق ہے اور دماغ مادہ کی۔ اس جواب سے نہ وہ خود مطمئن ہوتے نہ کسی کو مطمئن کر سکے۔ یہ صورت بیسویں صدی کے آغاز تک قائم رہی۔

بیسویں صدی میں نظریات بدلنے لگے اور اس کی بڑی وجہ علوم میں اضافہ تھا۔ نیوٹن ۱۷۲۷ء کے دور میں فزکس ختم ہو گئی تھی اور اس کی جگہ نئی فزکس نے لے لی تھی جس نے نقطۂ نگاہ کو کلیتہً بدل دیا تھا۔ نئے نقطۂ نگاہ کے مبلغین میں امریکہ کا ممتاز فلسفی ولیم جیمز (۱۸۴۲ء۔ ۱۹۱۰ء) اور فرانس کا مشہور مفکر ہنری برگساں (۱۸۵۹۔ ۱۹۴۱ء) سر فہرست تھے۔"

آپ نے بزرگوں سے اس قسم کے جملے بارہا سنے ہوں گے کہ:

'یوں ہونا چاہیے'

'یہ جائز اور وہ ناجائز'

یہ کہنے والے کی ذاتی رائے نہیں ہوتی بلکہ انسانی ضمیر اور تاریخ کی آواز ہوتی ہے جو کسی حد تک دانشِ اعلیٰ کی ترجمانی کرتی ہے۔ انسان کے سامنے کوئی نہ کوئی منزل ضرور ہے جہاں تک پہنچنے کے لیے وہ بیتاب ہے۔ یہ راہ دانشِ اعلیٰ کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ دانشِ اعلیٰ کی رہنمائی ہی میں طے ہو سکتی ہے اسی رہنمائی کا نام پلان ہے اور منزل پہ رسائی کا نام مقصد۔

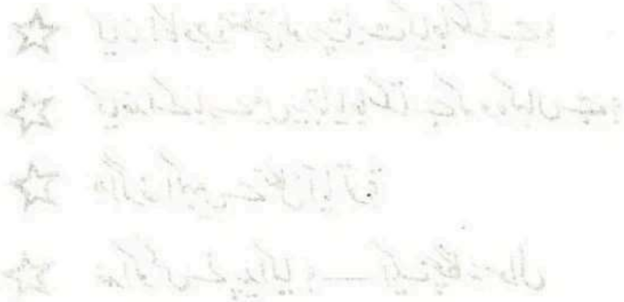
کائنات اتنی وسیع، پُراسرار اور پیچیدہ ہے کہ نہ تو انسانی فہم اس کا احاطہ کر سکتا ہے اور نہ موجودہ آلاتِ بینائی اس کا مشاہدہ۔ جتنا کچھ ہم دیکھ سکتے ہیں اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کائنات میں کوئی تخلیق بے مقصد نہیں۔ یہی وہ نتیجہ ہے جس نے مادیت کا زور توڑ دیا ہے۔ اور انسان کی توجہ روحانی

ماخذ و مصادر کی طرف ہو گئی ہے۔ فنونِ لطیفہ کا ماخذ روحانی ہے یعنی انسانی روح یا دماغ۔ یہاں شاید یہ وضاحت بے جا نہ ہو کہ دماغ کی بے شمار اقسام ہیں۔ چیونٹی کا دماغ بیل سے جُدا ہے اور بیل کا انسان سے۔ کائنات کے عظیم ترین دماغ کو ہم دانشِ اعلیٰ کہتے ہیں۔ اس میں اور انسانی دانش میں وہی فرق ہے جو عقدِ ثریا اور انگور کے گچھے میں ہے۔ ہالینڈ کے فلسفی اسپینوزا (۱۶۷۷ء) کا قول ہے:

"خدا کے اوصاف کا ذکر کرتے وقت ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ یہ درست کہ خدا سوچتا اور ارادہ کرتا ہے لیکن اس کی سوچ اور اس کا ارادہ ہم سے مختلف ہے۔ ہاں اس سے انکار نہیں کہ انسان خدا ہی سے ملتی جلتی ایک مخلوق ہے۔ اور یہ خدا ہی کی صورت پہ پیدا ہوا ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ یہ آفتاب تو نہیں لیکن اس کا ٹوٹا ہوا شرار یقیناً ہے۔"

ماحصل یہ کہ سائنس بڑھتے بڑھتے روحانیت کی لطیف و حسین منزل تک جا پہنچی ہے اور مادیت کے اندھیرے چھٹ رہے ہیں۔

[۵: ص ۱۴۹]



حصّہ ششم

دلائلِ عقلیہ مُتفرّقہ

— جزء اپنے کُل کو پیدا نہیں کر سکتا،
— مادہ رُوح و عقل کا خالق نہیں ہو سکتا،
— مادّی کائنات انسان کے لیے مُسخّر کر دی گئی ہے،
— انسان صاحبِ ارادہ ہونے کے باوجود بے بس ہے،
— خدا کے بنائے ہُوئے قانون میں آفاقیت۔

چند اہم گفتگوئیں :-

☆ کیا خدا کا وجود منطقی طور پر ثابت کیا جا سکتا ہے ؟
☆ کیا خدا کے بارے میں یہ بتایا جا سکتا ہے کہ وہ کہاں ہے ؟
☆ "اگر خدا کہیں سے نکل آیا تو ؟"
☆ خدا کو کس نے پیدا کیا ؟ —— ایک بچگانہ سوال



باب ۲۸

دلائلِ متفرّقہ

۱) جزء اپنے کُل کو پیدا نہیں کر سکتا

ہم بیان کر چکے کہ مادّہ مختلف برق پاروں سے بنا ہُوا ہے جن میں کہ الیکٹران پروٹان اور نیوٹران شامل ہیں۔ ان کی باہمی ترتیب کے اختلاف سے مختلف عناصر عالم وجود میں آتے ہیں۔ ان برق پاروں کی ترتیب کے اختلاف سے ایک مجموعہ سونا بن جاتا ہے اور دوسرا چاندی تیسرا لوہا۔ ہائیڈروجن کے جوہر میں صرف ایک الیکٹران ہوتا ہے۔ آکسیجن کے جوہر میں آٹھ اور کیلشیم میں بیس۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران کا وجود کہاں سے آگیا؟ انہیں کس نے بنایا اور پھر ان میں اس خاص درجے کی ترتیب اور ترکیب کس نے پیدا کی کہ وہ مختلف عناصر کو منصہ وجود میں لے کر آگئے۔ اور ہر عناصر کی پھر علیحدہ علیحدہ خصوصیات اور صفات پیدا ہوگئیں۔ کیا مادّہ نے خود ان کو پیدا کیا ہے؟ کیا مادہ کے اندر انہیں الیکٹرانز، پروٹانز اور نیوٹرانز میں سے کسی نے انہیں پیدا کیا ہے؟ اہم سوال یہ ہے کہ کیا ان برق پاروں میں سے ہی کچھ ایسے ہیں جنھوں نے دوسرے برق پاروں کو پیدا کر لیا ہے اور اپنے آپ کو بھی؟ اور پھر ان میں مختلف ترکیب پیدا کر کے مختلف تشکیلات وجود میں لے آئے؟

یہ سارے برق پارے تو ایٹم یعنی ذرّہ کا جزو ہیں۔ اور جزو کُل کو پیدا نہیں کیا کرتا۔

۲۔ مادّہ رُوح و عقل کا خالق نہیں ہو سکتا

جب ہم اپنی ذات کا مادّہ کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں صاف طور پر نظر آتا ہے کہ انسان

صاحب عقل ہے جبکہ مادّہ میں عقل و شعور نہیں ہے۔ انسان صاحب علم ہے اور مادہ میں علم نہیں ہے۔ انسان صاحبِ ارادہ ہے اور مادّہ ارادے سے محروم ہے۔ انسان میں سننے اور دیکھنے کی قوّتیں ہیں جبکہ مادہ ان قوّتوں سے خالی ہے۔ انسان میں جذبات و احساسات ہیں جبکہ مادہ تمام جذبات و احساسات سے یکسر خالی ہے۔ انسان صاحبِ اخلاق ہے جبکہ مادّہ میں اخلاق نام کی کوئی چیز نہیں

اب کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ مادّہ ایک ایسی چیز کو پیدا کرے جو اس سے زیادہ ترقی یافتہ ہو۔ انسان مادّہ اور رُوح دونوں پر مشتمل ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کل اپنے جزو کو پیدا کرے اور رُوح اور مادہ مل کے مادّہ کو پیدا کریں۔ لیکن یہ کسی طرح سے ممکن نہیں ہے کہ مادہ بیک وقت انسان کا یا رُوح اور مادہ کے امتزاج کا خالق ہو۔

کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان میں عقل اُس چیز سے پیدا ہو جاتے جس میں عقل موجود نہ ہو؟ یا انسان میں علم اُس چیز سے آجاتے جو خود علم سے خالی ہو؟ انسان میں ارادہ اُس چیز کے ذریعے پیدا ہو جو خود ارادے سے محروم ہو؟ یا انسان میں دیکھنے، سُننے اور سُونگھنے کی قوّتیں اُس چیز سے حاصل ہوں جو ان تمام خواص سے محروم ہے؟ انسان میں جذبات احساسات اس شے سے پیدا ہو جائیں جو جذبات و احساسات سے یکسر خالی ہے؟

اگر مادّہ خود کسی چیز سے یکسر خالی ہے تو وہ یہ چیز دوسروں کو کس طرح عطا کر سکتا ہے، جو خود محروم ہو وہ دوسروں کو کیا دے گا؟ اس سے ظاہر ہوا کہ مادّہ نہ تو خود اپنا خالق ہو سکتا ہے اور نہ کسی دوسری چیز کا۔ اس لیے کہ وہ تو بذاتِ خود عقل، علم، ارادہ، سمع، جذبات، اخلاق ہر چیز سے محروم ہے۔

۳۔ مادّی کائنات انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے:-

انسان نے کائنات کو اپنا مسخر اور محکوم بنالیا ہے۔ اور کائنات کی اکثر قوّتیں اس کے سامنے ذلیل خادم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انسان نے ہواؤں، سمندروں پہ قابو پالیا۔ سورج، چاند، مٹی ہوائیں

اس کی چاکری کر رہی ہیں حتیٰ کہ انسان مادّے، نباتات، حیوانات سب سے خدمت لے رہا ہے۔ اور یہ پوری کی پوری کائنات اس کے لیے منفعت کا باعث بن رہی ہے۔

تو معلوم ہوا کہ انسان حاکم ہے اور کائنات اس کی محکوم، مادّہ اس کا خادمِ ذلیل۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک محکوم اپنے حاکم کو پیدا کرے۔ ایک تسخیر شدہ غلام اپنے تسخیر کرنے والے کو وجود میں لے آئے، اور اسے پیدا کرے۔ ارشادِ ربّانی ہے :۔

" اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۔ (لقمان: ۲۰)

" کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے، سب کو خدا نے تمہارے قابو میں کر دیا ہے۔ اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔ اور بعض لوگ ایسے ہیں کہ خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔ نہ علم رکھتے ہیں اور نہ ہدایت اور نہ کتابِ روشن "

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان نے کائنات کو مسخّر کیا اور اس کا آقا بن گیا ہے اور جس طرح سے چاہتا ہے مادّی اشیاء کو اپنی مرضی کے مطابق تصرّف میں لاتا ہے اور مادّی کائنات کے بس میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ انسان کی تسخیر اور اس کے غلبے کے مقابلے میں دم مار سکے یا اس کے سامنے تمرّد سے پیش آئے۔ یا کسی طرح سے بھی اپنے نفع و ضرر کی مالک ہو۔ کائنات انسان کے سامنے ایک بے بس غلام کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب کیا کوئی غلام اپنے آقا کا خالق و مالک ہو سکتا ہے؟

ہ۔ انسان صاحبِ ارادہ ہونے کے باوجود بے بس ہے۔

ہر چند کہ انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے جو کچھ کرتا ہے اپنے ارادے و خواہش سے کرتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ جو کچھ چاہے کر گزرے، اس کے بہت سی خواہشیں اور ارادے ایسے ہیں

جو پورے نہیں ہو پاتے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ بیمار ہوتا ہے لیکن صحت مند ہونے کی خواہش پوری نہیں ہوتی۔ وہ غریب ہوتا ہے، امیر نہیں ہو سکتا۔ وہ بے اولاد ہوتا ہے صاحبِ اولاد نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ضرور انسان پر بھی کوئی با اختیار حاکم موجود ہے۔ جو یہ تصرفات کرتا ہے اور جس کی مرضی اور ارادے کے سب انسان تابع ہیں۔ پس یہی حاکم با اختیار اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

خدا کے بنائے ہوئے قانون میں آفاقیت

اسلام اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے۔ یہ ہر دور اور ہر جگہ میں قابلِ عمل ہے۔ اسلامی قانون میں آفاقیت اور عالمگیریت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقوامِ متحدہ میں اسلامی قانون کو بین الاقوامی قانون کے مصادر میں سے ایک مصدر تسلیم کیا گیا ہے جبکہ خود امریکی اور روسی قوانین کو بین الاقوامی شمار نہیں کیا گیا۔ خود غیر مسلم بین الاقوامی ماہرینِ قانون نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اسلامی شریعت تمام زمانوں میں صحیح طور پر قابلِ عمل ہے۔ (۱۳: ۱۲۵)

۱۹۳۲ء میں لاہاتے میں بین الاقوامی قانون کانفرنس ہوئی جس میں اس زمانے کی لیگ آف نیشنز سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ اسلامی شریعت کو بین الاقوامی قانون کے مصادر میں شمار کیا جائے۔ اس دور میں بھی بین الاقوامی قانون کے ماہرین نے اس باب کا اظہار کیا کہ اسلامی شریعت اپنے اندر عظمت، آفاقیت اور عالمگیری رکھتی ہے اور ہر زمانے میں قابلِ عمل ہے۔

(۱۳: ۱۲۶)

اسی طرح کی ایک بین الاقوامی قانون کی کانفرنس ۱۹۵۲ء میں پیرس میں منعقد ہوئی جس میں مختلف قوانین کے باہمی موازنہ کا بندوبست کیا گیا۔ اس میں ماہرینِ قانون نے مطالبہ کیا کہ فقہ اسلامی کے تفصیلی مطالعہ کے لیے ہر سال ایک کانفرنس منعقد کی جانی چاہیے حالانکہ ایسی کانفرنس پہلے دسویں سال منعقد کی جاتی تھی۔ ان حضرات کی رائے تھی کہ شریعتِ اسلامی کا گہری نظر سے مطالعہ و تحقیق کی جائے اور ہر سال تحقیق کے نتائج بین الاقوامی کانفرنس کی صورت میں پیش کیے جائیں۔ (۱۳: ۱۲۹)

اس میں شک نہیں کہ اسلام کا نظام قانون انتہائی عادلانہ اور اعتدال پسندانہ ہے جبکہ انسان کے بنائے ہوئے قوانین افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ ایک طرف دیکھیے کہ یورپ میں سزائے موت کو بے رحمی اور سنگدلی قرار دیا جاتا ہے حتیٰ کہ قاتل کو بھی سزائے موت دینے کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جرائم کی تعداد زیادہ ہوگئی اور ہر طرف قتل اور ڈاکہ زنی کی واردات بڑھ گئیں دوسری انتہا یہ ہے کہ روس، چین جیسے اشتراکی ممالک میں معمولی سی غلطی پر بھی گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔ ان دونوں انتہا پسندیوں کے برعکس اسلام میں سزائے موت صرف اس موقع پر دی جاتی ہے جہاں پر کہ وہ ازبس ضروری ہے۔

اسی طرح سے اسلام کا وراثت کا نظام بھی دیکھ لیجیے کہ روس جیسے ملک نے اسلام کے نظام وراثت سے بہت کچھ اپنا لیا ہے۔ خود برطانیہ اور امریکہ میں بھی وراثت کے نظام میں سے کافی دفعات شامل کی گئی ہیں۔ خود بھارت میں وِدوا بل پاس کیا گیا اور اب وہاں بھی بیواؤں کو شادی کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ یہ بات صرف طلاق اور نکاح کے قوانین سے متعلق ہی نہیں بلکہ اسلام کے تقریباً تمام قوانین کو دنیا کے عظیم حصے میں نافذ کیا گیا ہے۔

باب ۲۹

چند اہم گفتگوئیں

(۱) کیا خدا کا وجود منطقی طور پر ثابت کیا جا سکتا ہے؟

وجودِ باری تعالیٰ پر دلائل تو دیتے جا سکتے ہیں۔ آیاتِ بیّنات اور براہین تو کثرت سے دیے جا ہیں لیکن منطقی ثبوت کسی چیز کے بارے میں بھی نہیں دیا جا سکتا یعنی اس طرح سے جیسا کہ ۲+۲=۴ طالب علمی کے زمانے ایک صاحب بہت شوخی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے وجود پر شوخی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مجھے شرارت سُوجھی ان سے عرض کیا کہ اگر منطقی ثبوت کی ہی بات چل نکلی ہے تو سب سے پہلے ذرا اپنے ذاتی وجود کو ثابت کر دیجیے تو آج شام چلتے ہو جاتے۔

کہنے لگے اس کے لیے ثبوت کی کیا ضرورت ہے دیکھ لو سامنے کھڑا ہوں، مجھے تم حواسِ خمسہ سے محسوس کر سکتے ہو۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہو کیا میرے وجود میں کوئی شک ہے؟

مَیں نے کہا جی ہاں شک ہے، پہلے تو یہ ثابت کیجیے کہ اس وقت آپ جاگ رہے ہیں اور خواب کے عالم میں نہیں۔ اور نہ مَیں خواب کے عالم میں ہوں۔ اس لیے کہ بہت دفعہ خواب کے عالم میں بھی ایسا ہُوا کہ ہم نے بہت یقین کے ساتھ کسی چیز کو بطورِ ثبوت کے پیش کیا حالانکہ وہ سب کچھ خواب ہی تھا، اور کسی چیز کا وجود نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اپنی ذات کا وجود بھی اُس جگہ پر نہیں تھا یہاں تک کہ یہ بھی ہُوا کہ ہم نے خواب میں اپنے خواب تک کو بیان کیا ہے۔

اس پر وہ صاحب چکرا گئے، کہنے لگے مَیں تمہیں ایک گھونسہ رسید کرتا ہُوں تمہیں خود ہی پتہ چل جائے گا کہ مَیں موجود ہُوں یا نہیں۔

مَیں نے کہا کہ خواب میں بھی کتنی مرتبہ گھونسے بازی ہوئی ہے۔ لیکن وہ خواب ہی ہوتا ہے، نہ گھونسے کا وجود ہوتا ہے اور نہ گھونسہ مارنے کا۔

کہنے لگے کہ میاں یہ دیکھو کہ آیا زیادہ قابلِ ترجیح بات کیا ہے کہ مَیں موجود ہوں یا نہیں، یعنی (Most probable) کیا ہے۔ مَیں نے کہا اب تم راہ پر آتے پہلے تم ثبوت مانگ رہے تھے، اب تم یہ پُوچھ رہے ہو کہ دلیل دو۔ اب تم دلیل کی طرف آگئے ہو اور مختلف باتوں میں ترجیح ڈھونڈ رہے ہو۔ یہی کام ہم وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں بھی کر سکتے ہیں یعنی یہ تو فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ مختلف باتوں میں سے کون سی بات قابلِ ترجیح ہے لیکن کسی بات کا قطعی منطقی ثبوت دینا ناممکن ہے۔ یہی بات علامہ اقبالؒ نے فرمائی کہ ؎

تیری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
میری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

واضح رہے کہ فلسفہ کی تاریخ میں فلسفیوں کو یہ بات ثابت کرنے میں بہت مشکل پیش آئی کہ ان کا وجود ہے یا نہیں۔ فلسفی اور ریاضی دان رینے ڈیکارٹ (Descartas) نے اپنے وجود کے حق میں یہ دلیل دی "کہ مَیں سوچتا ہُوں اس لیے مَیں موجود ہوں" Cogito Ergo sum

حقیقت یہ ہے کہ ثابت تو اپنے وجود کو نہیں کیا جا سکتا، کجا یہ کہ کسی اور چیز کا منطقی ثبوت لائیں۔

۲۔ کیا خُدا کے بارے میں یہ بتایا جا سکتا ہے کہ وہ کہاں ہے :-

ایک صاحب نے کچھ اس طرح کا سوال مجھ سے کیا کہ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات میں کس جگہ پر ہے۔ مجھ سے گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی ان کا جملہ یہ تھا :

"Can you locate God in the universe"?

مَیں نے ان کے سوال کو احمقانہ سمجھتے ہُوئے اُنہیں ٹالنے کی کوشش کی تو انہوں نے پھر انگریزی

میں کہا : To my mind it does not appeal.

ترجمہ :- کہ "یہ بات میرے ذہن کو قابلِ قبول نہیں ہے"

مجھے موقع مل گیا، مَیں نے ان سے پوچھا کہ آپ mind کا لفظ اکثر استعمال کیا کرتے ہیں ذرا مجھے آپ بتا سکیں گے کہ آپ کا mind آپ کے جسم میں کس جگہ موجود ہے۔

Can you locate your mind in your body?

کہنے لگے کہ یہ تو بہت آسان ہے، میں اپنے جسم کے کسی حصّے پر بھی ہاتھ رکھ دوں وہ میرا mind ہے۔ مَیں نے کہا آپ نے یہ بات درست نہیں کہی، آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھیں گے تو وہ ہاتھ ہوگا Mind نہیں ہوگا۔ پاؤں کی طرف اشارہ کرینگے تو وہ پاؤں ہوگا mind نہیں ہوگا۔ اسی طرح سے سر حتیٰ کہ آپ کے بھیجے کو بھی آپ کا mind آپ کی شخصیت اور آپ کا ذہن نہیں کہا جا سکتا۔ کہنے لگے یہ تو بہت مشکل ہے۔

میں نے کہا کہ جب آپ اپنے جسم کے آقا (mind) کو اپنے جسم کے اندر نہیں بتا سکتے کہ یہاں ہے تو پوری کائنات کے آقا کی جگہ کا کس طرح تعیّن کر سکتے ہیں؟

When you can not locate your own mind in your own body, how can you locate the mind of universe in the universe?

ترجمہ :- جب تم اپنے ذہن کے بارے میں یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ تمہارے جسم میں کس جگہ موجود ہے تو تم پوری کائنات کے خدا کے بارے میں کس طرح یہ طے کر سکتے ہو کہ وہ فلاں جگہ پر موجود ہے"۔

وہی اصلِ مکان ولامکاں ہے
مکاں کیا شے ہے انداز بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے (اقبال)

۳۔ اگر خدا کہیں سے نکل آیا تو؟

سول سروسز اکیڈمی لاہور میں ایک مرتبہ کھانے کی میز پر وجود باری تعالیٰ پر گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک صاحب نے خوبصورت بات کہی کہ بھئی میں تو خدا کو اس لیے مان لیتا ہوں کہ اگر وہ نہیں ہے تو ہمارے اور کفار کے انجام میں خاص فرق نہیں ہے اور اگر وہ کہیں سے نکل آیا تو پھر کیا کرو گے اس لیے خیر اسی میں ہے کہ اس کا وجود مان لو اور جس قدر ہو سکے اس کی اطاعت کیے جاؤ۔

یہی بات حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ ایک مُنکرِ خدا سے کہی۔ آپ نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ موجود نہیں ہے تو مرنے کے بعد جو تمہارا انجام ہوگا وہی ہمارا بھی ہوگا۔ لیکن اگر ہمارے ایمان اور عقیدے کے مطابق خدا فی الواقع موجود ہُوا تو ہم ان شاء اللہ جنت میں جائیں گے اور ابدی کامیابی سے ہمکنار ہوں گے اور تم ہمیشہ ہمیش کی نامرادی و ناکامی کا شکار ہو گے اور دوزخ کا ایندھن بنو گے۔"

خدا کو کس نے پیدا کیا؟ ایک بچگانہ سوال!

اس سوال کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اب ایک اور زاویۂ نظر سے ہم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سوال بذاتِ خود اپنے اندر استحالۂ عقلی لیے ہوتے ہے اور اپنی تردید آپ Self contradiction کا ایک مظہر ہے۔ وہ یوں کہ اس طرح کا سوال تو خدا کے بارے میں کیا جا رہا ہے لیکن خدا کی اصل صفت کہ وہ خالقِ اوّل ہے اور اس کا کوئی خالق نہیں ہو سکتا، اس میں سے ہٹا دی گئی۔ اب ظاہر ہے کہ یہ سوال کہ خدا کو کس نے پیدا کیا، خدا کے بارے میں نہیں، خالقِ اوّل اور علّتِ اُولیٰ کے بارے میں نہیں بلکہ غیر خدا، غیر خالقِ اوّل یا مخلوق کے بارے میں کیا جا رہا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ پر استحالۂ عقل ہے کہ خدا بھی ہو اور مخلوق بھی خالق بھی ہو اور اُسے کسی نے

پیدا بھی کیا ہو۔ یہ جملہ کہ "خدا کو کس نے پیدا کیا"، اپنے اندر خود اپنی تردید لیے ہوئے ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ میں کسی سفید براق کپڑے کی طرف اشارہ کر کے یہ کہوں "یہ سیاہ رنگ کا کپڑا کتنا خوبصورت ہے۔ یہ سیاہ رنگ کہاں سے کروایا؟"

سننے والا یہی کہے گا کہ میاں اپنی نظر ٹھیک کرواؤ، یہ کپڑا سیاہ نہیں بلکہ سفید ہے۔ سیاہی کی صفت اس سفید و براق کپڑے میں تم نے خواہ مخواہ شامل کر دی ہے اور اس کی اصل صفت کہ وہ سفید ہے، تم نے ہٹا دی ہے۔ غالباً تم اس کپڑے کی نہیں، کسی اور کپڑے کی بات کر رہے ہو۔

یا اس کی مثال یوں ہے کہ میں کتابوں کی دکان پر جا کر کتابوں کی طرف اشارہ کر کے یہ پوچھوں کہ "یہ کوئلے کیا بھاؤ ہیں"۔

اب ظاہر ہے میں نے کتاب پن کی صفت ہٹا کر "کوئلہ پن" کی صفت شامل کر دی ہے اور میرا سوال اپنی جگہ بے محل ہے کیونکہ ایک ہی چیز بیک وقت کتاب اور کوئلہ نہیں ہو سکتی۔

بالکل اس طرح سے ایک ہی ہستی بیک وقت خدا اور مخلوق نہیں ہو سکتی۔ خدا کے بارے میں یہ سوال کرنا کہ "اسے کس نے پیدا کیا، خدا میں سے خالق اوّل کی صفت ہٹا کر، اسے مخلوق قرار دے دینے کے مترادف ہے۔ اب یہ سوال کہ "خدا کو کس نے پیدا کیا، خدا کے بارے میں نہیں بلکہ فی الحقیقت مخلوق کے بارے میں کیا جا رہا ہے۔

اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ آپ اپنی میز پر ایک کتاب رکھتے ہیں اور اس کے بعد اس کمرے سے باہر چلے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اس کمرے میں لوٹ کے آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ کتاب میز پر موجود نہیں ہے بلکہ میز کی دراز میں رکھی ہوئی ہے۔ آپ کو لازماً یہ یقین آ جائے گا کہ اس کمرے میں ضرور کوئی شخص آیا ہے جس نے کتاب کو میز سے اٹھا کر دراز میں رکھ دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ کتاب کی یہ صفت ہے کہ وہ اپنی جگہ سے خود حرکت نہیں کر سکتی۔

اب آیئے آگے بڑھتے ہیں۔ فرض کیجیے آپ کے کمرے میں ایک صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے

تھے کچھ دیر کے بعد آپ کمرے میں دوبارہ آتے تو وہ بستر پر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی اس نقلِ مکانی پر آپ کو کوئی حیرت نہیں ہوگی اور نہ یہ خیال آئے گا کہ ضرور کوئی اور شخص اس کمرے میں آیا ہے جس نے پہلے شخص کو کرسی سے اٹھا کر بستر پر بٹھا دیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ اچھی طرح سے اس شخص کی اس صفت کو جانتے ہیں کہ وہ از خود کرسی سے بستر پر منتقل ہو سکتا ہے۔ اور اس عمل کے لیے اسے کسی اور شخص کی حاجت نہیں ہے۔

اب اس دوسرے نقطے کو بھی ذہن میں رکھیے اور ہمارے ساتھ ذرا اور آگے بڑھیے۔

ہم جانتے ہیں کہ مادّی کائنات کی حقیقت اس کتاب سے ملتی جلتی ہے جو نہ خود حرکت کر سکتی ہے اور نہ اپنے کو پیدا یا فنا کر سکتی ہے۔ اس کی تخلیق، تنظیم، ترتیب اور بقا کے لیے خالق کا ہونا ضروری ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک کتاب یا کسی مادّی شے یا پوری مادّی کائنات کی یہ صفت ہے کہ وہ از خود نہ حرکت کر سکتی ہے نہ عملِ تخلیق۔ تو طے ہوا کہ اس کائنات کا وجود خالق و باری تعالیٰ کے بغیر تصوّر میں نہیں لایا جا سکتا۔

خدا کا وجود مان لینے کے بعد فوراً خدا کی صفات کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ کی صفتِ کمال یہ ہے کہ وہ سب کا خالق ہے اور اسے کسی نے پیدا نہیں کیا۔ وہ از خود موجود ہے اور اپنے وجود کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہے۔ جب یہ اس کے بنیادی صفت ٹھہری کہ کوئی اس کا خالق نہیں ہو سکتا تو یہ سوال اپنی جگہ پر انتہائی لغو ہے کہ "اسے کس نے پیدا کیا؟"

ہم نے دیکھا کہ ایک انسان میں کرسی سے منتقل ہو کر بستر پر جا بیٹھنے کی صفت موجود ہے تو ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا نہیں ہوا کہ اس شخص کو کرسی سے بستر پر کس نے منتقل کیا۔ پھر جب خدا کی صفتِ اصلی یہ ہے کہ وہ کسی کا پیدا کردہ نہیں ہے، تو یہ سوال بھی ہمارے ذہن میں نہیں پیدا ہونا چاہیے کہ "خدا کو کس نے پیدا کیا؟"

اس سلسلہ میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر ہم نعوذ باللہ تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض بھی کر لیں کہ خدا کو کسی اور نے بھی پیدا کیا ہے تو ایک ایسی مشکل میں پڑ جائیں گے کہ ہمیں واپس آ کر پھر سے یہ فرض کرنا

پڑے گا کہ خدا کو کسی نے پیدا نہیں کیا۔ یہ شکل منطق میں تسلسل دوری کہلاتی ہے۔ ملاحظہ ہو، چند قضیات میں بات واضح ہو جائے گی:۔

قضیۂ اوّل: دنیا میں تخلیق کا عمل موجود ہے (ہر گھڑی ہر شخص تخلیقی عمل کر رہا ہے)

قضیۂ دوم: ہر تخلیقی عمل کے لیے خالق کا ہونا ضروری ہے۔

قضیۂ سوم: ہر خالق کے لیے ایک اور خالق کا ہونا ضروری ہے۔

قضیۂ چہارم: یہ سلسلہ لا متناہی ہے۔ (یعنی ہر خالق کے لیے دوسرا خالق، اور اس سلسلہ کی کوئی آخری کڑی نہیں)

قضیۂ پنجم: خالق اوّل کا وجود نہیں ہے۔

قضیہ ششم: تخلیقی عمل کی ابتدا اور اس کا وجود غیر ممکن ہے۔

مگر قضیۂ ششم قضیہ اوّل سے ٹکرا رہا ہے۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم نے قضیۂ چہارم میں غلطی سے یہ فرض کر لیا تھا کہ ایک خالق کے لیے دوسرے خالق اور پھر تیسرے خالق اور اسی طرح اور خالق کا ہونا ضروری ہے اور یہ سلسلہ چلتا جاتا ہے اور اس کی کوئی حد یا انتہا نہیں ہے۔

یہ مفروضہ غلط تھا۔ یہاں پر صرف یہی فرض کیا جا سکتا ہے کہ ایک خالق کے بعد دوسرا خالق اور پھر تیسرا اور پھر چوتھا مگر یہ سلسلہ ضرور بالضرور کہیں جا کر ختم ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ متناہی اور محدود ہے اور اس کا ایک سرا لازماً موجود ہے اور وہی آخری سرا اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور وہ آخری سرا یہی ہو سکتا ہے کہ ایسی ہستی ہو جو خود خالق ہو مگر اسے کسی نے بھی پیدا نہ کیا ہو۔

اگر تخلیقی عمل کی اس زنجیر کا کوئی آخری سرا تسلیم نہ کیا جائے تو تخلیق، حرکت بلکہ خود عالم کے وجود کا انکار کرنا پڑے گا۔

حصّۂ ہفتم

التوحید

— توحید کی تین قسمیں : توحیدِ ربوبیّت، توحیدِ اسماء وصفات، توحیدِ الوہیت یا توحیدِ عبادت

— حقیقتِ شرک - شرک کی قسمیں، عبادتِ طاغوت

— اسبابِ شرک -

— مُشرکینِ مکّہ اور موجودہ دور کے مُشرکین کا تقابل

— لا الٰہ الاّ اللہ کا مطلب

لا معبُودَ الاّ اللہ

لا محبُوبَ الاّ اللہ

لا مُتَصرِّف فی العالم اِلاّ اللہ

لا مرجُوّ اِلاّ اللہ

لا مخوف اِلاّ اللہ

— وسیلہ اور توسّل، (امام ابن تیمیہؒ، امام ابُوحنیفہؒ اور امام قدوری کی آراء)

— فضیلۃ الشہادتین، (کلمۂ شہادت پر ایمان لانے کی اہمیت)

— نواقض الشہادتین (وہ اُمور جو ایمان کے ختم ہو جانے کا باعث ہیں)

— کتابیات

بابْ ۳

التوحید

الحمد للہ ربّ العٰلمین والصلاۃ والسّلام علیٰ رسولہ الکریم محمدٍ وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

انسان کی زندگی میں سب سے اہم کام، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانا ہے۔ جتنے انبیاء اور رسُول انسانیت کی طرف بھیجے گئے ہیں ان سب نے توحید کی دعوت دی ہے لیکن اس کے باوجود وہ مسئلہ جس میں انسانیت نے سب سے زیادہ کوتاہی کی ہے، وہ توحید ہے۔

توحید کی تین قسمیں:

انسان ہمیشہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا چلا آیا ہے اسے خالق، رازق اور مالک سمجھتا رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کی اُلوہیّت میں کسی نہ کسی درجہ شرک ضرور کرتا رہا ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم توحید کے موضوع پر تفصیلاً گفتگو کریں گے۔

توحید کی تین قسمیں ہیں:۔ توحید ربُوبیّت، توحید اسماء وصفات اور توحید اُلوہیّت (عبادت)

۱۔ توحیدِ ربُوبیّت

توحید کی یہ قسم اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کے وجود پر ایمان اور اس کے تنہا رب ہونے کے اقرار پر مشتمل ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات، اسماء وصفات، افعال، قضاوقدر اور حکمت کا اقرار کرنا اور اسی کو توحید

علمی و خبری بھی کہتے ہیں۔

یعنی یہ اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مالک، خالق اور رازق ہے اور وہی زندہ کرتا ہے، وہی مارتا ہے، اسی کے ہاتھ میں نفع و نقصان ہے، صرف وہی بے قرار کی دعا سنتا اور قبول کرتا ہے، کائنات کا ہر کام وہی چلاتا ہے، سب بھلائی اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

باب ۳۱

توحید الاسماء والصفات

یعنی یہ اقرار کہ تمام صفاتِ علیا اور اسمائے حسنیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہی ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِىْۤ اَسْمَآئِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ (الاعراف : ۱۸۰)

"سو اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں۔ سو ان ناموں سے اللہ ہی کو موسوم کیا کرو اور ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ رکھو جو اس کے ناموں میں کجروی کرتے ہیں۔ اُن لوگوں کو اُن کے کیے کی ضرور سزا ملے گی۔"

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۔ (الشوریٰ : ۱۱)

"کوئی چیز اس کے مثل نہیں ہے اور وہی ہر بات کا سننے والا، دیکھنے والا ہے۔"

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۔ (سورۂ اخلاص)

"آپ اِن لوگوں سے کہہ دیجیے کہ وہ یعنی اللہ اپنے کمالِ ذات و صفات میں ایک ہے۔ اللہ ایسا بے نیاز ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور اس کے سب محتاج ہیں۔ اس کی اولاد نہیں اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔"

اسلام سے پہلے عرب کا جاہل صرف اللہ تعالیٰ کے نام سے واقف تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ اور اس کی صفاتِ علیا اور افعال کے صحیح تخیّل سے بالکل بیگانہ تھا۔ عربوں کی شاعری میں کہیں کہیں اللہ کا

نام تو آتا ہے مگر اس کی صفات کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا۔

عیسائیوں، ہندوؤں اور مجوسیوں کے ہاں تجسیمِ صفات

ہاں اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک ناقص اور گمراہ کُن تصور عیسائیوں کے ہاں ضرور ملتا تھا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تین صفات کے پردے میں تثلیث کو جنم دیا۔ یعنی تثلیث کے اقانیم ثلاثہ باپ (خدا)، بیٹا (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) اور رُوح القدس۔ اللہ تعالیٰ کی تین صفات حیات، خلق اور علم سے عبارت ہیں۔

ہندوؤں کے ہاں بھی اصل گمراہی کا سبب اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی تجسیم ہے ان کے ہاں ہر صفت نے ایک مستقل وجود حاصل کر لیا۔ ان کے یہاں بھی ایک قسم کی تثلیث پائی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کی تین صفات، خالق، مُمیت (یعنی مارنے والا) اور قیوم کی تجسیم، برہما، مہیش اور وشنو کے مجسّموں کی صورت میں کر دی گئی ہے۔

جین مذہب میں اور خود ہندوؤں کے فرقوں میں خالقیت کی صفت کے تجسّم نے اعضائے تناسُل کی پرستش کی گمراہی پیدا کی۔ یہ درحقیقت اسماء و صفات کی تجسیم ہی ہے جس کی وجہ سے بُت پرستی کی نت نئی صورتیں پیدا ہوتیں۔

مجوسیوں میں یزدان اور اہرمن کی دوئی بھی اللہ تعالیٰ کی دو صفتوں ہادی اور مُضلّ کو دو الگ الگ مستقل ہستیوں میں منقسم کر دینے کا نتیجہ ہے۔

شرک فی الصفات اور علمِ غیب کا مسئلہ

یہ تو تھا اسماء و صفات کی تجسیم اور غلط تعبیر کا مسئلہ جس کا نتیجہ انتہا درجے کی بُت پرستی اور بدترین شرک کی صورت میں ظاہر ہُوا۔ توحید اسماء و صفات پہ ایمان نہ ہونے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض ایسی صفات میں جن میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں ہو سکتا، غیر اللہ کو شریک کر دیا جائے۔

مثلاً یہ کہ علمِ غیب صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اگر انبیاء، اولیاء یا ملائکہ کو علمِ غیب کی صفت سے متصف سمجھ لیا جائے تو یہ شرک فی الصفات ہوگا۔ یہ مسلمانوں کی بہت بڑی بدنصیبی ہے کہ ان کی بہت بڑی تعداد شرک کی اس خطرناک قسم میں گرفتار ہے، یہ لوگ اپنی جہالت کے سبب یہ سمجھتے ہیں کہ انبیاء اور اولیاء کو علمِ غیب حاصل ہے۔ ان میں سے بعض کا یہ عقیدہ ہے کہ انبیاء و اولیاء کو ہر چیز کا علم ہوتا ہے بلکہ یہ علم ان کی ذاتی صفت ہے۔ اس کے لیے انہیں کسی ذریعہ و وسیلہ کی محتاجی نہیں۔ یہ لوگ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں "عالم ما کان وما یکون" (جو کچھ تھا اور جو کچھ ہوگا سب کا علم رکھنے والا) یعنی کلّیتہً علّام الغیوب ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اگر یہ بات درست ہوتی تو حضورؐ کے پاس جبریلؑ کے ذریعہ وحی بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ دیکھیے قرآنِ مجید اس معاملے میں کس قدر وضاحت سے اپنا موقف بیان کرتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

"وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ" (الانعام: ۵۹)

"اور خدا کے پاس ہی غیب کی کنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔"

"قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ" (انعام: ۵۰)

"اے پیغمبر کہہ دو کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔"

"قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ" (نمل: ۶۵)

(اے پیغمبر) "کہہ دے کہ خدا کے سوا آسمانوں میں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔"

وہ لوگ جو انبیاء و اولیاء یا اہلِ قبور کے صاحبِ تصرّف، مختارِ کُل اور عالم الغیب ہونے پر ایمان رکھتے ہیں ان کو مندرجہ ذیل آیات پر غور کرنا چاہیے اور پھر اپنے ایمان کی صحت کا جائزہ لینا چاہیے:۔

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ

لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ـ

(الاعراف : ۱۸۸)

"اے نبی تو کہہ دے کہ میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے کا اور بُرے کا مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں جان لیا کرتا غیب کی بات تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھ کو بُرائی کبھی نہ پہنچتی۔ میں تو بس ڈرانے اور خوشخبری سنانے والا ہوں ایماندار لوگوں کو۔"

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوْحٰى إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ـ (الاحقاف : ۹)

"ان سے کہو میں کوئی نرالا رسُول تو نہیں ہُوں۔ میں نہیں جانتا کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہونا ہے اور میرے ساتھ کیا، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہُوں۔"

یہی حال اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات کا بھی ہے کہ لوگ اس میں بھی غیر اللہ کو شریک کرتے ہیں اور شرک فی الصفات والاسماء کے مرتکب ہوتے ہیں۔

علمِ غیب کے بارے میں صحیح عقیدہ یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی عالم الغیب ہے۔ ہاں اپنے بندوں میں سے وہ جس کو چاہے، جب بھی، جتنا چاہے اپنی طرف سے علم عطا فرما دیتا ہے۔ وہ چاہے تو سیدنا یوسف علیہ السّلام گھر کے قریب کنوئیں میں پڑے رہیں اور ان کے والد یعقوب علیہ السّلام کو خبر نہ ہو اور اگر وہ چاہے تو اسی بیٹے کی قمیص کی خوشبو مصر سے کنعان پہنچا دے۔ وہ چاہے تو حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کو ڈیڑھ ہزار سال بعد پیش آنے والے واقعات کا علم عطا کر دے اور چاہے تو انہیں ان کی اپنی محبوب بیوی عائشہؓ کے بارے میں پورے ایک ماہ تک صحیح صورتِ حال معلوم نہ ہو سکے یہاں تک کہ سُورۃ نُور کی آیات نازل ہوئیں اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت پر مُہرِ قرآن ثبت ہُوئی۔ بالفاظ دیگر علمِ غیب کسی بھی شخص کی ذاتی صفت نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، جس کو جتنا چاہے علم عطا فرما دے۔

باب ۳۲

توحیدِ اُلوہیّت یا توحیدِ عبادت

اِس موضوع پر سب سے اہم بات یہ ہے کہ توحیدِ ربوبیّت اور توحید اسماء وصفات کے ہوتے ہوتے بھی انسان دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہوتا جب تک کہ اسے توحیدِ اُلوہیّت پر ایمان نہ نصیب ہو جائے۔ ہم آگے چل کر تفصیل سے بتائیں گے کہ توحیدِ رُبوبیّت پہ تو کفارِ مکہ بھی ایمان رکھتے تھے۔ ہاں جو بات جھگڑے کا باعث بنی وہ توحیدِ اُلوہیّت تھی۔ اور زمانہ ماضی میں بھی تمام انبیاء اور ان کے مخاطبین کے درمیان جو بات اصل محلِ نزاع رہی وہ توحیدِ اُلوہیّت ہی تھی اس لیے کہ اس توحید کا تعلق بندوں کے ان افعال سے ہے جو کہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ مثلاً دعا، نذر، قربانی، امید، خوف، توکّل، رغبت، رجوع اور محبّت۔ یہ سب کے سب اعمال عبادت ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہی خالص ہونے چاہییں اور ان میں پیروی بھی صرف رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ہونی چاہیے۔ یہی توحیدِ اُلوہیّت ہے۔

توحیدِ اُلوہیّت کی شرح میں شیخ سلیمان لکھتے ہیں:۔

"توحیدِ الوہیّہ کا مطلب یہ ہے کہ عبادت اور تالّہ کی تمام اصناف اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر لی جائیں اور اس میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ محبت ہو تو صرف اللہ سے، خوف ہو تو صرف اسی سے، توکّل ہو تو صرف اسی پر، امید و بیم ہو تو صرف اسی سے۔ اس میں کسی غیر کو شریک نہ ہونے دیا جائے یعنی عبادات کی ساری قسمیں خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی، بلا شرکت غیرے صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی مختص کر لی جائیں۔ ان میں کسی کو بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ کیا جائے خواہ وہ کوئی مقرب فرشتہ ہو یا نبی مُرسل۔ رہ گئے اولیاء، صلحاء اور اہلِ قبور تو ان کا تو ذکر ہی کیا۔ یہی وہ توحید ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی مندرجہ ذیل

آیات میں کیا گیا ہے :

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ - (الفاتحہ: ۴)

"ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔"

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ - (ہود: ۱۲۳)

"تو آپ اسی کی عبادت کیجیے اور اسی پر بھروسہ کیجیے اور آپ کا رب ان باتوں سے بے خبر نہیں جو تم لوگ کر رہے ہو۔"

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ - (التوبہ: ۱۲۹)

"پھر اگر یہ روگردانی کریں تو آپ کہہ دیجیے میرا کیا نقصان ہے میرے لیے تو اللہ کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں، میں نے اسی پر بھروسہ کر لیا اور وہ بڑے بھاری عرش کا مالک ہے۔"

رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا - (مریم: ۶۵)

"وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں، سو تو اس کی عبادت کیا کر اور اس کی عبادت پر قائم رہ۔ بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفت جانتا ہے؟"

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (ہود: ۸۸)

"اسی پر میں بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔"

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ وَكَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا - (الفرقان: ۵۸)

"اور اس حیّ لایموت پر توکل رکھیے اور اس کی تسبیح و تحمید میں لگے رہیے اور وہ اپنے بندوں کے

گناہوں سے کافی خبردار ہے۔"

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ - (الحجر: ۹۹)

"اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے۔"

یہی توحید دین کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔ دین کا باطن بھی ہے اور ظاہر بھی۔ یہی تمام انبیاء کی دعوت کا نقطۂ آغاز بھی تھا اور نقطۂ انجام بھی اور یہی مطلب ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا۔ اس لیے کہ اِلٰہ اسی معبود کو کہتے ہیں جس سے محبّت بھی کی جاتے اور ڈرا بھی جاتے۔ جس کا اجلال بھی ہو اور تعظیم بھی ہو اور تمام انواعِ عبادت جس کے خاص کر لی جائیں۔ اسی توحید کے لیے تمام مخلوق کو پیدا کیا گیا۔ انبیاء بھیجے گئے، کتابیں نازل کی گئیں اور اسی توحید کی وجہ سے لوگ آپس میں بٹ گئے۔ کچھ مومن ہو گئے کچھ کافر، کچھ اہلِ جنت اور کچھ بدبخت اہلِ جہنم۔"

(تیسیر العزیز الحمید، صفحہ ۲۰)

توحیدِ عبادت (اُلوہیت) ہی وہ مسئلہ ہے جو اہلِ مکّہ اور رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے درمیان باعثِ نزاع بنا۔ اس لیے کہ اہلِ مکّہ یعنی کُفّارِ مکّہ توحیدِ رُبوبیّت کا انکار نہیں کرتے تھے۔ ان کا اصل انکار توحیدِ اُلوہیہ سے تھا اور اسی توحید پہ وہ تعجّب کرتے ہوئے یُوں کہا کرتے تھے:

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ - (ص: ۵)

"کیا اُس نے اتنے معبُودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا، واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔"

اس لیے کہ ان کا انکار اس توحید سے تھا جس کا افعالِ عبادت سے تعلق ہے وہ افعالِ عبادت میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کرنا چاہتے تھے۔ افعالِ عبادت کیا ہیں۔ دُعا، نذر و نیاز، قربانی، خوف، امید، توکّل، رغبت، انابت۔

مُشرکینِ مکّہ کا حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ دشمنی کا اصل سبب توحیدِ عبادت تھا۔ اس لیے کہ توحیدِ رُبوبیّت سے وہ لوگ انکار نہیں کرتے تھے، ان کا اصل انکار توحیدِ عبادت سے تھا۔

مُشرکینِ عرب اللہ تعالیٰ کے وجود کو مانتے تھے۔ زمین و آسمان سب کا مالک اسی کو جانتے تھے، اسی کے ہاتھ میں سب اختیار و تصرّف کا عقیدہ رکھتے تھے۔ مشکل کے وقت میں صرف اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتے تھے، اسی کو خالق و رازق سمجھتے تھے، صرف اللہ تعالیٰ کو ہی اپنا پالنہار و آقا و رب سمجھتے تھے مگر اس سب کچھ کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں مشرک قرار دیا، اور رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کے خلاف زندگی بھر جنگ جاری رکھی۔ آخر کیوں؟

بات بالکل سیدھی ہے اور وہ یہ کہ مشرکینِ عرب اللہ تعالیٰ کو خالق، مالک اور رب ماننے کے باوجود درمیانی واسطوں کے بھی قائل تھے۔ وہ لوگ ان درمیانی واسطوں کو اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ و وسیلہ سمجھتے تھے۔ ان کی رضا اور شفاعت کو اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب سمجھتے۔ چنانچہ ان درمیانی واسطوں کی رضاجوئی کے لیے ان کے نام کی قربانی، نذر و نیاز کرتے، ان سے خیر و شفاعت کی امید رکھتے اور ان کی رضا پہ مکمل بھروسہ رکھتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ لوگ دعا، نذر و نیاز، قربانی، محبت، خوف، اُمید، رغبت، انابت غرض یہ کہ وہ اعمال جو درحقیقت اعمالِ عبادت ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہونے چاہییں، ان اعمال میں وہ ان درمیانی واسطوں کو شریک کر لیا کرتے۔ چنانچہ اس شرک سے انہیں روکا گیا۔ ارشاد ہُوا:

وَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (البقرہ: ۱۶۳)	"تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے۔ اس رحمٰن اور رحیم کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے۔"
وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَإِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ إِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (المؤمنون: ۱۱۷)	"اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب بھی اس کے رب کے پاس ہے۔ ایسے کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔"
وَسْئَلْ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ أَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ	"تم سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے ان سب سے پُوچھ دیکھو کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے سوا

اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ - (الزخرف: ۴۵) — کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے تھے کہ ان کی بندگی کی جائے؟

مندرجہ بالا آیات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مشرکین کو توحید اُلوہیّت کی دعوت دی جارہی ہے۔ انہیں اس بات سے روکا جارہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو پکاریں یا کسی اور سے دُعا مانگیں اسی طرح سے انہیں غیر اللہ کی عبادت سے منع کیا جارہا ہے۔ عبادت درحقیقت اعمالِ عبادت ہی کا نام ہے۔ مطلب یہ ہُوا کہ تمام اعمالِ عبادت اور ان کی ظاہری و باطنی شکلیں (مثلاً رکوع، سجود، دُعا، طواف، قربانی، نذر و نیاز، محبّت، خوف، اُمید، انابت، خشوع و خضوع وغیرہ) سب کی سب صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہونی چاہییں اور ان میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہیے۔ اسی کا نام توحیدِ اُلوہیّت یا توحیدِ عبادت ہے۔

اب ذیل میں ہم قرآن مجید کی زبان میں مُشرکینِ عرب کا عقیدہ لکھتے ہیں کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو مالک، ساتوں آسمان و زمین کا رب، پناہ دہندہ، صاحبِ اقتدار و حاکم مانتے تھے مگر اعمالِ عبادت میں دوسروں کو شریک کرتے تھے۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ - سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ - — "ان سے کہو بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ یہ زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ہے، یہ ضرور کہیں گے اللہ کی۔ کہو پھر تم ہوش میں کیوں نہیں آتے"

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ - سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ - — "ان سے پوچھو ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ یہ ضرور کہیں گے اللہ کہو پھر تم ڈرتے کیوں نہیں؟

قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى — "ان سے کہو اگر تم جانتے ہو کہ ہر چیز پر اقتدار کس کا ہے اور کون ہے وہ جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے

تُسْحَرُوْنَ ۔ (المومنون: ۸۴-۸۹) سکتا۔ یہ ضرور کہیں گے کہ یہ بات تو اللہ ہی کے لیے ہے۔ کہو پھر کہاں سے تم کو دھوکا لگتا ہے؟"

اب بظاہر توحید کا اس قدر خالص عقیدہ رکھنے کے باوجود وہ مُشرک کیوں قرار دیئے گئے۔ اس کی وجہ قرآن مجید کے الفاظ میں انہی کی زبانی سُنیئے۔ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۔ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۔ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۔ (الزمر: ۲-۳)

"ہم نے ٹھیک طور پر اس کتاب کو آپ کی طرف نازل کیا ہے سو آپ دین کو (اعمالِ عبادت کو) اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر کے اس کی عبادت کرتے رہیے۔ یاد رکھو کہ عبادت کے سارے اعمال صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہوں۔ وہ لوگ جو خدا کے سوا اوروں کو بھی (اعمالِ عبادت) میں شریک کرتے ہیں (وہ کہتے ہیں) کہ ہم تو ان کی یہ عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں۔"

تو معلوم ہوا کہ خرابی کی جڑ یہ ہے کہ قرب کا وسیلہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے، خود اسی وسیلہ سے شفاعت طلب کرنے کے بہانے، اسی کو اعمالِ عبادت میں شریک کر لیتے ہیں اور اسے بھی معبود ٹھہرا لیتے ہیں۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ۚ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۔ (الزمر: ۴۳)

"کیا اس خدا کو چھوڑ کر ان لوگوں نے دوسروں کو شفیع بنا رکھا ہے۔ ان سے کہو کیا وہ شفاعت کریں گے خواہ ان کے اختیار میں کچھ نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں؟"

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۚ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔

"کہو شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا

(الزمر: ۴۴) وہی مالک ہے پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو"

یہی وجہ ہے کہ ان کے اللہ تعالیٰ پر ایمان کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ۔ (یوسف: ۱۰۶) "ان میں سے اکثر اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں"

مشرکین عرب، اعمالِ عبادت میں غیر اللہ کو شریک کرتے تھے مگر کہتے تھے کہ یہ شرک نہیں ہے۔ یہ شرک اس صورت میں سمجھا جاتے گا جب ہم غیر اللہ (بتوں اور درمیانی واسطوں) کو خالق، مالک اور مُدبّرِ امر خیال کریں۔ اگر ہم انہیں صرف ذریعہ اور وسیلہ سمجھیں تو یہ شرک نہیں ہو سکتا۔ مندرجہ بالا آیات میں اس بات کی پُرزور تردید کی گئی ہے اور اس کو عینِ شرک قرار دیا گیا ہے۔

باب ۳۳

حقیقتِ شرک

اشیاء اپنے اضداد کے ذریعے سے پہچانی جاتی ہیں۔ معرفتِ توحید حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں شرک کی حقیقت بھی معلوم ہو۔

شرک کی تین قسمیں

جس طرح سے توحید کی تین قسمیں ہیں اسی طرح سے شرک کی بھی تین قسمیں ہیں:

۱۔ ربوبیت میں شرک ۔ اور اس کی پھر دو قسمیں ہیں:

ا۔ شرک تعطیل

اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو معطّل ٹھہرا دینا۔ اس سے مراد بعض گمراہ فلسفیوں کے نظریات ہیں جو اس کائنات کی ابدیت کے قائل ہیں اور ان میں بعض لوگ وحدتِ وجود کی آڑ میں خالق و مخلوق اور ربّ و عبد کے درمیان کوئی فرق ہی نہیں کرتے۔

ب۔

یہ شرک کی وہ قسم ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور اس کی ربوبیت کو تو معطّل نہیں ٹھہرایا جاتا بلکہ اس کے ساتھ ایک اور خدا کا وجود مان لیا جاتا ہے۔ مثلاً نصاریٰ جو کہ تثلیث کے قائل ہیں یا مجوس جو کہ دو خداؤں کے قائل ہیں، ایک الٰہِ خیر اور ایک الٰہِ شر، اور ایسے ہی وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں میں قبروں کی پوجا کرتے ہیں یا اولیاء اللہ کی ارواح کو اللہ کی ربوبیت کے ساتھ شامل کر دیتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ بزرگوں کی روحیں ان کی حاجات کو پورا کرتی ہیں۔

۲۔ توحیدِ اسماء وصفات میں شرک:۔

اس کی پھر دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم یہ ہے کہ خالق کو مخلوق کے ساتھ تشبیہ دی جائے اور اللہ تعالیٰ کی اسماء وصفات کی کسی طرح سے تاویل کی جائے مثلاً یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا دیکھنا میرے دیکھنے کی طرح ہے یا اس کا عرش پر براجمان ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ میں تخت پر بیٹھتا ہوں۔

اس کی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کو جھوٹے خداؤں پہ منطبق کیا جائے جیسا کہ مشرکینِ مکہ کیا کرتے تھے۔ وہ لات وعزیٰ کو الٰہ عزیز قرار دیا کرتے تھے۔

۳۔ توحیدِ اُلوہیت یا توحیدِ عبادت میں شرک:

یہ شرکِ اکبر ہے اور اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ ان افعال میں جو کہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی مخصوص ہونے چاہییں غیر اللہ کو شریک کیا جائے خواہ اس غیر اللہ کو خدا نہ مانا جائے۔ اس کی دو قسمیں ہیں:۔

ایک قسم یہ ہے کہ جس طرح سے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی جاتی ہے ویسے ہی کسی نبی یا ولی یا غیر اللہ سے دُعا مانگی جائے یا ایسے ہی دوسرے اعمال مثلاً شفاعت، محبت، خوف و رجاء میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرایا جائے۔ دوسری قسم جسے شرکِ اصغر کہا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ عبادت تو اللہ تعالیٰ ہی کی کی جائے لیکن اس میں اخلاص نہ ہو، بلکہ ریاکاری ہو یا تصنع ہو یا طلبِ جاہ ومال کا بہانہ بنائے یا غیر اللہ کی قسم کھائی جائے۔

شرک کی تین اور قسمیں

امام محمدؒ نے شرک کی تین مزید قسمیں قرار دی ہیں۔ شرکِ اکبر، شرکِ اصغر اور شرکِ خفی۔

شرکِ اکبر پہ دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ مَنْ

يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۔ (النساء : ۱۱۶)

"بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ اُن کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دینگے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے وہ بڑی دُور کی گمراہی میں جا پڑا"

وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۔ (المائدۃ : ۷۲)

"حالانکہ مسیح نے کہا تھا" اے بنی اسرائیل اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔"

شرک اکبر کی چار قسمیں ہیں:

پہلی قسم شرک الدعوۃ ہے یعنی جس طرح سے اللہ سے دعا مانگتے ہیں اسی طرح سے غیروں سے بھی حاجات طلب کی جائیں۔ اور شرک دعوۃ پہ دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ۔ (عنکبوت : ۶۵)

"جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں، پھر جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو یکایک یہ شرک کرنے لگتے ہیں۔

دوسری قسم شرک النیۃ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ارادہ، قصد اور نیت جو کہ اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہونی چاہیے اس میں کسی غیر کو شریک ٹھہرالیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا

وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ - (ہود : ۱۵ - ۱۶)-

"جو لوگ بس اسی دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے (وہاں معلوم ہو جائے گا کہ) جو کچھ انہوں نے دنیا میں بنایا وہ سب ملیامیٹ ہو گیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے۔"

تیسری قسم شرکِ اطاعت :

یعنی اطاعت میں جو صرف اللہ تعالیٰ کا ہی حق ہے دوسروں کو شریک کیا جائے۔ اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے :

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ - (التوبہ : ۳۱)

"انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"

اور اس کی واضح تفسیر یہ ہے کہ علماء اور اولیاء اللہ کی اس طرح اطاعت کی جائے کہ انہی کو مطاعِ حقیقی کا فی الواقع درجہ دے دیا جائے۔

حدیث شریف میں ہے کہ عدیؓ بن حاتم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا کہ یارسول اللہ ہم لوگ اپنے احبار اور رہبان کو رب تو نہیں ٹھہرایا کرتے تھے۔ اور نہ ان کی عبادت کیا کرتے تھے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ عبادت سے مراد یہ ہے کہ معصیت میں بھی تم لوگ ان کی اطاعت کیا کرتے تھے اور جسے وہ جائز ٹھہراتے اسے تم جائز تسلیم کرتے اور جسے وہ حرام کہتے تم آنکھ بند کیے اس کو حرام مان لیتے۔

چوتھی قسم شرکِ محبت ہے یعنی محبت میں جو کہ دراصل اللہ تعالیٰ کا ہی حق ہے غیر کو شریک کیا جائے

اور اس پہ دلیل یہ ارشادِ ربانی ہے :

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۔ (البقرہ: ۱۶۵)

"لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں اور اس طرح سے کہ وہ ان سے یوں محبت کرتے ہیں جس طرح سے اللہ کے ساتھ محبت کی جانی چاہیے۔"

نوعِ ثانی

شرکِ اصغر: اور اس سے مراد ریا ہے کہ دوسروں کو دکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ اس پہ دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے :

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۔ (الکہف : ۱۱۰)

"جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک اعمال کرے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائے۔"

نوعِ ثالث

شرکِ خفی: اور اس پہ دلیل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے :

اَلشِّرْكُ فِيْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَخْفٰى مِنْ دَبِيْبِ النَّمْلَةِ السَّوْدَآءِ عَلٰى صَفَاةِ السَّوْدَآءِ فِيْ ظُلْمَةِ اللَّيْلِ ۔

"اس اُمت میں شرک اس بات سے بھی زیادہ پوشیدہ صورت میں آتا ہے جس طرح سے کہ اندھیری رات میں سیاہ چٹان پہ سیاہ چیونٹی کے چلنے کی رفتار ہو۔"

اس شرک کا کفارہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی اپنے اس قول سے ارشاد فرمایا ہے :

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُبِكَ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ شَيْئًا وَّاَنَا اَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُكَ مِنَ الذَّنْبِ

الَّذِی لَا اَعْلَمُ۔

"اے اللہ میں تیری پناہ میں آتا ہوں اس بات سے کہ تیرے ساتھ کسی کو بھی شریک ٹھہراؤں اور مجھے پتہ بھی نہ ہو کہ میں شریک ٹھہرا رہا ہوں۔ میں اے اللہ اس گناہ سے تیری بخشش چاہتا ہوں جس کو بے جانے کیا اور مجھے پتہ بھی نہیں تھا کہ یہ گناہ ہے"

عبادۃ الطاغوت

شرک کی حقیقت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مشرک کسی نہ کسی شکل میں طاغوت کی عبادت کرتا ہے۔ خواہ وہ ایمان کا دعویدار کیوں نہ ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع و محبت کا دم کیوں نہ بھرتا ہو۔ ہوتا یوں ہے کہ اس کا دعویٰ ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کا ہوتا ہے لیکن فی الواقع عملی زندگی میں اس کا رُخ طاغوت کی طرف ہوتا ہے اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں وہ طاغوت کا مطیع و فرمانبردار ہوتا ہے۔ اس کی محبت اور اس کی ساری امیدیں طاغوت کی طرف مرتکز ہوتی ہیں۔ وہ طاغوت سے ہی خیر کا امیدوار ہوتا ہے اور اسی لیے اس کا بے حد و حساب اکرام کرتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شرک کی ایک گھناؤنی شکل ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاكَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّكْفُرُوْا بِهٖ وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِیْدًا۔ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا۔

(النساء : ۶۰ - ۶۱)

"اے نبی، تم نے دیکھا نہیں ان کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں اُس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات میں فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں

طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دُور لے جانا چاہتا ہے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تم ان منافقوں کو دیکھتے ہو کہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں۔"

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۔

(النحل : ۳۶)

"ہم نے ہر امّت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔"

طاغوت کے معنی :۔

طاغوت طغیان سے مشتق ہے، اس کے معنی حد سے گزر جانے کے ہیں۔ حضرت عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں: "الطاغوت الشیطان" (ابن کثیر)

"طاغوت شیطان ہی ہوتا ہے۔"

امام مالکؒ فرماتے ہیں "طاغوت ہر اُس شے کا نام ہے جس کی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی جاتی ہو۔" (فتح المجید، صفحہ ۱۶)

علامہ ابنِ قیّم فرماتے ہیں :

"طاغوت ہر وہ چیز ہے جس کی وجہ سے انسان حد سے تجاوز کر جائے۔ خواہ وہ عبادت میں ہو یا تابعداری میں یا اطاعت میں۔ ہر قوم کا طاغوت وہی ہے جس کی طرف وہ اللہ تعالیٰ اور رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بجائے فیصلے کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ یا اللہ کے سوا اس کی پرستش کرتے ہیں یا بلا دلیل اس کی اتباع کرتے ہیں، یا اس کی اطاعت بغیر اس علم کے کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔" (۱۶ - ص ۱۳۲)

فی الحقیقت طاغوت کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن اصل طاغوت پانچ طرح کے ہیں :

۱۔ شیطان جو غیر اللہ کی عبادت پہ اُکساتا ہے۔

۲۔ ظالم حاکم جو اللہ کے احکام کو بدل دے۔

۳۔ ہر وہ قوت جو اللہ کے حکم کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے حکم کے مطابق فیصلے کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (المائدہ: ۴۴)

"جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی لوگ کافر ہیں"

۴۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی ہستی جو اپنے اندر علم غیب رکھنے کا دعویٰ رکھے، طاغوت ہے۔ اور اس پہ دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ" (الانعام: ۵۹)

"اور اللہ کے پاس ہی غیب کی چابیاں ہیں اور سوائے اس کے اور کوئی بھی غیب کو نہیں جانتا"

۵۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی ہستی جس کی عبادت کی جارہی ہو اور وہ اس پر راضی ہو وہ بھی طاغوت ہے۔ اور اس پہ دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشادِ گرامی ہے:

وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ۔ (الانبیاء: ۲۹)

"اور ان میں سے جو بھی کہے کہ میں بھی اللہ کے سوا ایک خدا ہوں تو ہم اسے جہنم کی سزا دیں گے اور ظالموں کو ہم یہ سزا دیا کرتے ہیں"

باب ۳۴

شرک کے اسباب

شرک کے عام طور پر مندرجہ ذیل چھ اسباب ہُوا کرتے ہیں :

پہلا سبب : بزرگوں کی تعظیم میں غلوّ

تاریخِ انسانی بتلاتی ہے کہ جادۂ توحید سے ہٹنے اور شرک میں گرفتار ہونے کا سب سے بڑا سبب انبیاء، اولیاء اور صالحین کی تعظیم میں انتہا پسندی ہے۔ بزرگوں سے اس قدر محبت کہ وہ دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتے شرک کا سب سے بڑا سبب ہے۔ یہی محبت شخصیت پرستی اور یادگار پرستی کی طرف لے جاتی ہے۔ اسی محبت نے حضرت عیسٰی علیہ السّلام، رام چندر اور کرشن کو بندے سے خدا کا رتبہ دے دیا۔

شرک میں سب سے زیادہ وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں جو انبیاء اور صلحاء کی اندھی محبت میں گرفتار تو ہوتے ہیں لیکن آدابِ محبّت سے واقف نہیں ہوتے۔ دشریعت آدابِ محبت کا ہی دوسرا نام ہے) اسی اندھی محبت کو قرآنِ مجید میں "غلوّ فی الدّین" کا لقب دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :۔

يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ - (النساء : ۱۷۱)

"اے اہلِ کتاب اپنے دین میں غلوّ (انتہا پسندی) سے کام نہ لو"

چنانچہ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بھی فرمایا :

"لَا تُطْرُوْنِيْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰى ابْنَ مَرْيَمَ (بخاری ۔ الانبیاء ۔ باب : ۴۸)

"میری مدح میں اس طرح سے مبالغہ نہ کرو جس طرح عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریم کے بارے میں مبالغہ سے کام لیا۔"

دیکھیے کہ یہ اندھی محبت کیا کیا کرشمے دکھلاتی ہے اور کس طرح سے شرک کی طرف لے جاتی ہے صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا، قَالَ هٰذِهٖ اَسْمَاءُ رِجَالٍ صَالِحِيْنَ مِنْ قَوْمِ نُوْحٍ فَلَمَّا هَلَكُوْا اَوْحَى الشَّيْطٰنُ اِلٰى قَوْمِهِمْ اَنِ انْصِبُوْا اِلٰى مَجَالِسِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا يَجْلِسُوْنَ فِيْهَا اَنْصَابًا وَّسَمُّوْا بِاَسْمَائِهَا حَتّٰى اِذَا هَلَكَ اُولٰئِكَ وَنَسَخَ الْعِلْمُ عُبِدَتْ (تفسیر ابن کثیر۔ سورۃ النور)

"حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ قرآن مجید کی یہ آیت ہے "انہوں نے کہا ہرگز مت چھوڑو اپنے معبودوں کو اور نہ چھوڑو "ودّ" اور "سُواع" کو اور نہ "یغوث" اور نہ "یعوق" اور "نسر" کو۔ اس آیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ سب قومِ نوحؑ کے نیک لوگ تھے۔ جب وہ وفات پا گئے تو شیطان نے ان کی قوم کو یہ بات سجھائی کہ یہ صالح لوگ جس جگہ بیٹھتے تھے وہاں بطور یادگار پتھر نصب کر دو اور اس پتھر کو ان کے نام سے پکارو۔ تو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب یہ لوگ بھی مر گئے اور ان سے علم اُٹھ گیا تو ان کی اولاد نے ان پتھروں اور یادگاروں کی پرستش شروع کر دی۔"

ایسے ہی روایت ابن جریر محمد بن قیس سے بھی ہے۔

"بہت سے لوگ ان صالحین (ود، سُواع، یغوث، یعوق، نسر) کے متبعین تھے اور ان کی پیروی کیا کرتے تھے۔ جب یہ صالحین وفات پا گئے تو ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اگر ہم ان کی تصویریں بنا کر رکھ لیں تو ان کی تصویروں کی وجہ سے ہمارے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا ولولہ اور شوق پیدا ہو گا چنانچہ ان لوگوں نے ان صالحین کی تصاویر بنا کر رکھ لیں۔ جب یہ لوگ بھی مر گئے اور ان کے بعد کی نسل آئی تو شیطان نے انہیں یہ سمجھایا کہ تمہارے

آباؤ اجداد ان کی عبادت کیا کرتے تھے اور ان ہی کے وسیلے سے بارش ہوا کرتی تھی، چنانچہ وہ ان کی عبادت میں لگ گئے۔" (فتح المجید، ص ۲۲۲)

علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں:

"پہلے پہل جن لوگوں نے ان کی تصاویر بنائیں، وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ان تصاویر سے ان کی یاد آتی رہے گی اور ان کے اعمالِ صالحہ یاد آئیں گے۔ یہ تصاویر اُن جیسے اعمالِ صالحہ اور امورِ خیر پر اُکسائیں گی اور زیادہ سے زیادہ نیکی کا سبب بنیں گی، ان کی قبروں کے پاس جا کر اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کیا کریں گے۔ پھر ہوا یوں کہ جب اگلی نسل آئی تو وہ اصل بات بھول گئی اور ان تصاویر کا اصل مقصد ان کے ذہنوں سے فراموش ہو گیا۔ پھر شیطان نے ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالا کہ تمہارے آباؤ اجداد ان تصاویر کی تعظیم و عبادت کیا کرتے تھے۔ (چنانچہ وہ بھی کرنے لگے)۔ (فتح المجید، ص ۲۲۳)

امام ابنِ قیمؒ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"شیطان قبر کے پجاریوں کے دل میں ہمیشہ یہی بات القاء کرتا رہا کہ قبروں پر عمارت اور قبّے بنانا اور وہاں پر زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا (اعتکاف) انبیاء اور صالحین کی محبت کا مظہر ہے۔ ان کے ہاں جا کر اگر دعا مانگی جاتے تو وہ قبول و مستجاب ہوتی ہے۔

جب وہ یہاں تک آ گئے تو اب یہ بات ان کے دل میں ڈالی کہ اگر ان کو وسیلہ ٹھہرا کر دعا کرو گے اور ان کے نام کی قسم دے کر اللہ تعالیٰ سے مانگو گے تو دعا ضرور قبول ہو گی۔

جب یہ بات ان کے ذہن نشین ہو گئی تو شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا کہ اب تم براہِ راست اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر انہی سے دعا مانگو اور ان کو اپنا شفاعت کنندہ سمجھو۔ ان کی قبروں پر چادریں چڑھاؤ، چراغاں کرو، ان کا طواف کرو اور ان کو بوسے دو اور دُور دُور سے ان کی زیارت کو آؤ جیسا کہ حج کو سفر کیا جاتا ہے اور یہیں پہ آگے جانور بھی ذبح کرو۔

جب یہ بات طے ہو گئی تو شیطان نے ان کو گمراہی کے اس درجے سے دوسرے درجے پر

منتقل کر دیا اور وہ یہ کہ وہ لوگوں کو بھی ان کی عبادت کی طرف بلائیں اور ان قبروں پہ آکے عبادت کے اعمال بجا لائیں (تہوار اور عرس منائیں) چنانچہ انہوں نے دیکھا کہ یہ اعمال ان کی دنیا کے لیے بھی بہت مفید ہیں (مالا مال ہو گئے) اور آخرت میں بھی۔

جب بات یہاں تک پہنچ گئے تو شیطان انہیں یہاں تک لے آیا کہ وہ کہنے لگے کہ جو شخص ان اعمال سے روکے وہ بزرگوں کے مراتبِ عالیہ کا منکر ہے، گستاخ ہے، ان کی شان میں کمی کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ انبیاء اور اولیاء کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے چنانچہ وہ اہلِ توحید پر غضبناک ہو جاتے ہیں اور ان کے خلاف ان کے دل کڑھنے لگتے ہیں"

۲۔ شرک کا دوسرا سبب: تجسیم صفاتِ الٰہیہ

جیسا کہ گزر چکا کہ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کی تجسیم کی اور ان کو مستقل وجود میں ڈھال دیا اور ان کے لیے مجسمے تراش لیے۔ یہ بُت پرستی کا اصل سبب ہے۔

۳۔ تیسرا سبب: درمیانی واسطے

شرک کا بہت بڑا سبب مُشرکین کی یہ ذہنی افتاد ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تک براہِ راست پہنچنا تو ممکن نہیں ہے۔ اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے بہت سے وسیلے اور واسطے اختیار کرنے پڑیں گے۔ چنانچہ وہ انبیاء، صلحاء اور اہلِ قبور کو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا واسطہ یا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ بالکل یہی حال مشرکین مکّہ کا تھا۔ قرآن مجید میں ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔ (زمر: ۳)

"اور جن لوگوں نے اس کے سوا اور کارساز بناتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ان کو اس لیے پُوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کا مُقرّب بنا دیں"

پھر بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچتی ہے کہ یہ درمیانی واسطے بذاتِ خود خدا بن جاتے ہیں۔ پاک و ہند کے مُشرکین کی ذہانت درج ذیل کے شعر سے ملاحظہ فرمائیے:

؎ اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لیں گے محمّد سے

اس سلسلے میں ایک اور گمراہی یہ ہے کہ درمیانی واسطوں کو شفاعت و مغفرت کا یقینی سبب سمجھا جاتا ہے۔ ذہنیت ملاحظہ ہو، کہتے ہیں:

؎ پکڑے خدا اور چھڑائے محمّد جو پکڑے محمّد چھڑا کوئی نہیں سکتا

یعنی سب کچھ اختیارات اب محمد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ہاتھ میں آ گئے۔ اللہ تعالیٰ چاہے یا نہ چاہے جب محمد رسُول اللہ چاہیں گے تو بخشوا لیں گے اور اگر محمد رسُول اللہ کسی کو پکڑنا چاہیں تو اسے کوئی بھی نہیں چھڑا سکتا۔ اللہ تعالیٰ بھی وہاں پہ بے بس ہو گئے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

اب آئیے درج ذیل آیت پہ کچھ غور کر لیجیے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (البقرہ: ۲۵۵)

"کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کر سکے۔"

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ وَیَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ۔ (یُونُس: ۱۸)

"اور اللہ کو چھوڑ کے اور اللہ کے سوا یہ ان ہستیوں کی عبادت کرتے ہیں جو انہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ان کے شفاعت کنندہ ہیں"

اللہ تعالیٰ کے حضور شفاعت سے انکار نہیں ہے۔ لیکن ذرا یہ بھی دیکھ لیجیے کہ اس کے ہاں کوئی شفاعت بھی اس کی اجازت کے بغیر بار نہیں پاتی۔ دیکھیے جب جلیل القدر نبی ابراہیم خلیل اللہ اپنے باپ سے گفتگو کرتے ہیں تو یُوں کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:۔

لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ (ممتحنہ: ۴)

"(اے ابا)، میں ضرور بالضرور آپ کے لیے مغفرت طلب کروں گا لیکن اللہ کے حضور (میں آپ کے بارے میں کچھ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا) میرے بس میں کچھ بھی نہیں۔"

خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے جب منافقوں کے لیے مغفرت کی دُعا فرمائی تو یوں وحی نازل ہوئی:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔ (توبہ: ۸۰)

"تم ان کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو، اگر تم اُن کے لیے ستر دفعہ بھی مغفرت مانگو تو خدا ان کی مغفرت نہ کرے گا۔"

ادھر دیکھیے جلیل القدر نبی حضرت نوح علیہ السّلام کا بیٹا ان کی آنکھوں کے سامنے ڈوب رہا ہے اور وہ غم سے بیتاب ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں تو ان پر یوں عتاب ہوتا ہے کہ وہ بیٹے کو بھول جاتے ہیں اور اپنی فکر پڑ جاتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ۔ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔ قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْئَلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ۔

(ہود: ۴۵-۴۷)

"اور نوحؑ نے اپنے پروردگار کو پکارا اور کہا کہ پروردگار، میرا بیٹا بھی میرے گھر والوں میں ہے تو اس کو بھی نجات دے، تیرا وعدہ سچا ہے اور تو ہی سب سے بہتر حاکم ہے۔ خدا نے فرمایا کہ اے نوحؑ وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں وہ تو ناشائستہ افعال ہے تو جس چیز کی تم کو حقیقت معلوم نہیں اس کے بارے میں مجھ سے سوال ہی نہ کرو اور میں تم کو نصیحت

کرتا ہوں کہ نادان نہ بنو۔ نوحؑ نے کہا پروردگار، میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ ایسی چیز کا تجھ سے سوال کروں جس کی مجھے حقیقت معلوم نہیں اور اگر تو مجھے نہیں بخشے گا اور مجھ پر رحم نہیں کرے گا تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔"

مندرجہ ذیل آیات اس مسئلہ میں حجت قاطعہ ہیں:

وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ (آل عمران : ۱۳۵)

"اور خدا کے سوا کون گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔"

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۔ (مریم : ۸۷)

"یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جس نے رحم والے خدا سے اقرار لے لیا ہو۔"

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَاءَ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۔ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔ (زمر: ۴۳-۴۴)

"کیا انہوں نے خدا کے سوا اوروں کو شفیع بنا رکھا ہے۔ کہہ دے کہ اگرچہ ان کو کسی چیز کا اختیار نہ ہو اور نہ ان کو سمجھ ہو تو بھی؟ کہہ دے کہ شفاعت کا کل اختیار خدا ہی کو ہے۔ اسی کا راج آسمان اور زمین میں ہے اور اُسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔"

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۔ (الزخرف :۸۶)

"اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جنہوں نے حق کی گواہی دی اور وہ دانش رکھتے ہیں۔"

مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ ۔ (یونس :۳)

"خدا کی بارگاہ میں کوئی شفیع نہیں، ہاں مگر اس کی اجازت کے بعد۔"

غور سے دیکھیے کہ ایک نبی بھی اللہ کے حضور اپنی امت کی مغفرت طلب کرتا ہے تو کس انداز کے ساتھ۔ قرآن مجید میں ہے:

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔

(المائدہ: ۱۱۸)

"اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے ہی بندے تو ہیں اور اگر تو بخش دے تو تو سب کچھ کر سکتا ہے کہ تو غالب اور حکمت والا ہے"۔

شفاعت سے انکار نہیں ہے اور ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب فرمائے، لیکن ذرا آنکھیں کھول کے قرآن مجید کی آیات کو بھی پڑھ لینا چاہیے اور شفاعت کے بارے میں اپنے عقیدے کو درست رکھنا چاہیے۔

شفاعت اپنوں کی ہوا کرتی ہے دشمنوں کی نہیں۔ مخلصین کی ہوا کرتی ہے، کج رو، بد باطن اور چشم اَحول سے دیکھنے والے منافق کی شفاعت کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جیسا کہ حملہ آور دشمن کی فوج کے کچھ لوگ گرفتار ہوں اور بادشاہ کے سامنے ان کی سفارش کی جاتے کہ "جناب ان کو چھوڑ بھی دیجیے اور ان کو انعام و اکرام سے بھی نوازیے"۔

اس شفاعت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شفاعت کرنے والا خود بھی غدّاروں کی فہرست میں لکھ لیا جائیگا کہ اس کا بھی مخالف کیمپ سے تعلق ہے۔ شفاعت کا فطری اسلوب یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہی مخلص آدمیوں کے لیے کی جاتی ہے اگرچہ وہ خطا کے مرتکب ہوں۔ یعنی یُوں کہا جاتا ہے کہ "یہ شخص آپ کا مخلص اور وفادار ہے، اس کی کچھ خدمات بھی ہیں، ہاں بتقاضائے بشریت اس سے کچھ غلطیاں صادر ہو گئی ہیں، آپ کی بخشش کا مستحق ہے اسے معاف کر دیجیے"۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے مخلص نہیں ہیں اور اللہ کی بادشاہت میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں ان کی شفاعت کی کسی طور پر بھی اجازت نہیں دی جائے گی۔ سیّدنا ابراہیمؑ کو اس بات سے روک دیا گیا کہ وہ اپنے باپ کے لیے مغفرت طلب کریں۔

۴۔ شرک کا چوتھا سبب کشف و کرامات

شرک کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ بعض لوگوں

سے کشف و کرامات صادر ہوتی ہیں ان کی نسبت لوگوں کو یہ خیال آتا ہے کہ یہ خود خدا تو نہیں ہیں لیکن ان میں کچھ نہ کچھ خدائی کا شائبہ ضرور ہے اور ادھر یہ طاغوتوں کا ٹولہ ہے جو جوگیوں کی سی ریاضتیں کرتے ہیں۔ قوتِ ارادی سے متعلق خاص ریاضتوں، منتر، ٹوٹکے اور اعمالِ سحر سے اپنے آپ کو فوق البشر ثابت کرتے ہیں اور کسی نہ کسی طریقے سے ضعیف الاعتقاد لوگوں کی گردنیں اپنے سامنے جھکا لیتے ہیں۔

اگر کشف ہی بزرگی کا معیار ہوتا تو جنگِ بدر میں صحابہ کرام کو فرشتے اترتے ہوئے نظر نہیں آتے لیکن شیطان کو نظر آ رہے تھے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَاءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ (انفال: ۴۸)

"ذرا خیال کرو اُس وقت کا جب کہ شیطان نے ان لوگوں کے کرتوت ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا کر دکھائے تھے اور ان سے کہا تھا کہ آج کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور یہ کہ میں تمہارے ساتھ ہوں مگر جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو وہ اُلٹے پاؤں پھر گیا اور کہنے لگا کہ میرا تمہارا ساتھ نہیں ہے، میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم لوگ نہیں دیکھتے، مجھے خدا سے ڈر لگتا ہے اور خدا بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔"

اب کوئی مائی کا لال یہ کہہ سکتا ہے کہ شیطان جسے وہ کچھ نظر آیا جو صحابہ کرام کو نظر نہ آسکا، کیا صحابہ کرام کے مقابلے میں زیادہ بزرگی رکھتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صیاد نامی ایک کاہن تھا اور حضور اکرمؐ کے سامنے بھی اس نے فن کا مظاہرہ کیا۔ لیکن وہ اسلام نہیں لایا۔ وہ دوسروں کو ان کے دل کی باتیں بتا دیا کرتا تھا، کیا اُسے بھی اولیاء اللہ کی صف میں شمار کرو گے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ابن صیاد کاہن نے یہ کہا کہ آپ اپنے جی میں کوئی بات چھپائیں، میں بوجھوں گا۔ آپؐ نے اپنے جی میں سورۃ الدخان کا خیال فرمایا اور ابنِ صیاد سے فرمایا کہ میں نے ایک بات

اپنے دل میں چھپائی ہے تم بوجھو کیا ہے؟

ابن صیاد نے کہا: "الدخ الدخ" حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"اخساء فلن تعد وقدرك" (تو رُسوا ہو، اپنی حد سے آگے نہ بڑھ سکے گا)۔

(صحیح مسلم، جلد ثانی، ص ۳۹۷)

اس طرح سُورۃ کہف میں خضر و موسیٰ علیہما السّلام کے مذکورہ قصد سے صاف پتہ چلتا ہے کہ خضر علیہ السّلام کو موسیٰ علیہ السّلام کے مقابلے میں کہیں زیادہ کشف ہوتا تھا لیکن تمام اہلِ علم جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام بحیثیت نبی ان سے بلند تر درجہ پر سرفراز تھے۔ پس معلوم ہُوا کشف و کرامات بزرگی و ولایت کا معیار نہیں ہیں۔

اسی طرح کسی شخص کی دعاؤں کا کثرت سے قبول ہونا بھی ولایت کی دلیل نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ مظلوم کی دعا قبول فرماتا ہے (خواہ وہ کافر و فاسق ہی کیوں نہ ہو)۔

حقیقت یہ ہے کہ ولایت و بزرگی کا معیار اللہ تعالیٰ کی خالص محبّت اور محمد عربی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نقشِ قدم پر مر مٹنا ہے۔ ان کا اتباع ہی اصل دین ہے۔ اس سے انحراف ہی شرک کا سب سے بڑا سبب ہے۔

۵۔ شرک کا پانچواں سبب۔ صفاتِ الٰہیہ میں شرک

گزر چکا کہ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کی ان صفات میں جن میں اس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا ہے، انسانوں کو شریک کر دیتے ہیں۔ مثلاً کائنات کے اُمور میں تصرّف اور علمِ غیب صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفات ہیں لیکن پاک و ہند میں بہت سے لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انبیاء اور اولیاء اللہ کو علمِ غیب حاصل ہے اور ان کو اللہ کی طرف سے اتنی قوتیں اور اختیارات دیتے گئے ہیں کہ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔

اب قرآنِ مجید کی اس آیت کی تلاوت کیجیے:۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ - (اعراف : ۱۸۸)

"اے محمد ان سے کہو کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لیے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔"

ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم تشریف فرما تھے۔ انصار کی چند لڑکیاں گا رہی تھیں۔ گاتے گاتے انہوں نے یہ مصرعہ پڑھا :

"وَفِيْنَا رَسُوْلٌ يَعْلَمُ مَا فِيْ غَدٍ"

"ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔"

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فوراً منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ "یہ نہ کہو بلکہ وہی کہو جو پہلے گا رہی تھیں۔" (صحیح بخاری : کتاب النکاح)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک صفت جس میں کوئی شریک نہیں ہے وہ یہ کہ وہ شارعِ مطلق ہے۔ وہی کسی چیز کو حلال و حرام ٹھہرا سکتا ہے۔ جو لوگ یہ حق یا صفت دوسروں کے لیے بھی روا رکھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، اور وہ لوگ جو حلال کو حرام ٹھہرائیں اور حرام کو حلال ٹھہرائیں وہ تو طاغوت ہیں اور وہ لوگ جو ان طاغوتوں کی بات مان لیں وہ ان طاغوتوں کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ٹھہرا رہے ہیں۔

حدیث شریف میں ہے :

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ عَلٰى عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ الطَّائِيِّ فَقَالَ، يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَسْنَا نَعْبُدُهُمْ، قَالَ اَلَيْسَ يُحِلُّوْنَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْنَهٗ، وَيُحَرِّمُوْنَ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ فَتُحَرِّمُوْنَهٗ؟ قَالَ بَلٰى، قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتِلْكَ عِبَادَتُهُمْ - (رواہ الامام احمد والترمذی وحسّنہ

(ابن جریر مطولاً)

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی بن حاتم طائی کے سامنے یہ آیت پڑھی" اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (کہ ان لوگوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے سوا اپنے رب بنا لیا) تو عدی بن حاتم طائی نے کہا کہ یا رسول اللہ ہم لوگ ان کی عبادت تو نہیں کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا، کیا وہ تمہارے لیے اس چیز کو حلال قرار نہیں دیا کرتے تھے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دے دیا۔ اور تم بھی ان کی تقلید میں ان کی پیروی میں حلال ہی قرار دے دیتے تھے۔ اور ایسا نہیں ہے کہ وہ ان امور کو جنہیں اللہ نے حلال ٹھیرایا، حرام ٹھیرا دیتے تھے اور تم بھی ان کے ساتھ میں انہی چیزوں کو حرام سمجھ لیتے تھے۔ عدی بن حاتم نے جواب دیا جی ہاں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو عبادت ہے اور یہی ان کو رب ٹھہرانا ہے۔"

۶۔ شرک کا چھٹا سبب: اسبابِ دُنیا پر بھروسہ

دُنیا کی چیزوں اور اسباب میں مستقل تاثیر کا عقیدہ رکھنا شرک ہے۔ لوگ مال اسباب پر اس قدر بھروسہ کرتے ہیں کہ نتیجۃً وہ یوں سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان کے مال و دولت اور ان کے اسباب کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ اسباب میں مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ مَیں نے فلاں دوائی کھائی اور فلاں دوائی نے مجھے شفا دے دی یا فلاں دوائی کی تاثیر ایک مستقل چیز ہے اور شفا کا باعث ہے۔ یہ بات خالصتہً شرک ہے، اس لیے کہ کسی چیز کی کوئی صفت اپنی جگہ پر مستقل نہیں ہے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جب چاہیں وہ صفت یا وہ خاصیت اس میں سے نکال دیں۔ اصل سبب تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی نہ کہ وہ چیز۔ شرک کے اسی سبب کا نتیجہ لوگوں کے اندر اسبابِ مال وجاہ کی بے حد و حساب محبت ہے اور بات یہاں تک پہنچتی ہے کہ لوگ انہی اسباب کو ہی خدا مان لیتے ہیں۔ حق کو چھوڑ کر اہلِ اقتدار کی پوجا کرتے ہیں دولت

کی محبت میں اس قدر گرفتار ہو جاتے ہیں کہ اللہ کو چھوڑ کے دولت کو ہی اپنا خدا بنا لیتے ہیں
حدیث شریف میں ہے :

"تَعِسَ عَبْدُ الدِّینَارِ وَالدِّرْھَمِ ..." (بخاری، الجہاد، باب : ۷۰)
"ہلاک ہو دینار و درہم کا بندہ "

باب ۳۵

مُشرکینِ مکہ اور موجودہ دور کے مُشرکین کا تقابُل:

مُشرکینِ عرب جن کے ساتھ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جنگ کی اُن کے عقائد پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ توحیدِ ربُوبیت کے قائل تھے وہ اللہ تعالیٰ کو ہی پُوری کائنات کا خالق و مالک جانتے تھے۔ مشرکینِ عرب کا اس بات پہ ایمان تھا کہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ کا ہی ہے اور اللہ ہی ساتوں آسمانوں کا اور عرشِ عظیم کا رب ہے۔ ہر چیز کی بادشاہت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ایمان رکھتے تھے کہ اللہ ہی ہر ایک کو پناہ دے سکتا ہے، اور کوئی اس کے مقابل پناہ نہیں دے سکتا۔ قرآن مجید میں ان کے عقائد بیان کیے گئے ہیں۔ ارشادِ گرامی ہے:

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ، قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ. قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ. قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ. قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ۔ (المؤمنون: ۸۴-۸۹)

"اے نبی ان سے کہو کہ جو کچھ زمین میں ہے سب کس کا مال ہے، جھٹ بول اٹھیں گے کہ خدا کا۔ کہو پھر تم سوچتے کیوں نہیں ہو؟ ان سے پُوچھو کہ ساتوں آسمانوں کا مالک کون ہے اور عرشِ عظیم کا کون مالک ہے، بے ساختہ کہہ دیں گے کہ یہ چیزیں خدا کی ہیں، کہو کہ پھر تم ڈرتے کیوں نہیں ہو۔ ان سے کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابل کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ فوراً کہہ دیں گے کہ ایسی بادشاہی تو خدا ہی کی ہے تو کہو کہ پھر تم پر جادو کہاں سے

پڑ جاتا ہے۔"

تو معلوم ہوا کہ مشرکینِ عرب اللہ تعالیٰ کو ہی ہر چیز کا خالق، مالک اور رب مانتے تھے۔ صرف اسی کو ہی ہر ایک کا پناہ دہندہ اور دستگیر مانتے تھے۔ مگر اس سب کچھ کے بعد بھی انہیں مشرک قرار دے دیا گیا آخر کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہ اللہ اور بندے کے درمیان وسیلے اور واسطے تلاش کیا کرتے تھے۔ کہیں لات، کہیں عزّیٰ، کہیں ہُبل اور انہی کے نام نذرونیاز اور نذرانے چڑھایا کرتے تھے اور انہی کے ہاں جا کے وہ مرادیں مانگا کرتے تھے۔

لیکن اس معاملے میں بھی مشرکینِ عرب کا حال بہت عجیب تھا۔ عام حالات میں وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے اور انہیں پکارتے تھے اور ان سے مرادیں مانگتے تھے لیکن جب ان پر بپتا آن پڑتی اور تکلیف کی گھڑی آجاتی تو وہ تمام جھوٹے خداؤں کو بھول کے صرف ایک اللہ کے ہو رہتے۔ قرآن مجید اس بات کی گواہی دیتا ہے:

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ (عنکبوت: ۶۵)

"پھر جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا کو پکارتے اور خالص اسی کی عبادت کرتے ہیں لیکن جب وہ ان کو نجات دے کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو پھر سے شرک کرنے لگ جاتے ہیں۔"

وَإِذَا غَشِيَهُمْ مَوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ۔ (لقمان: ۳۲)

"اور جب ان پر دریا کی لہریں سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہیں تو خدا کو پکارنے اور خالص اسی کی عبادت کرنے لگتے ہیں۔ پھر جب وہ ان کو نجات دے کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو کم ہی ہیں جو انصاف پر قائم رہتے ہیں۔ اور ہماری نشانیوں سے وہی انکار کرتے ہیں جو عہد شکن اور ناشکرے ہیں۔"

اس بات کی تو اللہ تعالیٰ بھی گواہی دے رہے ہیں کہ گھبراہٹ اور تکلیف کے وقت مشرکین عرب تمام جھوٹے خداؤں کو چھوڑ کے صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف توجہ کرتے تھے اور خالصتہً اسی کی عبادت میں لگ جاتے تھے۔

اب ان مشرکینِ عرب کا تقابُل اس دَور کے نام نہاد مسلمانوں سے کیجیے جو کہ خوشی کیا، غم کیا، گھبراہٹ کیا، عام حالات کیا، ہر حال میں غیر اللہ کو پکارتے ہیں اور انہی سے مُرادیں مانگتے ہیں۔

آپ نے اوپر کی سطُور میں دیکھا کہ مُشرکینِ عرب قرآنِ مجید کی زبان میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ خالق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ لیکن اس دَور کے نام نہاد مسلمانوں کو دیکھیے کہ وہ کسی قبر والے سے جا کے چاہے بیٹا لے آئیں اور چاہے بیٹی لے آئیں۔

دیکھیے قرآن مجید کس قدر واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ غیروں سے مرادیں مانگنا اور دُعا کرنا نہ صرف یہ کہ حرام و ناجائز ہے بلکہ یہ کہ اس سے کچھ بھی فائدہ نہیں ہوتا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ۔

(الرّعد: ۱۴)

"اسی کو پکارنا حق ہے۔ رہیں وہ دوسری ہستیاں جنہیں اس کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں، انہیں پکارنا تو ایسا ہے جیسا کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس سے درخواست کرے کہ تو میرے منہ تک پہنچ جا حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں۔ بس اسی طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں ہیں مگر ایک تیرِ بے ہدف۔"

عبادت، استعانت اور استغاثہ تینوں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی مخصوص ہیں۔ کسی غیر کو اس میں شریک نہیں کیا جا سکتا یعنی عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی کی جا سکتی ہے۔ مدد صرف اسی کی مانگی جا سکتی

ہے۔ صرف اسی کے سامنے فریاد کی جاسکتی ہے۔ اور صرف وہی فریاد رسی کرتا ہے۔ جیسا کہ اس نے خود ارشاد فرمایا اور ہمیں یہ دعا سکھائی:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ (فاتحہ: ۴)

"ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں"

ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ (الانعام: ۱۶۲)

"کہہ دو کہ میری نماز، میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے"

باب ۳۶

لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کا مطلب

ہم نے گزشتہ صفحوں میں دیکھا کہ مشرکینِ مکہ توحیدِ ربوبیت کے منکر نہیں تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ اس وقت تک جنگ فرمائی جب تک کہ وہ توحیدِ الوہیہ پہ ایمان نہیں لے آتے۔ اور انہوں نے اپنے اعمال عبادت کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص نہیں کر لیا یعنی دعا، استعانت، قربانی، نذر و نیاز، خوف و رجاء، محبت، توکل، انابت، خشیت، رغبت، فرمانبرداری، رکوع و سجود، خشوع و خضوع، عاجزی و تذلل، تعظیم حتیٰ کہ وہ تمام اعمال جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں، وہ سارے اعمال جب تک انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے ہی خالص نہ کر لیے اور اس میں غیروں کو شریک کرنا بند نہ کر دیا اس وقت تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ جنگ ہی فرماتے رہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید کیا تھی؟

گزر چکا کہ توحید کی کئی قسمیں ہیں: مثلاً توحیدِ الوہیہ، توحیدِ ربوبیہ اور توحید اسماء وصفات۔

اب ہم توحیدِ الوہیہ کے بارے میں کچھ تفصیل سے بیان کریں گے۔ اس کی اصل بنیاد کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ ہے۔

اِلٰہ کا مطلب

اِلٰہ کا مطلب کیا ہے؟ عربی زبان میں کلمہ الٰہ کا مادہ تین حروف ہیں: ا، ل، ہ۔ اور جیسا کہ بعض معاجم اللغۃ میں مذکور ہے، یہ کلمہ مندرجہ ذیل معنوں میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے:

أَلَہَ الرجل يَألَہُ : یعنی پناہ پکڑی۔

اَلِهْتُ اِلٰی فُلَانٍ : "یعنی فلاں کے ہاں مَیں نے سکون و اطمینان حاصل کیا۔"

اَلِہَ الرَّجُلُ اِلَی الرَّجُلِ : "یعنی ایک شخص دوسرے شخص کی طرف شدّتِ شوق و محبّت سے متوجہ ہُوا۔"

اَلِہَ الْفَصِیْلُ بِاُمِّہٖ : "یعنی وہ بچّہ جس کا دُودھ چھڑایا گیا، اپنی ماں سے بے قرار ہو کے لپٹ گیا۔"

اَلِہَ اَلَاھَةً وَاُلُوْھَةً : "یعنی عبادت کی۔"

لَاہَ یَلِیْہِ لَیْھًا : "یعنی پردے میں آگیا۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ وہ ہستی جس کی پناہ پکڑی جاتے، جس کے ہاں سکون و اطمینان نصیب ہو، جس کی طرف انتہائی شوق و محبّت کے ساتھ رجوع کیا جاتے اور جس کی طرف یُوں بے قرار ہو کے توجہ کی جاتے جیسے وہ بچّہ جس کا دُودھ چھڑا دیا جاتا ہے اپنی ماں سے لپٹ جاتا ہے اور وہ ہستی جس کی کہ عبادت کی جاتے، اور وہ ذات جو پردے میں ہو۔

علاّمہ ابنِ قیّم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اِلٰہٌ سے مُراد وہ ذات ہے کہ دل جس کی محبت میں بے قرار ہوتے ہوں، اسی کی جلالتِ شان سے مرعوب ہوں، اسی کی طرف رجوع کرتے ہوں، اسی کا اکرام و تعظیم کرتے ہوں، اسی کے سامنے ذلّت، خضوع اور خوف سے پیش آتے ہوں، اسی سے امیدیں باندھتے ہوں اور اسی پہ بھروسہ رکھتے ہوں۔

علاّمہ ابنِ رجب کہتے ہیں "الٰہ" وہ ذات ہے کہ جس کی اطاعت کی جاتی ہو اور جس کی ہیبت و جلالتِ شان کی وجہ سے اس کی نافرمانی نہ کی جاتی ہو۔ اسی سے محبّت کی جاتی ہو اسی سے ڈرا جاتا ہو، اسی سے امیدیں باندھی جاتی ہوں، اسی پہ بھروسہ کیا جاتا ہو، اسی سے سوال کیا جاتا ہو، اسی کو پکارا جاتا ہو، اور یہ سارے اعمال سوائے اللہ کے اور کسی کے لیے جائز نہیں۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "الٰہ" وہ ذات ہے کہ جس کے ساتھ دل انتہا درجے کی محبت رکھتے ہوں، انتہا درجے کی تعظیم اور اجلال و اکرام کرتے ہوں اور انتہا درجے کا خوف و رجاء بھی اسی سے رکھتے ہوں۔ اور ایسے ہی تمام امور اسی سے متعلق رکھتے ہوں۔"

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں "الٰہ" فِعال" کے وزن پر اور مفعول کے معنوں میں ہے۔ جیسے کِتاب مکتوب کے معنوں میں ہے۔ اس کا ماضی کا صیغہ "اَلَہَ" اور مصدر "اِلٰہۃ" ہے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے "عَبَدَ عِبَادَۃً" یعنی اس نے عبادت کی۔"

لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ کی تشریح کرنے سے پہلے یہ بات بیان کر دینا ضروری ہے کہ کلمہ شہادت پہ ایمان کی ایک بہت بڑی شرط یہ ہے کہ اس کے معنی بھی سمجھے جائیں۔ اگر کوئی شخص اس کلمہ کا مفہوم سمجھے بغیر اس کا زبان سے اقرار کرے تو دائرۂ ایمان میں داخل نہیں ہوگا۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ صحیح مسلم کے حاشیہ "المفہم" میں باب باندھتے ہیں کہ:

"لَا یَکْفِی مُجَرَّدُ التَّلَفُّظِ بِالشَّہَادَتَیْنِ بَلْ لَابُدَّ مِنْ اِسْتَیْقَانِ الْقَلْب"

"کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو صرف لفظی طور پر زبان سے کہہ دینا کافی نہیں ہے بلکہ (ایمان کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ) اس کا مطلب سمجھ کر دل سے اس کی گواہی دے اور دل کے اندر اس کا یقین پیدا ہو۔"

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ (محمد: ۱۹)

"خوب اچھی طرح سے جان لو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔"

یعنی اللہ تعالیٰ بھی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پیش کرتے ہوئے ابتداء علم سے کرتے ہیں۔ اگر اس کلمہ کا علم حاصل نہیں ہے تو ایمان بھی حاصل نہیں ہے۔ اسی آیت کی بنیاد پہ بعض علمائے سلف نے علم کو ایمان پر مقدم قرار دیا ہے۔ مُشرکینِ عرب کی مشکل یہ تھی کہ وہ اس کلمہ کے معنی سمجھتے تھے اور

اس کے تقاضوں کو اچھی طرح سے جانتے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو بھی جانتے اور مانتے تھے لیکن تمام عبادات اس کے لیے خالص کرنے کو تیار نہیں تھے، بالفاظِ دیگر کفارِ مکہ کلمہ شہادت کی حقیقت کو تو سمجھتے تھے لیکن اس اخلاص سے انکار کرتے تھے جس پر کلمہ طیبہ دلالت کرتا ہے مگر افسوس کہ اس دور کا مسلمان کلمہ طیبہ کے مفہوم کو بھی نہیں سمجھتا ہے۔ اور نہ معنی جانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ صبح سے شام تک جپتا رہتا ہے لیکن غیر اللہ کو بھی پکارتا ہے۔

معلوم ہوا کہ ایمان کے حصول کی خاطر لا الٰہ الا اللہ کا مطلب سمجھنا ازبس ضروری ہے کہ یہی وہ کلمہ ہے جس کو لے کر تمام انبیاء و رُسل انسانیت کے پاس آتے رہے اور یہی وہ کلمہ ہے جو دنیا کے تمام کلمات میں سب سے زیادہ مظلوم ہے۔ اسی سے ہی لوگ سب سے زیادہ انحراف کرتے رہے۔ اسی کو سمجھنے میں سب سے زیادہ ٹھوکر کھاتے رہے اور اگر سمجھتے رہے تو اسی کے مقابلے میں سب سے زیادہ ڈھٹائی کا ثبوت دیتے رہے۔

تو آیئے اس کلمہ کا مطلب تفصیل سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ کلمہ اپنے اندر معانی، مفاہیم اور مطالب کا سمندر لیے ہوئے ہے۔ یہاں پر ہم اس کے چند معنی بیان کرتے ہیں جو ہماری نظر میں زیادہ اہم ہیں:

۱۔ لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللہُ: یعنی اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

۲۔ لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللہ۔ (اللہ کے سوا کوئی محبت کا مستحق نہیں)

۳۔ لَا مُتَصَرِّفَ فِی الْعَالَمِ اِلَّا اللہُ، (کائنات میں اللہ کے سوا کسی کا بھی تصرف نہیں)

۴۔ لَا مَرْجُوَّ اِلَّا اللہ۔ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی امیدوں کا مرکز نہیں ہو سکتا۔

۵۔ لَا مَخُوْفَ اِلَّا اللہ۔ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی اس قابل نہیں کہ اس سے ڈرا جائے)۔

اب ہم ان کلمات کی مزید شرح بیان کریں گے

لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللہُ: کلمہ "اِلٰہَ" کے معنی میں سے ایک معنی معبود کے ہیں اور یہی

اس کے بنیادی معنی ہیں۔

کلمہ عبد کا مادہ عربی زبان میں ع ۔ ب ۔ د ہے۔ عبد یا عبید اُس غلام کو کہتے ہیں جسے آزادی حاصل نہ ہو۔ چنانچہ قرآن مجید میں وارد ہے:

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ (الشعراء: ۲۲)۔

"اور یہی نعمت تم مجھ پر جتاتے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا لیا"

عبادت اس اطاعت کو کہتے ہیں جو خشوع و خضوع اور دل کے ساتھ کی جاتی ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِيٓ آدَمَ أَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۔ (یٰسٓ: ۶۰)

"اے بنی آدم کیا میں نے تجھ سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہیں کروگے؟"

اب اس آیت میں عبادت کو مجرد اطاعت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کوئی شخص شیطان کے سامنے نہ رکوع کرتا ہے نہ سجدہ، اور نہ کوئی شخص اپنے آپ کو شیطان کا بندہ کہلواتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ ۔ (المومنون: ۴۷)

"اور ان دونوں کی قوم کے لوگ ہمارے سامنے مطیع و منقاد ہیں"

یہاں پر بھی لفظ عبادت بمعنیٰ اطاعت استعمال ہُوا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کلمہ "عبادۃ" میں دو مفہوم شامل ہیں:

۱۔ انتہا درجے کی محبت۔

۲۔ انتہا درجے کی اطاعت۔

جب انتہا درجے کی محبت اور اطاعت آپس میں جمع ہو جاتی ہیں تو وہ عبادت بن جاتی ہے۔ امام ابن تیمیہؒ عبادت کی شرح میں لکھتے ہیں: عبادت کا اصل معنی ہے "ذُل" یعنی تواضع اور انکساری۔ عربی میں "طَرِيْقٌ مُعَبَّدٌ" پٹے ہوئے راستے کو کہتے ہیں جسے قدموں کی چاپ نے

روند دیا ہو۔ اور وہ سیدھا ہو گیا ہو۔

لیکن عبادت جس کا اللہ تعالیٰ حکم فرماتے ہیں اس میں صرف تواضع انکساری ہی نہیں ہے بلکہ وہ تواضع ہے جس کی بنیاد محبت ہو۔ اس لیے کہ جتنی زیادہ محبّت حاصل ہو گی اتنا زیادہ تواضع انکسار میں بھی اضافہ ہو گا۔

محبّت کا آخری درجہ "تَیَّم" کہلاتا ہے۔ محبت کے درجے یہ ہیں:

۱۔ پہلا درجہ "علاقہ" ہے یعنی دل کا محبوب سے ایک تعلق پیدا ہو جانا۔

دوسرا درجہ الصبابہ ہے یعنی دل کا محبوب کی طرف جھک جانا۔

تیسرا درجہ "الغرام" ہے یعنی دل کا محبوب کے ساتھ جڑ جانا۔

چوتھا درجہ "العشق"

پانچواں درجہ "اَلتَّتَیُّم" ہے، یعنی محبوب کے لیے سب کچھ فنا کر دینا۔ عربی میں کہا جاتا ہے: "تیم اللہ" اور اس کا مفہوم لغت میں لکھا جاتا ہے: أی عبد اللہ، یعنی فلاں شخص اللہ کے عشق میں گرفتار ہو گیا، یعنی اس کا بندہ بن گیا۔ عربی میں "متیم" اُس شخص کو کہتے ہیں جو کہ "المُعَبَّد لِمَحْبُوبِہ" ہو۔ یعنی اپنے محبوب کی محبت میں فنا ہو کے اس کا بندہ بن گیا ہو۔

تو معلوم ہُوا کہ عبادت دو چیزوں پر مشتمل ہے:

۱۔ محبّت،

۲۔ اطاعت۔

اگر انسان کسی کیساتھ انتہا درجے کی محبت کرے مگر اطاعت نہ کرے تو وہ عبادت نہ ہو گی۔ اسی طرح سے اگر کسی کی بلا چون و چرا اطاعتِ کاملہ تو کرے لیکن محبّت نہ ہو بلکہ اطاعتِ کاملہ تو کرے لیکن محبّت نہ ہو بلکہ اطاعت کرتے ہُوئے دل میں بغض ہو تو وہ عبادت شمار نہیں ہو گی۔ مثلاً ایک باپ اپنے بیٹے سے انتہا درجے کی محبّت کرتا ہے تو یہ محبت ہو گی، عبادت نہیں ہو گی یعنی بلا شرکتِ غیرے محبتِ کامل اور بلا شرکتِ غیرے اطاعتِ تامہ کو عبادت

کہتے ہیں۔

"عَبْدُ اللہ" یعنی اللہ کا بندہ وہ ہے جو اللہ سے زیادہ کسی اور کو محبوب نہ رکھے اور اللہ تعالیٰ کی ہی بے چون وچرا اطاعتِ کاملہ بجا لائے۔ چنانچہ وہ شخص جو اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ سے محبت کرے، یا اللہ کے علاوہ غیر اللہ کی بھی بے چون وچرا اطاعت کرے وہ اللہ کا بندہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۔ (توبہ: ۲۴)

"اے لوگو، جو ایمان لاتے ہو اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو بھی رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہونگے۔ اے نبی کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے مندا پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کے جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔"

چنانچہ جس طرح سے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ جنسِ عبادت میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوا کہ جنسِ محبت میں اور جنسِ اطاعت میں بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ جتنی محبتیں اور اطاعتیں ہوں اللہ کی محبت اور اللہ کی اطاعت کے ماتحت اور تابع ہوں، اور جو محبتیں اللہ کی محبت سے ٹکرا جائیں خواہ وہ محبت آباؤ اجداد اور خاندان اور اولاد کی ہو ان کو

ختم ہو جانا چاہیے ۔اسی طرح سے جو اطاعتیں اللہ کی اطاعت سے ٹکرا جائیں ان کو بھی ختم ہو جانا چاہیے یہی ایمان کا تقاضا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ " (البقرہ:۱۶۵)

"لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، اور وہ اس طرح کہ ان کے ساتھ یوں محبت کرتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کی جانی چاہیے۔"

چنانچہ محبت و اطاعت اللہ تعالیٰ کا ہی حق ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے ذیل میں ہی سب سے زیادہ اللہ کے رسول کا حق ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے رسول کو ہی راضی کرنا مسلمانوں کا شیوہ قرار دیا گیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ " (التوبہ :۶۲)

"اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول سب سے زیادہ اس بات کے حق دار ہیں کہ انہیں راضی کیا جائے۔"

تمام اعمال عبادات میں اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص

چنانچہ کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ان معنوں میں کہ "لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰه یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں" اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ عبادت صرف اسی کی ہونی چاہیے اور اس میں کسی کو شریک نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ " (الزمر:۲)

"لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔"

قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ "

(الرعد : ۳۶)

"تم صاف کہہ دو کہ مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا

ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤں۔ لہٰذا میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے۔"

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (البقرہ: ۱۶۳)

"تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بے حد رحمت و محبت والا اور رحیم ہے۔"

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔

(توبہ: ۳۱)

"حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں۔ پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ عبادت خالصتہً اللہ تعالیٰ کی کی جانی چاہیے اور تمام انواعِ عبادت یا عبادت سے متعلق تمام کے تمام اعمال صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی خالص ہونے چاہییں اور اس میں کسی کو شریک نہیں کیا جانا چاہیے۔

ہم ذیل میں چند اہم اعمالِ عبادت بیان کرتے ہیں۔ یہ اعمال اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لیے جائز نہیں ہیں۔

۱۔ نماز، رکوع و سجود:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ (الحج: ۷۷)

"اے لوگو جو ایمان لاتے ہو رکوع اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی بندگی کرو۔"

۲۔ دعا

یہ بندے پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ بندہ سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی سے دعا نہ مانگے، خواہ دنیا اور دین کا کوئی بھی مطلب و مقصد کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّمَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ (الحج: ۶۲)

"یہ اس لیے کہ خدا ہی برحق ہے اور جس چیز کو (کافر) خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ باطل ہے۔"

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ۔ (یونس: ۱۰۶)

"اور اللہ کو چھوڑ کر کسی ایسی ہستی کو نہ پکار جو تجھے نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ نقصان"

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَاءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ۔ (فاطر: ۱۳-۱۴)

"اسے چھوڑ کر جن دوسروں کو تم پکارتے ہو وہ ایک پرکاہ کے مالک بھی نہیں ہیں۔ انہیں پکارو تو وہ تمہاری دعائیں سن نہیں سکتے اور سن لیں تو ان کا تمہیں کوئی جواب نہیں دے سکتے اور قیامت کے روز وہ تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے۔ حقیقتِ حال کی ایسی صحیح خبر تمہیں ایک خبردار کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا"

اسی طرح سے شفاعت بھی صرف اللہ تعالیٰ کا ہی حق ہے۔ نہ اس کی اجازت کے بغیر کسی سے شفاعت کرائی جا سکتی ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی اس کے سامنے کسی کی شفاعت کر سکتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ۔ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا۔ (الزمر: ۴۳-۴۴)

"کیا اس خدا کو چھوڑ کر ان لوگوں نے دوسروں کو شفیع بنا رکھا ہے؟ ان سے کہو کیا وہ شفاعت کریں گے خواہ ان کے اختیار میں کچھ نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں؟ کہو شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔"

۳۔ ذبح و قربانی:

اللہ کے نام کے سوا کسی کے لیے نہ ذبح کیا جا سکتا ہے اور نہ اللہ کے سوا کسی کے لیے قربانی کی جا سکتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ (الانعام: ۱۶۲-۱۶۳)

"کہہ دیجیے میری نماز میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں"

۴۔ نذر

نذر نیاز و نذرانہ اور اس قسم کی ساری چیزیں سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے لیے جائز نہیں ہیں۔

۵۔ طواف

سوائے بیتُ اللہ شریف کے اور کسی جگہ کا طواف جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ۔ (الحج: ۲۹)

"انہیں بیت العتیق یعنی اللہ تعالیٰ کے پُرانے گھر کا ہی طواف کرنا چاہیے"

۶۔ توبہ:

سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے سامنے توبہ نہیں کی جا سکتی۔ اور صرف وہی معاف کرنے والا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ (آل عمران: ۱۳۵)

"اور سوائے اللہ کے اور کون گناہوں کو معاف کر سکتا ہے؟"

۷۔ الاستعاذہ (کسی کی پناہ میں آنا)

صرف اللہ تعالیٰ ہی کی پناہ حاصل کی جا سکتی ہے، اس لیے کہ اصل جائے پناہ وہی ہے۔ سوائے اس کے اور کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (النّاس: ۱)

"کہہ دیجیے کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ میں آتا ہوں۔"

۸۔ استغاثہ (فریاد کرنا)

صرف اللہ تعالیٰ سے ہی مدد طلب کی جا سکتی ہے اسی کے سامنے ہی فریاد کی جا سکتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا لَا يُسْتَغَاثُ بِي فَإِنَّهُ يُسْتَغَاثُ بِاللَّهِ سُبْحَانَهُ۔

"میرے سامنے استغاثہ اور فریاد نہیں کی جا سکتی، یہ تو صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے ہی کی جا سکتی ہے۔"

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ (الانفال: ۹)

"جب تم اللہ کو مدد کے لیے پکار رہے تھے اور فریاد کر رہے تھے تو اُس نے تمہاری فریاد سُنی۔"

لَا مَحْبُوبَ إِلَّا اللّٰه [اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی محبوب حقیقی نہیں]

جس طرح سے لا الٰہ الا اللہ کا ایک معنیٰ یہ ہے کہ "لَا مَعْبُودَ إِلَّا اللّٰه"۔ اسی طرح سے "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه" کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ "لَا مَحْبُوبَ إِلَّا اللّٰه" یعنی وہی محبوبِ حقیقی ہے۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے دیکھا کہ "اِلا اللہ" کے معنی محبوب اور من موہن کے ہیں اور "اِلٰہ" اُس معبود کو کہا جاتا ہے کہ دل جس کی طرف محبت، اجلال و تعظیم کے ساتھ جھک جائیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ عبادت میں بنیادی طور پر "دو مفہوم پائے جاتے ہیں۔ ایک محبت اور دوسرے اطاعت۔

مُشرکینِ عرب اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ اللہ کے سوا کوئی رب اور خالق نہیں ہے۔ لیکن وہ اپنے اعمالِ عبادت کو جن میں خاص طور پر محبت و اطاعت، ذکر کیے جا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے خالص نہیں کرتے تھے بلکہ ان میں دوسروں کو بھی شریک ٹھہرا لیتے تھے۔

از راہِ تفنن عرض ہے کہ محبت میں تو کوئی بھی اپنا شریک گوارہ نہیں کرتا ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کی بیوی اپنا سب کچھ اپنے خاوند پہ نچھاور کرتی ہے، صبح سے شام تک اس کے گھر کی چاکری

کرتی ہے لیکن اگر وہ جنسِ محبّت میں خاوند کے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کر دے تو اس کی ساری قربانی اور خدمت و چاکری اس کے منہ پر مار دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو محبّت کا سرچشمہ ہے، محبوبِ حقیقی ہے اور محبِ ازلی و ابدی ہے، وہی انسان کی محبت، جذبات و عواطف کا اصل حقدار ہے، وہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اس کی محبت میں کسی کو شریک کیا جائے۔ وہ یہی چاہتا ہے کہ اصل محبت ہو تو اسی سے ہو، چاہت ہو تو اسی کی ہو، باقی سب چاہتیں اور محبّتیں اس کی چاہت اور محبت کے تابع ہوں۔ اور جو لوگ یہ نہیں کر سکتے ان کو اللہ تعالیٰ مُشرک قرار دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللهِ اَنْدَادًا يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللهِ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ ۔ (البقرہ: ۱۶۵)

"لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک و ہمسر ٹھہراتے ہیں اور وہ اس طرح کہ انہیں یوں پیار کرتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کو پیار کیا جانا چاہیے وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں ان کی سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہوتی ہے۔"

چنانچہ ثابت ہُوا کہ ایمان کا یہ تقاضا ہے کہ محبّتوں اور چاہتوں کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات ہو اور باقی سب چاہتیں اس کی محبت کے تابع ہوں۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ مشرکین کی اس لیے مذمت فرما رہے ہیں کہ وہ محبت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے باطل معبُودوں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں کیونکہ انہوں نے مؤمنین کی طرح خالص اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں کی۔ بلکہ اس محبّت میں اُنہوں نے غیروں کو بھی شریک ٹھہرایا۔ محبّت میں اسی شرک کا ذکر اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں۔ مُشرکین اور ان کے باطل معبود جب دوزخ میں اکٹھے جمع ہونگے تو مُشرک اپنے معبُودوں سے کہیں گے کہ:

تَاللهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (الشعراء: ۹۷-۹۸)

"قسم خدا کی ہم تو کھلی گمراہی میں مبتلا تھے جب ہم تم لوگوں کو ربّ العالمین کی برابری کا

درجہ دے رہے تھے۔"

یہ بات بالکل واضح ہے کہ مشرکین ربوبیت اور خلقِ کائنات میں اپنے معبودوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں سمجھا کرتے تھے بلکہ وہ صرف محبت اور عظمت میں برابری کے قائل تھے۔ اسی محبت اور عظمت میں برابری کے قائل تھے۔ اسی محبت کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ۔ (المآئدہ: ۵۴)

"اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھر تا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہو گا جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والوں کی مندرجہ ذیل علامات بیان کی گئی ہیں:۔

۱۔ یہ محبت یک طرفہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے محبت کرتے ہیں اور پھر بندے اپنے اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اصل محب تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے البتہ بندوں کی محبت ایک "جوابی کارروائی" ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت کا ایک ادنیٰ سا عکس ہے۔

۲۔ اللہ سے محبت کرنے والے یا مومنین آپس میں انتہائی رحمدل اور متواضع ہوتے ہیں، انکساری اور عاجزی میں ایک دوسرے کے سامنے بچھ جاتے ہیں۔ یعنی یوں ہوتے ہیں جیسا کہ بیٹا باپ کے سامنے یا غلام اپنے آقا کے سامنے۔

۳۔ کفار کے سامنے وہ متواضع اور منکسر مزاج نہیں ہوتے بلکہ صاحب جبروت ہوتے ہیں۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مومن کی شان خوب بیان فرمائی ہے:

؎ اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

۴۔ وہ اللہ کی راہ میں دامے، درمے، سخنے، جانے، ہر طرح سے جہاد کرتا ہے اور اسی کی راہ میں تن من دھن لٹا دیتا ہے۔

۵۔ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد و تبلیغ کرتے ہوئے کسی ملامت کی پروا نہیں کرتا۔

امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ محبت اور اللہ سے محبت کرنے والوں کی تعریف میں خوب لکھتے ہیں:

"محبت کی اس سے زیادہ اور کوئی تعریف نہیں کی جاسکتی کہ وہ محبت ہے۔ محبت کی جس قدر وضاحتیں کرتے جاؤ بات اور اُلجھتی چلی جاتی ہے، اس کی تعریف خود اس کا اپنا وجود ہے۔ محبت بس محبت ہی ہے۔ اس پر گفتگو کرتے ہوئے جن لوگوں نے تشریحات کیں وہ صرف اس کے اسباب، موجبات، علامات، شواہد، ثمرات اور احکام پر گفتگو کر سکے۔ نفسِ محبت پہ گفتگو کرنا بہت مشکل ہے۔ محبت تو صرف کی جاسکتی ہے بتائی نہیں جاسکتی۔ محبت کی تعریف میں سب سے جامع بات وہ ہے جسے ابوبکر قطانی رحمۃ اللہ علیہ نے جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے۔ ابوبکر قطانی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حج کے زمانے میں مختلف ملکوں سے علماء اور شیوخ مکہ مکرمہ میں آئے ہوئے تھے، محبتِ الٰہی پہ بات چھڑ گئی۔ اس اجماع میں جنید بغدادی سب سے کم عمر تھے۔ علماء نے ان سے پوچھا کہ آپ کی اس معاملے میں کیا رائے ہے۔

جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے علمائے کرام کی جب یہ فرمائش سنی تو خاموش ہوگئے اور کچھ دیر کے لیے سر جھکائے رکھا پھر سر اٹھایا تو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی برس رہی تھی اور زبان پر یہ الفاظ جاری تھے۔

"محبت یہ ہے کہ بندہ اپنے جی سے گزر گیا ہو اور بے خود ہو چکا ہو، اپنے پروردگار کا ہر گھڑی ذکر کر رہا ہو اور اس کی ادائیگی میں ہر دم مشغول ہو، دل کی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا ہو اللہ کی ہیبت کے انوار نے اس کے دل کو جلا دیا ہو۔ ہر وقت جامِ محبت

سے اسی کی شرابِ صفا پیتے رہتا ہو، اللہ تعالیٰ کے پردہ ہائے غیب سے اس پہ حیا منکشف ہو جاتے۔ اگر وہ ہمکلام ہو تو اللہ سے اور اوروں سے باتیں کرے تو اللہ تعالیٰ کے بارے ہیں یہ شخص اگر کوئی حرکت کرتا ہے تو امرِ ربّی سے، اگر سکون اختیار کرتا ہے تو اللہ کے حضور ہی سکون اختیار کرتا ہے۔ یہ شخص اگر جیتا ہے تو اللہ کے لیے۔ اللہ کے بل بوتے پر اور اللہ تعالیٰ کی معیت میں جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے مُنہ سے یہ کلام نکل رہا تھا اور تمام علماء و مشائخ پہ سناٹا چھایا ہُوا تھا اور سب زار و قطار رو رہے تھے۔ جب حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ خاموش ہُوتے تو سب نے کہا اے تاج العارفین اس موضوع پر آپ نے مزید گفتگو کی گنجائش نہیں چھوڑی۔"

قرآن مجید میں ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ۔ (بنی اسرائیل: ۵۷)

"یہ لوگ کہ جن کو مشرکین پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف ذریعہ (وسیلہ) ڈھونڈ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرّب بنتا ہے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔"

اس آیتِ کریمہ میں اہلِ محبّت کی تین علامات بیان کی گئی ہیں:

۱۔ کہ اللہ تعالیٰ کی محبّت کی وجہ سے وہ وسیلے اور ذریعے ڈھونڈتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح انہیں ان کے محبوب کا قرب حاصل ہو۔ وسیلے سے مراد اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اعمالِ صالحہ ہے۔

۲۔ الرجاء: یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ہمیشہ امیدوار رہتے ہیں۔

۳۔ خوف: وہ اعمالِ صالحہ کرتے ہوتے بھی جہاں وہ اللہ کی رحمت کے اُمیدوار ہیں بالکل اسی طرح سے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں جس طرح ایک محبت کرنے والا اپنے محبوب کے بارے میں اس خطرے کا شکار رہتا ہے کہ کہیں اس کے محبوب کی نظرِ کرم میں فرق نہ پڑ جائے اور وہ اس کی

نظر سے گر نہ جائے۔

یہاں پر یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے خوف ایسا نہیں ہونا چاہیے جیسے دشمن سے ہوتا ہے یا سانپ اور شیر سے ہوتا ہے۔ یہ وہی خوف ہے جو ایک مُحبّ کو اپنے محبوب سے ہوتا ہے۔ یہ خوف بھی محبت بھرا ہوتا ہے کہ کہیں دوست کے مزاج میں برہمی نہ آجائے

فانیؔ میں نے ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات
جب مزاجِ یار کچھ برہم نظر آیا مجھے (فانیؔ)

وسیلہ کی شرح :-

پاک و ہند کے خدایانِ باطل لفظ وسیلہ کی شرح میں بہت ظلم ڈھاتے ہیں۔ دیکھیے قرآنِ مجید میں کس قدر وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کا اصل ذریعہ اتباعِ سُنّت ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

" قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔ (آل عمران : ۳۱)۔

" کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا "

اس آیت کو آیتِ محبت کہتے ہیں اور یہ حُجّتِ کافیہ ہے اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا اصل معیار اتباعِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اور اتباعِ نبیؐ کا اصل ثمرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبت ہے۔ دیکھیے وسیلے کا لفظ قرآن مجید میں اس طرح سے استعمال ہوا کہ از خود اس کی شرح ہو رہی ہے :

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (المائدہ : ۳۵)

" اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور اس کی جناب میں باریابی کا ذریعہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو شاید کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو جائے "

اس آیت میں وسیلے سے پہلے تقویٰ کا ذکر ہے اور وسیلے کے بعد جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر ہے۔ صاف پتہ چل رہا ہے کہ وسیلہ سے مراد تقویٰ اور جہاد ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور کس طرح باریابی نصیب ہو؟ کیونکر اس کا تقرّب حاصل ہو؟ اس کی رحمت و محبّت کا جام کس طرح لب تک آئے؟ اس کے بارے میں امام ابن قیّم رحمۃ اللہ علیہ نے عمدہ بحث کی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے وصول کے لیے دس اُمور کی نشاندہی کرتے ہیں یعنی انہیں وسیلۂ محبت قرار دیتے ہیں:

۱۔ قرآن مجید کی اس طرح تلاوت کی جائے کہ اس کے معنی اس کے ہر لفظ کے معنی، مفہوم اور اس کے تقاضوں پر غور و فکر اور تدبّر ہو۔

۲۔ فرض نماز کے بعد نوافل کثرت سے پڑھے جائیں تاکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو

۳۔ زبان، دل، عمل اور زبانِ حال سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے مطلب یہ کہ ذکر کی کثرتِ محبّت کا سبب بھی ہے اور نتیجہ بھی۔

۴۔ جب شہوات کا غلبہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی محبوب چیز کو اپنی محبوب چیز پر ترجیح دے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں غور و فکر کرنا، اس کی آیات کا مشاہدہ کرنا اور اس کی معرفت حاصل کرنے کے درپے ہو جانا۔

۶۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ظاہری و باطنی انعامات و احسانات کو بار بار ذہن میں مستحضر کرنا اور ان کا مشاہدہ کرنا۔

۷۔ دل کے کشکول کو ہر وقت اللہ تعالیٰ کے حضور انتہائی عاجزی اور انکساری کے ساتھ پیش کیے رکھنا۔

۸۔ پچھلی رات انتہائی یکسوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا اور قرآن مجید کی تلاوت کرنا اور آخر میں توبہ و استغفار کرنا۔

۹۔ علماء اور صالحین کی مجالس میں زیادہ سے زیادہ بیٹھنا اور ان کی گفتگو سے فائدہ اٹھانا اور ان کی مجلس میں خود صرف اس وقت گفتگو کرنا جب مصلحت متقاضی ہو۔

۱۰۔ وہ تمام اسباب و ذرائع جو اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث ہیں ان سے دُوری اختیار کرنا۔

اَلْحُبُّ لِلّٰہِ [اللہ تعالیٰ کی خاطر کسی سے محبت کرنا]

ہم نے دیکھا کہ محبتوں اور چاہتوں کا مرکز و محور اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہی ہونا چاہیے۔ اور یہی ایمان کا تقاضا ہے۔ اس لیے یہ بات خود بخود معلوم ہو سکتی ہے کہ جتنی محبتیں اور چاہتیں ہوں گی وہ سب اللہ تعالیٰ کی محبت کے تابع ہوں گی اور وہ تمام چاہتیں اور محبتیں جو اللہ تعالیٰ کی محبت سے ٹکرائیں گی وہ اس قابل ہوں گی کہ خود بخود ختم ہو جائیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۔ (توبہ : ۲۴)

"اے نبی کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے لیے لے آئے۔"

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں حائل ہونے والی چیزیں یا آباؤ اجداد ہیں یا اولاد اور بھائی بند ہیں یا بیویاں ہیں یا خاندان ہیں اور مال و اسباب ہیں۔ یہی چیزیں عام طور پر اللہ تعالیٰ سے دور کرتی ہیں اور اس کی محبت میں حائل ہوتی ہیں۔ چنانچہ انہی کے بارے میں وعید سنا دی اور ان سب کی محبت کو اللہ تعالیٰ، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جہاد کی محبت پر قربان کر دینے کا حکم فرمایا۔

یہاں پر ایک اور بات بھی معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے بعد سب سے زیادہ درجہ اللہ تعالیٰ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ہے اور تیسرے درجے پہ جہاد کی محبت اور اہلِ جہاد کی محبت آتی ہے۔

یہاں یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم اور رہبا د واہلِ جہاد اور صالحین کی محبت بھی اللہ تعالیٰ کی محبّت کے تابع ہے۔

احمد و طبرانی نے روایت کیا ہے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا:

لَا یَجِدُ الْعَبْدُ صَرِیْحَ الْاِیْمَانِ حَتّٰی یُحِبَّ لِلّٰہِ وَیُبْغِضَ لِلّٰہِ فَاِذَا اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَحَقَّ الْوَلَایَۃَ لِلّٰہِ۔ (۱۵: ص ۴۲۳)

"کوئی شخص بھی ایمان کامل نہیں پا سکتا جب تک کہ صرف اللہ کے لیے دوسروں سے محبت نہ کرے اور صرف اللہ کے لیے دوسروں سے بغض نہ رکھے جب وہ اللہ کے لیے محبت کرتا ہے اور اللہ کے لیے بغض رکھتا ہے تو اللہ کی ولایت کا مستحق ہو جاتا ہے۔"

ایک اور حدیث میں ہے حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا:

اَوْثَقُ عُرَی الْاِیْمَانِ اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ۔ (رواہ الطبرانی وغیرہ)

"ایمان کا مضبوط ترین رشتہ یہ ہے کہ اللہ کے لیے ہی محبّت ہو اور اللہ عزوجلّ کے لیے ہی بغض ہو۔" (۱۵: ص ۴۲۳)

حدیثِ قدسی ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"اے ابنِ آدم مَیں نے ہر چیز کو تیرے لیے پیدا کیا اور تجھے اپنے لیے پیدا فرمایا۔ سو میرا تجھ پہ یہ حق ہے کہ وہ چیزیں مَیں نے تیرے لیے بطور ذرائع و اسباب پیدا کیا ہے۔ تجھے میری عبادت و محبّت سے غافل نہ کر دیں۔ (اس لیے کہ تیری عبادت کا مقصود میری عبادت ہے اور باقی سب چیزیں صرف اسباب و ذرائع ہیں مجھ تک پہنچنے کے)" (۱: ص ۲۳/۱)

اور بعض عُلماء کا یہ قول بھی لائقِ التفات ہے:

مَنْ شَغَلَکَ عَنِ اللّٰہِ فَھُوَ صَنَمُکَ۔

"جو چیز بھی تجھے اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے وہی تیرا بُت ہے۔ (تو اس کا پُجاری ہے)"

یہ بُت جس کی کہ عام طور پر لوگ پُوجا کرتے ہیں انسان کا نفسِ امّارہ بھی ہو سکتا ہے جو اُسے بُرائی

پر اُبھارتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوَاهُ (الفرقان: ۴۳)

"تو نے اُس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا۔"

تو وہ شخص جو اپنی خواہشِ نفس سے اس قدر محبت کرتا ہے کہ اس کی اطاعت اسے اللہ کی اطاعت سے غافل کر دیتی ہے تو یہ شخص فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کی محبت و اطاعت میں اپنی ہوائے نفس کو شریک ٹھہرا رہا ہے۔ یہی بات حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمائی:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى یَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ۔

(صححہ النووی فی کتاب الحجۃ)

"تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش اس بات کے تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا یَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ۔ (القصص: ۵۰)

"اگر یہ لوگ تیری بات نہیں مانتے (اس پہ آمنّا وصدّقنا نہیں کہتے) تو جان لو کہ یہ لوگ در اصل اپنی خواہشاتِ نفس کا اتباع کرنے والے ہیں۔"

لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو اپنی بیویوں اور اولاد کو اس طرح چاہتے ہیں کہ انہیں بھی اپنا صنم ٹھہرا لیتے ہیں۔ وہ اس طرح سے کہ اولاد و ازواج کی محبّت انہیں اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی محبّت اور جہاد فی سبیل اللہ سے غافل کر دیتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی انہی لوگوں کے بارے میں ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ۔

(التغابن: ۱۴)

"اے لوگو جو ایمان لاتے ہو تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے

دشمن ہیں، ان سے ہوشیار رہو۔"

لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو مال وجاہ سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ انہیں اپنا معبود ٹھہرا لیتے ہیں۔ مال وجاہ کی محبت وطلب میں اس قدر مگن ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت واطاعت سے غافل ہو جاتے ہیں اور جہاد فی سبیل اللہ کی توفیق نصیب نہیں ہوتی، بالفاظ دیگر یہ لوگ اپنی عملی زندگی میں مال وجاہ کو اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جہاد فی سبیل اللہ پہ ترجیح دے دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی لوگوں کو مال کا بندہ اور جاہ کا بندہ قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ فعلاً مال اور جاہ کی عبادت کرتے ہیں۔ دینار اور درہم ان کے معبود ہیں اور وہ جاہ و مال کے عبد۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ، تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ، تَعِسَ عَبْدُ الْخَمِيْصَةِ، تَعِسَ عَبْدُ الْخَمِيْلَةِ۔ إِنْ أُعْطِيَ رَضِيَ وَإِنْ لَمْ يُعْطَ سَخِطَ۔ تَعِسَ وَانْتَكَسَ وَإِذَا شِيْكَ فَلَا انْتَقَشَ۔ طُوْبىٰ لِعَبْدٍ آخِذٍ بِعِنَانِ فَرَسِهِ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ، أَشْعَثَ رَأْسُهُ مُغْبَرَّةٍ قَدَمَاهُ۔ إِنْ كَانَ فِي الْحِرَاسَةِ كَانَ فِي الْحِرَاسَةِ وَإِنْ كَانَ فِي السَّاقَةِ كَانَ فِي السَّاقَةِ۔ إِنِ اسْتَأْذَنَ لَمْ يُؤْذَنْ لَهُ وَإِنْ شَفَعَ لَمْ يُشَفَّعْ۔

(صحیح البخاری، عن ابی ہریرۃؓ)

"صحیح بخاری میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہلاک ہوا دینار کا بندہ، ہلاک وبدبخت ہوا درہم کا بندہ۔ ہلاک ہوا جبہ ودستار کا بندہ، ہلاک ہوا پوشاک وعبا کا بندہ، اگر اُسے دیا جائے تو خوش ہو جاتا ہے اور نہ دیا جائے تو ناراض۔ یہ بدبخت ہوا اور ٹھوکر کھائے۔ اگر اسے کانٹا لگے تو نہ نکالا جائے۔ خوشخبری ہو اس بندے کو کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے ہے۔ پراگندہ سر اور خاک آلود قدم ہے۔ اگر پہرے پر ہے تو پہرے پر، اور اگر فوج کے پچھلے حصہ میں ہے تو اسی میں اپنی ذمہ داری نبھا رہا ہے اگر رخصت مانگے تو رخصت نہ ملے اور اگر کسی کی سفارش کرے تو وہ قبول نہ کی جائے۔"

عبداللہ بن عقیم سے مرفوعاً روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ تَعَلَّقَ شَيْئًا وُكِلَ إِلَيْهِ - (رواہ احمد و ترمذی باسناد صحیح)

"جو شخص کسی سبب کے ساتھ بھی متعلق ہو گیا اسے اس سبب کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔"

یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اسباب پہ بھروسہ کرنے لگتا ہے اُسے اسباب کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا:

إِذَا تَبَايَعْتُمْ بِالْعِينَةِ، وَأَخَذْتُمْ أَذْنَابَ الْبَقَرِ وَرَضِيتُمْ بِالزَّرْعِ، وَتَرَكْتُمُ الْجِهَادَ سَلَّطَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ ذُلًّا لَا يَنْزِعُ عَنْكُمْ حَتَّى تَرَاجِعُوا دِينَكُمْ - (رواہ احمد و ابوداؤد)

"جب تم بیع بالعینہ کرنے لگو (بڑھ چڑھ کے تجارت میں حصہ لینے لگو) اور بیلوں کی دُمیں پکڑ لو اور کھیتی باڑی پر ہی راضی ہو جاؤ (اسے اپنا مقصد بنا لو) اور جہاد فی سبیل اللہ کو چھوڑ بیٹھو تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلّت اور رُسوائی مسلّط کر دے گا اور یہ ذلّت اُس وقت تک دُور نہیں ہو گی جب تک تم اپنے دین کی طرف لوٹ نہ آؤ گے۔"

چنانچہ ایمانِ کامل کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی اور خالص محبت ہو اور اس محبّت پہ تمام محبّتیں قربان ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی ہی تمام محبتوں اور چاہتوں کا مرکز و محور ہو سب محبّتیں اور چاہتیں اللہ تعالیٰ کی محبت و چاہت کے تابع ہوں۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی محبّت کے بعد سب سے زیادہ محبت انسانِ مومن کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے ہو گی۔ اس کے بعد سب سے زیادہ محبّت اس مشن سے ہو گی جسے لے کر آپ اس دنیا میں تشریف لاتے ہیں اور پھر ان لوگوں سے ہو گی جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کے مشن پر مر مٹنے کو تیار ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَلَدِهِ وَوَالِدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ - (صحیح بخاری و مسلم - بخاری، ایمان، باب: ۸)

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مجھے اپنے

أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا - (المائدہ: ۷۶)

بیٹے اپنے باپ حتیٰ کہ تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ٹھہرا لے۔"

صحیح بخاری میں ایک روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کی ذاتِ گرامی مجھے اپنی جان کے علاوہ دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے تو آپؐ نے ارشاد فرمایا:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْکَ مِنْ نَفْسِکَ۔

"مجھ کو اس ذاتِ گرامی کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ جب تک میں تمہیں اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں اس وقت تک تم صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتے۔"

تو اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بولے:

فَاِنَّکَ الْاٰنَ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ۔

"اب آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔"

تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: الآنَ یاعمر (صحیح بخاری)

"اے عمر، اب بات بنی۔"

لَا مُتَصَرِّفَ فِی الْعَالَمِ اِلَّا اللّٰہ (اللہ کے سوا کائنات میں کوئی صاحبِ تصرف و اختیار نہیں)

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

قُلْ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ (النساء: ۷۸)

"کہو، سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔"

قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔ (یونس: ۳۱)

"ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟"

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا۔ (المائدہ: ۷۶)

"کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرتے ہو جو نہ تمہارے لیے نقصان کا اختیار رکھتا ہے نہ نفع کا؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں مُشرکینِ عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ دُنیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی بھی متصرفِ حقیقی نہیں ہے یعنی تمام اُمور کا اصل اختیار اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ قرآن مجید ان کے اس عقیدے پر یوں شہادت دیتا ہے:

قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ، قُلْ فَأَنّٰى تُسْحَرُونَ۔ (المؤمنون: ۸۸-۸۹)

"کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابل کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ فوراً کہہ دیں گے کہ ایسی بادشاہی تو خدا ہی کی ہے۔ تو کہو کہ پھر تم پر جادو کہاں سے پڑ جاتا ہے؟"

حق یہی ہے کہ تمام چیزوں کو پیدا کرنا اور تمام معاملات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھنا اللہ تعالیٰ کا ہی کام ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جس طرح سے چاہتا ہے اس کو چلاتا ہے اور جہاں جس کو چاہتا ہے نفع اور ضرر پہنچاتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ (الاعراف: ۵۴)

"خبردار رہو! اُسی کی خلق ہے اور اُسی کا امر ہے۔"

وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهٖ يُصِيبُ بِهٖ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ۔ (یونس: ۱۰۷)

"اگر خدا تم کو کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اس کا کوئی دُور کرنے والا نہیں اور اگر تم سے بھلائی کرنا چاہے تو اس کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں وہ اپنے بندوں سے جسے

چاہتا ہے فائدہ پہنچاتا ہے اور بخشنے والا مہربان ہے۔"

ترمذی شریف میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كُنْتُ خَلْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ يَا غُلَامُ إِنِّي أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَى أَنْ يَنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ وَإِنِ اجْتَمَعُوا عَلَى أَنْ يَضُرُّوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ۔" (ترمذی: قیامہ: ۵۹)

"ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ میں ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تھا تو آپ نے فرمایا اے لڑکے میں تجھے کچھ باتیں سمجھاتا ہوں انہیں اچھی طرح سے پلے باندھ لینا اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت فرمائے گا۔ انہیں یاد رکھنا اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ اپنے سامنے پائے گا۔ باتیں یہ ہیں کہ اگر کبھی سوال کرنا ہو تو اللہ تعالیٰ سے ہی سوال کرنا اور اگر کبھی کسی سے مدد مانگنی ہو تو اللہ تعالیٰ سے ہی مدد مانگ لینا۔ اور یہ بات اچھی طرح سے جان لے اسے بیٹے کہ دنیا کے لوگ اگر سارے مل جائیں اور تجھے کسی معاملے میں کچھ نفع پہنچانا چاہیں تو ہرگز نفع نہیں پہنچا سکیں گے ہاں مگر اتنا جتنا کہ اللہ نے تیرے لیے لکھ دیا۔ اور اگر دنیا کے لوگ مل کر کسی معاملے میں تجھے ضرر پہنچانا چاہیں تو کچھ بھی ضرر نہیں پہنچا سکیں گے ہاں مگر اتنا جتنا کہ اللہ نے پہلے سے تیرے لیے لکھ دیا، قلم اٹھا لیے گئے اور ورق ہلتے تقدیر سوکھ چکے۔

ایک غلط فہمی جس میں اکثر اہلِ علم بھی مبتلا ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں غیروں کو بھی شریک کر دیتے ہیں۔ حالانکہ صرف وہی کچھ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ فَقَالَ أَجَعَلْتَنِي لِلّٰهِ نِدًّا مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ۔ (ابوداؤد، ابن کثیر)

"ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یوں کہا" جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کیا تم نے مجھے خدا کا ہمسر اور مقابل ٹھہرا دیا ہے دیوں کہا کرو" جو تنہا خدا چاہے"

تو ظاہر ہوا کہ مشیت اور تصرف صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہے اور کسی کے پاس نہیں ۔ لَا مُتَصَرِّفَ فِي الْعَالَمِ اِلَّا اللّٰهُ ۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں روایت ہے کہ جب ابوطالب کی وفات کے آثار دکھائی دیتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے ۔ اس وقت ابوجہل اور عبداللہ بن اُمیّہ بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے ۔ آپ نے فرمایا چچا جان کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لو میں آپ کے لیے یہی کلمہ اللہ تعالیٰ کے حضور بطور دلیل پیش کروں گا ۔ ابوجہل اور عبداللہ بن ابو امیہ بولے کیا عبد المطلب کے مذہب کو چھوڑ دو گے ؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار کلمہ شہادت کی طرف بلاتے رہے اور وہ دونوں ابوطالب کو اپنے آبائی مذہب پہ قائم رہنے پر اکساتے رہے ۔ آخر کار حضورؐ کے چچا کی آخری بات یہ تھی کہ وہ عبد المطلب کے دین پہ ہی قائم رہیں گے ۔ اور انہوں نے لا الٰہ الا اللہ کے اقرار سے انکار کر دیا ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تک مجھے روک نہ لیا گیا میں تمہارے لیے مغفرت کی دعا کرتا رہوں گا ۔

اللہ تعالیٰ نے ابوطالب کے بارے میں ہی یہ آیت نازل فرمائی :

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۔ (القصص : ۵۶)

"اے نبی ، تم جسے چاہو ہدایت نہیں دے سکتے ہو اور ہاں جسے اللہ چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے ۔ اور وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں "

یہی بات قرآن مجید میں ہے :۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۔ (البقرہ : ۲۷۲)

"اے نبی ان کو ہدایت پر لانا آپ کا کام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے

ہدایت عطا فرما دیتا ہے۔"

اب یہاں پہ ایک لمحہ کے لیے ان لوگوں کے عقیدے پر بھی غور کر لیجیے جو اولیاء اللہ اور مشائخ پر پورا پورا الیقین رکھتے ہیں ۔ سمجھتے ہیں کہ ان کی نظر کرم جس پر پڑ جائے ان کا بیڑا پار ہو جاتا ہے ۔ وہ جس چور اور ڈاکو کو چاہے ایک نظر ڈالے اور فوراً اس کو ولی اللہ بنا کر رکھ دیا ۔ بس ادھر ان صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تو جنت کی کنجی ان کے ہاتھ میں آگئی۔

جان لیجیے کہ ہدایت دینے والا صرف اللہ ہے اور وہ کسی شخص کو اس کی طلبِ صادق کے بغیر ہدایت عطا نہیں فرمایا کرتا ۔ اگر ایسا ہوتا تو ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کو ضرور بخش دیتے ۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابوطالب کو ضرور کلمۂ طیبہ کے اقرار تک لے آتے ۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنے بیٹے کو کفر کے عالم میں مرتے دیکھ کر تڑپتے نہ رہتے حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کافرہ نہ ہوتی ۔ اگر طلبِ صادق ہو تو ہزاروں میلوں کا سفر کر کے سلمان فارسی منزلِ مراد تک پہنچ سکتا ہے اور اگر طلبِ صادق نہ ہو تو ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے سیّد الاوّلین و آخرین کا چچا بھی ایمان سے محروم رہ سکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے صرف اللہ تعالیٰ کی مرضی ، مشیت اور تصرّف سے ہوتا ہے ۔ لَا مُتَصَرِّفَ فِي الْعَالَمِ إِلَّا اللّٰهُ ۔

وہ لوگ جو اولیاء اللہ اور اصحابِ قبور کے تصرّفات کے قائل ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان لوگوں کو دنیا کے انتظام و انصرام میں عمل دخل حاصل ہے ایک بالکل بے اصل بات کہتے ہیں قرآن مجید میں احادیثِ شریفہ میں اس عقیدہ کی واضح طور پر نفی موجود ہے ۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

إِذَا مَاتَ ابْنُ اٰدَمَ انْقَطَعَ عَمَلُهٗ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ :

وہ انسان جب مرجاتا ہے تو اس کے تمام اعمال منقطع ہو جاتے ہیں سوائے تین قسم کے کاموں کے جن کا اجر جاری رہتا ہے :

وہ تین عمل یہ ہیں کہ نیک اور صالح اولاد چھوڑ جاتے جو نیکیاں کرتی رہے اور ان نیکیوں کا اجر والد کو پہنچتا رہے۔ یا کوئی ایسی علمی خدمات چھوڑ جاتے جس سے کہ لوگ اس کے مرنے کے بعد استفادہ کرتے رہیں یا کوئی ایسی عمارتیں، مساجد یا اس قسم کا اور صدقہ جاریہ چھوڑ جاتے جس سے لوگ بعد میں فائدہ اٹھاتے رہیں اور اس کو اجر پہنچتا رہے۔ ان تین قسم کے اعمال کے علاوہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اموات کے لیے باقی اموال کی نفی فرما دی ہے۔"

اب ظاہر ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قبروں میں اولیاء اللہ لوگوں کی حاجات پوری کرتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے بالکل متناقض اور متضاد ہے۔ انبیاء، اولیاء خواہ زندہ ہوں، یا وفات پا چکے ہوں ان سے کسی حالت میں بھی دعا مانگنا یا ان کو حاجت پوری کرنے والے یا مشکل کشا سمجھنا قرآن سمجھنا قرآن مجید کے پیش کردہ عقیدے کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن مجید میں ہے :-

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ - اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ - (فاطر: ۱۳-۱۴)

وہ اسے چھوڑ کر جن دوسروں کو تم پکارتے ہو وہ ایک پر کاہ کے مالک بھی نہیں ہیں انہیں پکارو تو وہ تمہاری دعائیں سن نہیں سکتے اور سن لیں تو ان کا تمہیں کوئی جواب نہیں دے سکتے، اور قیامت کے روز وہ تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے۔ حقیقت حال کی ایسی صحیح خبر تمہیں ایک خبردار کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔"

سادہ لوح انسان سمجھتا ہے کہ جب اضطرار اور تکلیف کے عالم میں ہم اہل قبور کو پکارتے ہیں تو وہ ہماری فریاد رسی کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کی بالکل نفی فرماتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ

أَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ - (النمل: ۶۲)

"کون ہے جو بے قرار کی دعا کو سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارے اور کون اس کی تکلیف کو رفع کرتا ہے اور کون ہے جو تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خدا بھی کام کرنے والا ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو"

قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُم مِّن ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً لَّئِنْ أَنجَانَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ - قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيكُم مِّنْهَا وَمِن كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنتُمْ تُشْرِكُونَ" (الانعام: ۶۳-۶۴)

"اے محمد ان سے پوچھو صحرا اور سمندروں کی تاریکیوں میں کون تمہیں خطرات سے بچاتا ہے۔ کون ہے جس سے تم گڑگڑا گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعائیں مانگتے ہو۔ کس سے کہتے ہو اگر اس بلا سے تم نے ہم کو بچا لیا تو ہم ضرور شکر گزار رہوں گے۔ کہو اللہ تمہیں اس سے اور ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے پھر تم دوسروں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہو"

مشرکینِ عرب کا عقیدہ

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ قرآنِ مجید کی یہ دونوں اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ مشرکینِ عرب یہ علم اور عقیدہ رکھتے تھے کہ مجبوری اور مصیبت کے عالم میں صرف اللہ تعالیٰ ہی انسان کی تکلیف رفع فرماتا ہے۔ چنانچہ ان آیات میں جو اصل بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جب انتہائی مشکل اور سنگین حالات میں تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھکتے ہو تو پھر عام حالات میں دوسرا خدا اور معبود بنانے کی تم کو کیا ضرورت پیش آگئی ہے؟

ایمان داری کی بات ہے کہ وہ مشرکین جن سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ فرمائی ان کا عقیدہ اس دور کے سادہ لوح مسلمانوں سے اس اعتبار سے بہت بہتر ہے کہ وہ کم از کم اضطرار مجبوری اور مصیبت کے عالم میں تو صرف اللہ تعالیٰ کو پکارتے تھے اور غیروں کو چھوڑ دیتے تھے۔ لیکن اس دور

کے بے سمجھ لوگ مشکل کیا اور آسانی کیا، راحت کیا اور غم کیا ہر حال میں غیروں کو پکارتے ہیں اور مستقل وظیفہ بنایا ہوا ہے "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ" اور "المدد یا غوث الاعظم" اس قسم کی بے شمار خرافات ہیں جو اولیاء اللہ اور موحدین کے نام سے مشہور ہوگئی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہی وظیفہ اگر اس دور کے موحدِ اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے کیا جاتا تو وہ جوتوں سے خبر لیتے۔

قرآن مجید کے طرز استدلال پر غور فرمایئے یعنی

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ (النمل: ۶۲)

"وہ کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے۔"

یہ اسلوب استفہام اقراری کا ہے اور اہل علم جانتے ہیں کہ استفہام اقراری اس صورت میں کیا جاتا ہے جبکہ متکلم اور مخاطب دونوں اس بات پہ متفق ہوں کہ ہاں یہی ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ سوالیہ انداز کہ کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارے؟ اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے؟ اس بات پہ دلالت کرتا ہے کہ اس دور کے مشرکین اس بات پر عقیدہ رکھتے تھے کہ صرف اللہ ہی ہے جو بیقرار کی دعا سنتا ہے، اور صرف اللہ ہی ہے جو کہ لوگوں کی تکلیف رفع کر سکتا ہے۔
حدیث شریف میں ہے:

کَانَ فِیْ زَمَنِ النَّبِیِّ مُنَافِقٌ یُؤْذِی الْمُؤْمِنِیْنَ فَقَالَ بَعْضُھُمْ: قُوْمُوْا بِنَا نَسْتَغِیْثُ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ ھٰذَا الْمُنَافِقِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّہٗ لَا یُسْتَغَاثُ بِیْ وَاِنَّمَا یُسْتَغَاثُ بِاللّٰہِ۔

(رواہ الطبرانی باسنادہ)

"صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو ایک منافق بہت تکلیف دیا کرتا تھا چنانچہ چند صحابہ نے یہ مشورہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چل کر اس منافق سے گلو خلاصی کے لیے استغاثہ کریں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو مجھ سے استغاثہ

نہیں کیا جا سکتا بلکہ استغاثہ، فریاد رسی، حاجت طلبی اور اس کے لیے دعائیں صرف اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کی جا سکتی ہیں۔ کسی بندے کے سامنے خواہ وہ نبی آخر الزمان ہی کیوں نہ ہو پیش نہیں کی جا سکتیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس سے یہ کہلوا دیا:۔

قُلْ لَآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (الاعراف: ۱۸۸)

"اے محمد ان سے کہہ دو کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے۔"

قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا۔ (الجن: ۲۱)

"کہو میں تم لوگوں کے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا۔"

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے لیے خود اپنی زندگی میں نہ نفع و نقصان کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ بھلائی اور شر کا تو عام انسانوں کی کیا حیثیت ہے۔

لَا مَرْجُوَّ اِلَّا اللّٰهُ [اللہ کے سوا کوئی بھی اُمیدوں کا مرکز نہیں]

جب یہ بات طے ہوتی کہ اللہ کے سوا دنیا میں کسی کا بھی تصرّف نہیں۔ مشیت و تصرف، قدرت و اختیار سب اسی کو حاصل ہے۔ نفع و ضرر اسی کے ہاتھ میں ہے۔ سب کی حاجتیں صرف وہی پوری کرتا ہے تو یہ بات آپ سے آپ معلوم ہو جاتی چاہیے کہ تمام امیدیں صرف اللہ سے ہی وابستہ رکھنی چاہییں اور صرف اسی پہ بھروسہ رکھنا چاہیے۔ اللہ کے سوا کوئی بھی امید و توکّل کا حقدار نہیں ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سے ایک دعا ان الفاظ سے شروع ہوتی تھی:

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَجَائِيْ (اے اللہ تو ہی میری امیدوں کا سہارا ہے) اور یوں بھی دُعا فرماتے تھے:۔

اَللّٰھُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُوْ (اے اللہ میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ۔ (البقرہ: ۲۱۸)

"وہ لوگ جو ایمان لاتے جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔"

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَمَنْ كَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۔ (الکہف: ۱۱۰)

"وہ شخص جو اپنے پروردگار سے ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک اعمال کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔"

جب نفع ونقصان کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے تو بندے کو سوائے خدا کے اور کسی پہ بھروسہ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ۔ (الفرقان: ۵۸)

"اُس ذات پہ بھروسہ کر جو زندہ ہے اور جسے موت نہیں آتی۔"

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔ (توبہ: ۱۲۹)

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِیْلًا (المزمل: ۹)

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ (المائدہ: ۲۳)

اس آیت کی شرح میں امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے توکل کو ایمان کی شرط قرار دیا ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ جس دل میں توکّل نہ ہو وہاں ایمان ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَقَالَ مُوسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ۔

(یونس: ۸۴)

"موسیٰ علیہ السّلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم اگر تم فی الواقع اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر بھروسہ رکھو اگر تم مسلمان ہو"

اس آیتِ کریمہ میں توکّل کو اسلام و ایمان کے موجود ہونے کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ جس شخص کے دل میں ایمان قوی ہو گا اس کا اللہ تعالیٰ پر توکّل بھی مضبوط ہو گا۔ اور اگر ایمان کمزور ہو گا تو اللہ تعالیٰ پہ بھروسہ بھی اسی حد تک کمزور ہو گا۔ بالکل اسی طرح سے جس شخص کا اللہ تعالیٰ پہ بھروسہ کمزور ہو گا اس کا ایمان بھی اسی نسبت سے کمزور ہو گا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کبھی تو توکّل اور عبادت کو ایک جگہ بیان فرمایا ہے اور کبھی توکّل اور ایمان کو، کبھی توکّل اور تقویٰ کو، کبھی توکّل اور اسلام کو اور کبھی توکّل اور ہدایت کو۔

چنانچہ معلوم ہوا کہ ایمان اور احسان کے تمام مقامات میں توکّل علی اللہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اور یہ کہ اسلام کے تمام اعمال میں توکّل کو وہی درجہ اور وہی مقام حاصل ہے جو انسانی جسم میں سر کو ہے۔ جس طرح سر کے بغیر بدن قائم نہیں رہ سکتا اسی طرح سے ایمان اور اس کے مقامات اور اعمال اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیے بغیر قائم نہیں رہ سکتے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ۔ (الطلاق: ۳)

"جو اللہ تعالیٰ پہ بھروسہ کرے اللہ تعالیٰ اسے کافی ہو جاتے ہیں"

نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا:

لَوْ اَنَّكُمْ تَوَكَّلْتُمْ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ تَغْدُوْ خِمَاصًا

وَتَرُوْحُ بِطَانًا۔ (رواہ احمد وابن ماجہ)

"اگر تم اللہ تعالیٰ پر اس طرح بھروسہ کرو جس طرح کہ کرنا چاہیے تو تمہیں وہ اس طرح سے رزق عطا فرمائے جس طرح سے وہ پرندوں کو رزق عطا فرماتا ہے کہ صبح کے وقت خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو جب آتے ہیں تو ان کے پیٹ بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔"

لَا مَخُوْفَ إِلَّا اللہُ [اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ڈرنے کے لائق نہیں]

جب یہ معلوم ہوگیا اور ہم اس بات پہ دل ہی دل میں ایمان لے آتے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کائنات میں کسی کا تصرُّف نہیں نہ کسی کا اختیار ہے نہ کسی کی مشیت و مرضی چلتی ہے اور کوئی اللہ کے سوا نفع و نقصان کا مالک نہیں تو پھر اس بات کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہی کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے خوف وخشیت رکھیں۔ ارشادِ باری ہے۔

وَإِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ۔ (البقرۃ: ۴۰)

"اور تم صرف مجھی سے ڈرا کرو۔"

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ۔ (المائدہ: ۴۴)

"تم لوگوں سے مت ڈرا کرو صرف مجھ سے ڈرا کرو۔"

إِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (آلِ عمران: ۱۷۵)

"یہ تو دراصل شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈراتا رہتا ہے۔ چنانچہ تم انسانوں سے نہ ڈرا کرو، مجھ سے ہی ڈرا کرو اگر تم حقیقت میں صاحبِ ایمان ہو۔"

خوف کی دراصل تین قسمیں ہیں:

۱۔ خوفِ طبیعی

مثلاً یہ کہ انسان کسی دھماکے سے سانپ سے یا جنگلی درندے سے یا سامنے کھڑے ہوئے کسی دشمن سے ڈر جاتا ہے۔ یا کوئی بہت بڑی غلطی کرنے کے بعد اسے سزا کا ڈر ہوتا ہے۔ یہی کیفیت سیدنا موسیٰ علیہ السّلام کی تھی، جب انہوں نے ایک قبطی کو قتل کر دیا اور انہیں سزا کا ڈر لاحق ہوا۔ قرآن مجید میں ہے :

فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ ۔ (القصص : ۲۱)

"وہ ڈرتے ہوئے اور سہمے ہوئے نکل کھڑے ہوئے۔"

یہ ایک طبعی خوف ہے اور اسلام میں مذموم نہیں ہے۔ اور نہ یہ فی الواقع توحید کی ضد ہے۔

۲۔ پوشیدہ غیر طبعی خوف

مثلاً یہ کہ انسان غیر اللہ سے اطلاقاً ڈرے یعنی کسی بُت یا طاغوت یا صاحبِ قبر سے یوں ڈرے کہ اگر اس کی فلاں قسم کی عبادت نہ کی گئی تو فلاں نوعیت کا نقصان پہنچ جائے گا۔ حضرت ہودؑ علیہ السّلام سے قومِ ہودؑ نے اسی قسم کے خوف کا ذکر کیا تھا۔

إِن نَّقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ قَالَ إِنِّي أُشْهِدُ اللَّهَ وَاشْهَدُوا أَنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ مِن دُونِهِ فَكِيدُونِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنظِرُونِ ۔

(ہود ۔ ۵۴ ۔ ۵۵)

"ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ تیرے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے۔ ہودؑ نے کہا میں اللہ کی شہادت پیش کرتا ہوں اور تم گواہ رہو کہ یہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو تم نے خدائی میں شریک ٹھہرا رکھا ہے اس سے میں بیزار ہوں۔ تم سب کے سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کسر نہ اٹھا رکھو اور مجھے ذرا مہلت نہ دو۔"

ایک اور جگہ یوں ارشاد ہوا :

وَيُخَوِّفُونَكَ بِالَّذِينَ مِن دُونِهِ (الزمر : ۳۶)

"یہ لوگ اس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں۔"

تو معلوم ہوا کہ طاغوت اور ان کے پجاری اللہ کے سوا غیروں سے مختلف طریقوں سے ڈراتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں یہ بیماری پائی جاتی ہے کہ اگر فلاں قبر پر چڑھاوا نہ چڑھایا گیا تو فلاں تکلیف ہوگی۔ اور یہ تو بہت ہی عام ہے کہ اگر چاند کی گیارہ تاریخ کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ختم نہ دیا گیا یعنی گیارھویں شریف نہ منائی گئی تو گائیں بھینسیں مر جائیں گی یہ وہ پوشیدہ اور دل میں چھپا ہوا خوف ہے جو اللہ کی بجائے غیر اللہ سے لوگوں کے دلوں میں موجود ہوتا ہے اور یہ عین شرک ہے۔ اور توحید کے منافی ہے۔

۳۔ خوف کی تیسری قسم یہ بھی ہے کہ انسان اللہ کی بجائے لوگوں سے ڈرے اور اس ڈر کی وجہ سے بعض ایسے اعمال سے ڈرے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ضروری قرار دیا ہے۔ مثلاً سامنے کفّار کی کثرت دیکھ کے جہاد سے پیٹھ پھیر جائے۔

قرآن مجید میں ہے:

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ۔ (آلِ عمران: ۱۷۳)

"اور وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوتی ہیں ان سے ڈرو تو یہ سُن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔"

حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندے سے پوچھے گا کہ:

مَا مَنَعَكَ اَنْ تَقُوْلَ فِیْهِ فَیَقُوْلُ رَبِّیْ خَشِیْتُ النَّاسَ فَاَنَا اَحَقُّ اَنْ تُخْشٰی۔

(مُسند احمد بن حنبل، جلد: ۳، ص: ۴۸)۔

"جب تم نے بُرائی کو دیکھا تو اس کو بدلنے کی کوشش کیوں نہ کی؟ بندہ جواباً کہے گا کہ اے میرے پروردگار لوگوں کے ڈر کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے گا کہ میں ہی اس کا مستحق تھا کہ تو مجھ سے ڈرتا۔"

تو پتہ چلا کہ خوف صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہونا چاہیے۔ اور طبعی خوف کے علاوہ اگر کسی طاغوت کا چھپا ہوا خوف دل میں موجود ہو یا لوگوں کے ڈر کی وجہ سے ایک مسلمان جہاد سے اور واجباتِ دین سے کنی کترانے لگے تو یہ توحید کے منافی ہے۔

چنانچہ خوف کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر لینا حدِ ایمان کی شرائط میں سے ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ الْتَمَسَ رِضَى اللّٰهِ بِسَخَطِ النَّاسِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَاَرْضَى عَنْهُ النَّاسَ وَمَنِ الْتَمَسَ رِضَى النَّاسِ بِسَخَطِ اللّٰهِ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَسْخَطَ عَلَيْهِ النَّاسَ (رواہ ابن حبان فی صحیحہ)۔

" ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص لوگوں کی ناراضگی مول لے کر اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا چاہتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ خود بھی راضی ہو جاتے ہیں اور لوگوں کو بھی اس پر راضی کر دیتے ہیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے لوگوں کی رضا مندی کا طالب ہوتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ خود بھی ناراض ہو جاتے ہیں اور لوگوں کو بھی اس پر ناراض کر دیتے ہیں۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ام المؤمنین سیدہ عائشہؓ سے نصیحت کی درخواست کی تو آپ نے مندرجہ ذیل جواب تحریر فرمایا:۔

سَلَامُ اللّٰهِ عَلَيْكَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنِ الْتَمَسَ رِضَى اللّٰهِ بِسَخَطِ النَّاسِ كَفَاهُ اللّٰهُ مُؤْنَةَ النَّاسِ وَمَنِ الْتَمَسَ رِضَى النَّاسِ بِسَخَطِ اللّٰهِ وَكَّلَهُ اللّٰهُ اِلَى النَّاسِ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ۔

(رواہ ابو نعیم فی الحلیہ) [۱۶: ص ۱۰۸۴]

"تم پر اللہ تعالیٰ کی سلامتی ہو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ جو شخص لوگوں کی ناراضگی مول لے کر اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے درپے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو لوگوں کے ہی سپرد کر دیتا ہے۔" (۱۶ : ص ۱۰۸۴)

علامہ ابن قیمؒ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خوف دل کی عبادت ہے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی خالص رہنی چاہیے۔ وہ اعمال جن کا صرف دل سے ہی تعلق ہے مندرجہ ذیل ہیں:

"عاجزی، رجوع، محبت، توکّل اور امید" یہ سارے کے سارے اعمال اللہ تعالیٰ کے لیے ہی مخصوص ہونے چاہئیں۔ جب انسان صرف اللہ تعالیٰ سے ہی ڈرتا ہے اور غیر اللہ سے ہر قسم کا خوف اس کے دل سے نکل جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو مقامِ ولایت نصیب فرما دیتے ہیں جس کے بارے میں ارشاد ہے۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (یونس: ۶۲)

"جان رکھو کہ اللہ کے دوستوں کو نہ تو کسی سے ڈر ہوتا ہے اور نہ کسی چیز کا غم"

کیوں نہ ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کے لیے کافی نہیں ہے تو اور پھر کون کافی ہوگا؟ یہی بات اللہ تعالیٰ خود یوں استفہام اقراری کے انداز میں ارشاد فرماتے ہیں:

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (الزمر: ۳۶)

"کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟"

تو بندہ جب خوف و امید اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر لیتا ہے تو اللہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے اور اس کے دل سے ہر قسم کا خوف و حزن کلیتہً نکال دیتا ہے۔

باب ۳۷

وسیلہ اور توسّل

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی معبود ہے نہ محبوب، نہ متصرّف اور نہ ایسی کوئی ہستی جس سے کہ امید و خوف ہو سکتا ہو تو پھر کوئی بھی ایسی ہستی باقی نہ رہی جو بندے اور رب کے درمیان واسطہ کا درجہ رکھتی ہو، یا ایسا لازمی وسیلہ ہو جس کے ذریعے کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکے۔

ہاں! بندہ اللہ کے ہاں اپنے نیک اعمال کے ذریعے سے قرب حاصل کر سکتا ہے اور یہی قرب کا بہترین وسیلہ ہے یہی بات اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمائی :-

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ (المائدۃ : ۳۵)

"اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو اور اس کے ہاں قرب حاصل کرنے کے لیے کوئی وسیلہ اختیار کرو۔"

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا - (بنی اسرائیل : ۵۷)

"جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے رب کے حضور رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ تلاش کر رہے ہیں کہ کون اس سے قریب تر ہو جائے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں حقیقت یہ ہے کہ تیرے رب کا عذاب ہے ہی ڈرنے کے لائق۔"

قتادہ اس آیت کی شرح میں کہتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرو اس کی اطاعت اور

ایسے اعمال کے ذریعے جن سے وہ راضی ہو جائے"۔

اس سلسلے میں ایک مشہور قصہ ہے جو صحیحین یعنی بخاری شریف اور مسلم شریف میں وارد ہوا ہے اور یہ قصہ تین آدمیوں کا ہے جو کہ سفر کے دوران ایک غار میں پھنس گئے تھے اور انہوں نے اپنے اپنے نیک اعمال کا وسیلہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی مشکل آسان فرمائی۔ مکمل حدیث نقل کی جاتی ہے :-

"ابو عبد الرحمٰن عبد اللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا، آپ فرما رہے تھے کہ تم سے پہلے کے زمانے میں تین شخص کہیں سفر پہ جا رہے تھے کہ رات گزارنے کے لیے انہوں نے ایک غار میں پناہ لی۔ ایک چٹان لڑھک کر غار کے اوپر آگئی اور غار کا منہ بند کر دیا۔ ان سب نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس چٹان سے اس وقت تک نجات نہیں دیگا جب تک کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اپنے نیک اعمال کو بطور وسیلہ پیش کر کے دُعا نہ کریں۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص نے کہا: "اے اللہ میرے والدین تھے اور میں شام کے وقت دُودھ پلاتے ہُوتے انہی سے پہل کیا کرتا تھا۔ اپنا کنبہ یا مال کسی کو بھی ان پر ترجیح نہیں دیا کرتا تھا۔ ایک دن ایسا ہُوا کہ میں لکڑیاں کاٹنے کے لیے گیا۔ مجھے دیر ہو گئی، آیا تو وہ سو چکے تھے۔ میں نے ان کے لیے ان کا دودھ دوہا۔ آیا تو انہیں سویا ہوا پایا مجھے یہ بات نہ پسند تھی کہ میں انہیں جگاؤں اور اسی طرح سے یہ بات بھی ناپسند تھی کہ ان سے پہلے میں اور کسی کو دُودھ پلاؤں چنانچہ میں ان کے انتظار میں کھڑا رہا اور دُودھ کا پیالہ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں ان کے جاگنے کا انتظار کرتا رہا۔ بچے میرے پاؤں میں لوٹ پوٹ ہو رہے تھے میں کھڑا رہا یہاں تک کہ صبح ہو گئی جب وہ جاگے تو میں نے ان کو دودھ پلایا۔ اے اللہ اگر یہ عمل میں نے تیری رضا کے لیے کیا تھا تو آج تو ہم سے یہ مشکل دُور کر دے اور ہمیں اس چٹان سے نجات دے"۔ چنانچہ چٹان کا کچھ حصہ ہٹ گیا مگر اتنا نہیں کہ وہ باہر نکل سکیں۔ دوسرے نے کہا: "اے اللہ میری ایک چچا زاد بہن تھی میں اس سے

سب سے زیادہ محبت کیا کرتا تھا، اور ایک روایت میں یوں ہے کہ میں اس سے ایسی ہی محبت کیا کرتا تھا۔ جیسے کہ مرد عورتوں سے کرتے ہیں اور میں چاہتا تھا کہ اس سے متمتع ہوں۔ لیکن اس خاتون نے مجھے قریب نہ آنے دیا۔ یہاں تک کہ کئی سال گزر گئے۔ ایک دن وہ آئی۔ میں نے اسے ایک سو بیس دینار دیئے اس شرط پر کہ میں اس کے ساتھ خلوت حاصل کر سکوں چنانچہ اس نے مجھے اس کی اجازت دے دی جب مجھے اس خاتون پر قدرت نصیب ہو گئی اور ایک روایت میں یوں ہے کہ جب میں اس کے دونوں پاؤں کے درمیان بیٹھ گیا تو اس نے یوں کہا کہ اللہ سے ڈر اور اس مہر کو بغیر حق کے نہ توڑ۔ چنانچہ میں اس سے ہٹ گیا حالانکہ وہ لوگوں میں مجھے سب سے زیادہ محبوب تھی۔ میں نے جو سونا اُسے دیا تھا وہ بھی واپس نہ لیا۔ اے اللہ اگر میں نے یہ کام تیری رضا کے لیے کیا تو اس تکلیف سے تو ہمیں بچا لے جس میں ہم پھنسے ہوئے ہیں۔" چنانچہ وہ چٹان ذرا سی اور ہٹ گئی، مگر اس قدر نہیں کہ وہ سب کے سب باہر نکل سکیں۔ تیسرے شخص نے کہا: "اے اللہ میں نے کچھ مزدور رکھے تھے ان میں سے ہر شخص کو مزدوری دے دی سوائے ایک شخص کے جو کہ چلا گیا تھا۔ میں نے اس کی مزدوری کو تجارت پر لگا دیا، یہاں تک کہ بہت سا مال اور مویشی بن گئے۔ کچھ عرصے کے بعد وہ شخص میرے پاس آیا اور کہا کہ اے فلاں شخص میری مزدوری دے دے۔ میں نے کہا کہ یہ اونٹ، گائیں، بکریاں اور غلام وغیرہ جو تم دیکھ رہے ہو یہ سب تمہاری مزدوری ہے۔ اس نے کہا "اے اللہ کے بندے مجھ سے مذاق مت کر۔" میں نے کہا "نہیں میں مذاق نہیں کرتا ہوں، یہ تم لے لو۔ چنانچہ اس نے وہ سب لے لیے اور وہ چلا گیا اور کچھ بھی ان میں سے نہ چھوڑا۔" اے اللہ اگر میں نے یہ کام تیری رضا کے لیے کیا تھا تو آج یہ مشکل دور فرما دے جس میں ہم پھنسے ہوئے ہیں۔" چنانچہ وہ چٹان بالکل ہٹ گئی اور وہ لوگ وہاں سے نکل کے چلے گئے۔" (متفق علیہ)

امام ابن تیمیہؒ کا فتویٰ

تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے حضور قرب حاصل کرنے اور دعا کرنے کا صحیح وسیلہ انسان کے اپنے

نیک اعمال ہیں۔ وسیلہ اور توسّل کے موضوع پر امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ میں بعض اہم عبارتیں ہیں ان میں سے چند نقل کی جاتی ہیں:۔

"جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے توسّل کرنے اور آپ کی طرف متوجہ ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں صحابہ کرام کا جو کلام وارد ہوا ہے اس سے یہی مراد ہے کہ وہ لوگ توسّل بمعنی دعا اور شفاعت کے کرتے تھے۔

متأخرین میں لفظ توسّل عام طور پر دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک قسم اور دوسرے سوال۔ یعنی بزرگوں کے نام کی قسم کھا کر اللہ سے مانگنا، یا ان کے ذریعے سے اللہ سے مانگنا اور بزرگوں سے مراد انبیاء یا صالحین ہیں یا وہ لوگ جن کے بارے میں نیکی کا اعتقاد رکھا جائے۔

در اصل توسّل سے مراد دو صحیح باتیں ہیں جن پر کہ تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اور ایک تیسری چیز بھی ہے جس کی سنت میں کوئی اصل نہیں ملتی۔

پہلے دو معنی جس پر کہ علماء کا اتفاق ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ کہ انسان اپنے ایمان اور اسلام کے ذریعے اللہ کے سامنے توسّل کرے اور اپنی اطاعت کو دعا کا وسیلہ بنالے۔

۲۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی شخصیت کا توسّل اختیار کر رہا ہے تو اس سے دعا کی درخواست کرے یا اللہ کے حضور شفاعت کی درخواست کرے۔ یہ تمام علماء کے نزدیک جائز ہیں۔ اور اس پر دلیل حضرت عمرؓ بن خطاب کا یہ قول ہے:۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا كُنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَيْكَ بِنَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَسْقِيْنَا وَاِنَّا نَتَوَسَّلُ بِعَمِّ نَبِيِّنَا فَاسْقِنَا۔ (صحیح بخاری، استسقاء، باب ۳)

"اے اللہ جب ہمیں قحط سالی ہوتی تھی تو ہم تیرے نبی کے ذریعے تجھ سے توسّل کیا کرتے تھے اور تُو بارش برسایا کرتا تھا اور اب ہم تیرے نبیؐ کے چچا کے ذریعے تیرے سامنے توسّل کرتے ہیں پس تُو ہم پر بارش برسا۔"

یہاں مراد یہی ہے کہ حضور کے چچا سے ہم دُعا کی درخواست کرتے ہیں اور ان کی شفاعت آپ کے حضور طلب کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے "وَابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ، یعنی اللہ کے حضور کوئی وسیلہ اختیار کرو" اور مراد اس سے یہی ہے کہ اللہ کی اطاعت اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کے قرب کا وسیلہ بناؤ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ - (النساء: ۸۰)

"جس نے اللہ کے رسُول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی"

توسُّل کی یہ شکل تو دین کی بنیاد ہے، اس سے کسی مسلمان نے انکار نہیں کیا۔

جہاں تک دعا کروانے یا شفاعت طلب کرنے کا تعلق ہے تو یہ توسّل کی وہ شکل ہے کہ اس میں جیسا کہ سیدنا عمرؓ نے فرمایا تھا، ہم کسی شخصیت کی ذات کو توسُّل نہیں بناتے بلکہ اس کی دعا کو ذریعہ بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کے بعد ان کے چچا سے توسُّل کیا۔ اگر توسّل حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شخصیت سے ممکن ہوتا تو حضورِ اکرم اس معاملے میں اپنے چچا حضرت عباسؓ سے زیادہ اولیٰ اور افضل تھے، انہی سے توسّل ہوتے رہنا چاہیے تھا۔ یعنی یہ بات کہ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے انتقال کے بعد صحابہ نے حضورؐ کے چچا سے توسّل کیا، اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کی وفات کے بعد آپ سے توسُّل مناسب نہیں ہے۔ ہاں آپ پر ایمان اور آپ کی اطاعت کے ذریعے ہمیشہ ہمیش کے لیے آپ سے توسُّل کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ لفظ توسّل کے تین معنی ہُوئے:

۱۔ توسّل ان معنوں میں کہ اللہ کی اطاعت کو وسیلہ ٹھہرایا جائے تو یہ تو فرض ہے اور اس کے بغیر ایمان ہی مکمل نہیں ہوتا۔

۲۔ توسُّل کی یہ نوعیت کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دُعا اور آپ کی شفاعت کو اللہ کے حضور میں وسیلہ ٹھہرایا جائے۔ یہ بات آپ کی زندگی کے دوران درست تھی (لوگ اس طرح سے کیا کرتے تھے) اور قیامت کے دن بھی لوگ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شفاعت کو اللہ کے حضور وسیلہ ٹھہرائیں گے۔

۳ - توسّل کی یہ نوعیت کہ اللہ کے سامنے کسی کی (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی) قسم کھائی جائے اور ان کی ذات کے ذریعے سے سوال کیا جائے۔ تو یہ وہ کام ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نہیں کیا کرتے تھے، نہ بارش مانگنے میں، نہ کسی اور حاجت میں، نہ آپ کی قبر کے سامنے کھڑے ہو اور نہ اس کے علاوہ کسی اور شکل میں۔ اس قسم کی کوئی دعائیں بھی ان کے ہاں مشہور و معروف نہیں تھیں جن میں کہ حضورؐ کی ذات کے ذریعے یا حضور کے نام کی قسم کھا کے اللہ کے سامنے دُعا کی جائے۔ اس قسم کی کچھ باتیں چند ضعیف، موضوع اور ناقابلِ اعتماد احادیث میں نقل کی گئی ہیں۔ یا ایسے لوگوں سے نقل کی گئی ہیں جن کا کلام حجّت نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام قدوریؒ کی رائے:-

یہی بات امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ساتھیوں نے بھی کہی ہے کہ توسّل کی یہ شکل جائز نہیں ہے اور انہوں نے اس سے روکتے ہوئے یہ دلیل دی ہے کہ اللہ سے مخلوق کے ذریعے نہیں مانگنا چاہیے اور کسی شخص کو یہ نہیں کہنا چاہیے: اَسْئَلُکَ بِحَقِّ اَنْبِیَآءِ یعنی کہ اے اللہ! میں تجھ سے تیرے انبیاء کے حق کے ذریعے سوال کرتا ہوں۔"

ابوالحسن قدوری اپنی فقہ کی عظیم کتاب شرح الکرخی کے باب الکراھۃ میں لکھتے ہیں:-

"یہ بات ابوحنیفہؒ کے بہت سے ساتھیوں نے ذکر کی ہے" (ا: ص ۱/۲۰۲)

تو یہ بات واضح ہوئی کہ کسی شخص کا یہ کہنا کہ میں فلاں کے ذریعہ مانگتا ہوں (اسئلك بكذا) تو اس میں قسم کے معنی ہو سکتے ہیں اور سبب کے معنی بھی۔

جہاں تک مخلوقات کی قسم کھانے کا تعلق ہے تو مخلوقات کی تو مخلوقات کے سامنے بھی قسم نہیں کھائی جا سکتی۔ کجا یہ کہ مخلوقات کے نام کی قسم اللہ کے سامنے کھائی جائے تو یہ بالکل جائز نہیں ہے۔

دوسرے معنی کہ اللہ کے سامنے یوں سوال کیا جائے کہ اے اللہ میں انبیاء یا ملائکہ کے حق سے جو ان کا تجھ پر ہے میں تجھ سے سوال کرتا ہوں (اَسْئَلُکَ بِحَقِّ الْاَنْبِیَآءِ اور بِحَقِّ فُلَانٍ) اس معاملے

میں کافی اختلاف ہے۔ ہم لکھ چکے کہ ابو حنیفہؒ اور ان کے ساتھیوں نے اس بات کو ناجائز قرار دیا لیکن کچھ لوگ ہیں جو اس بات کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی شخص جب یوں دعا مانگتا ہے "اَسْئَلُكَ بِحَقِّ فُلَانٍ وَفُلَانٍ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالْاَنْبِيَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ وَغَيْرِهِمْ اَوْ بِجَاهِ فُلَانٍ اَوْ بِحُرْمَةِ فُلَانٍ"۔ (اے اللہ میں فلاں کے حق کے ذریعے یا فلاں فرشتوں، انبیاء اور صالحین وغیرہ کے ذریعے یا فلاں کی جاہ کے ذریعے یا فلاں کی حرمت کے ذریعے میں تجھ سے سوال کرتا ہوں)

______ تو ایسی صورت میں ضروری ہوگا کہ جن کی جاہ یا حرمت کے ذریعہ سوال کیا جارہا ہے وہ واقعتہً اللہ کے حضور صاحبِ جاہ بھی ہوں۔ اگر ایسا ہوگا تو کوئی حرج نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں بعض شخصیتوں کی وجاہت اور حرمت ہوتی ہے۔ اور وہ جاہ اور حرمت یہ تقاضا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے، ان کی شفاعت کو اپنے ہاں قبول فرمائے۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اللہ کے ہاں کسی کی شفاعت اس کی اجازت کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔ اللہ کے ہاں کوئی بھی بغیر اجازت شفاعت نہیں کرسکتا۔ (مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (البقرہ : ۲۵۵)۔

جاہ اور حرمت کے ذریعے مانگنے کی دوسری شرط یہ ہے کہ جو شخص مانگ رہا ہے وہ ایسا ہو کہ دعا مانگنے والا اس شخصیت کا مطیع اور فرمانبردار ہو اور اس نبی یا صالح فرد کی اللہ کی راہ میں اطاعت کرنے والا ہو جس کی شفاعت طلب کر رہا ہے۔ اگر وہ اس کی اطاعت کرنے والوں میں ہی نہیں ہے تو اس سے شفاعت مانگنے کا اسے کوئی حق نہیں ہے۔

مثلاً ایک شخص حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت تو طلب کرسکتا ہے اس لیے کہ آپ اللہ کے ہاں صاحبِ وجاہت و حرمت ہیں لیکن اہم شرط یہ بھی ہے کہ اسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا پیروکار بھی ہونا چاہیے۔ اگر اسے حضور اکرمؐ کی ذات اور آپ کی سنتِ طیبہ سے کوئی نسبت نہیں ہے تو اسے شفاعت حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ایسے شخص کو حضور اکرمؐ کی

شفاعت کی اجازت اللہ کے ہاں سے نہیں ملے گی۔

اس سلسلے میں اہم بات یہی ہے کہ اللہ کے حضور شفاعت کرنے کے لیے کوئی سبب ہونا چاہیے اور وہ سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جس شخصیت کی شفاعت مانگ رہا ہے وہ شخصیت اللہ کے ہاں صاحب جاہ و منزلت ہو اور یہ شخص خود اس شخصیت کی اللہ کے راستے میں اطاعت کرنے والا ہو ورنہ شفاعت حاصل کرنے کا کوئی سببِ حقیقی موجود نہیں ہوگا اور شفاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔" (۱: ص ۲۱۰-۲۱۱)

"یہاں کوئی شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہ ایمان رکھتا ہے ان سے محبت رکھتا ہے اور ان کی اطاعت و اتباع کرتا ہے اور اس وسیلے سے وہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے کہ اے اللہ میں محمدؐ رسول اللہ پہ ایمان رکھتا ہوں، ان سے محبت رکھتا ہوں اور ان کی اطاعت و اتباع کرتا ہوں تو یہ ایک بہت ہی بڑا سبب ہوگا جو دعا کی قبولیت کا باعث ہوگا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک سبب اور وسیلے کا تعلق ہے تو یہ دعا قبول ہونے میں سب سے بڑا سبب اور سب سے بڑا وسیلہ ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات واضح فرما دی تھی کہ آخرت میں ان کی شفاعت صرف اہلِ توحید کے لیے ہوگی، اہلِ شرک کے لیے ہرگز نہیں ہوگی۔" (۱: ۱/۲۱۲)

اس موقع پر یہ بحث بھی اٹھائی جاتی ہے کہ بندوں کا اللہ پہ کوئی حق بھی ہے یا نہیں۔ بعض لوگوں کا قول یہ ہے کہ مخلوق کا خالق پہ کوئی ایسا حق نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ بنا کے اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا مانگی جا سکے۔

اس کے برعکس بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ بندوں کا اللہ تعالیٰ پر حق ہے اور یہ اللہ تعالیٰ نے خود عطا فرمایا ہے۔

ان لوگوں کا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت کو لازم فرمایا ہے اور اپنے اوپر مومن بندوں کے حق کو لازم فرمایا ہے۔ اسی طرح سے اس نے اپنی ذات پہ ظلم کو حرام فرما دیا ہے۔ یہ حق کسی مخلوق نے اللہ تعالیٰ پر لازم نہیں کیا ہے بلکہ یہ اس نے خود ہی اپنے اوپر واجب ٹھہرا لیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و حکمت اور عدل ہے جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں وارد ہے کہ اللہ تعالےٰ

ارشاد فرماتے ہیں :۔

"اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر رحمت کو لازم قرار دے دیا ہے۔ اسی طرح سے میں نے تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام قرار دے دیا ہے۔"

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔ (الانعام : ۵۴)

"تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت کو لازم قرار دے دیا ہے۔"

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (الروم : ۴۷)

"ہم پر یہ لازم تھا کہ ہم مومنین کی مدد کرتے (یعنی یہ مومنین کا ہم پر حق تھا)۔"

بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت معاذ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کرتے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا :

يَا مُعَاذُ أَتَدْرِيْ مَا حَقُّ اللهِ عَلَى الْعِبَادِ وَمَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللهِ؟ قُلْتُ اللهُ وَرَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ۔ قَالَ: حَقُّ اللهِ عَلَى الْعِبَادِ أَنْ يَّعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَحَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللهِ أَنْ لَّا يُعَذِّبَ مَنْ لَّا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا۔

"اے معاذ، تم جانتے ہو کہ اللہ کا اپنے بندوں پر کیا حق ہے؟ معاذ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی کہ "اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں"۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ "اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں"۔ پھر آپ نے فرمایا: "کیا تم جانتے ہو کہ بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے جب وہ اس کی عبادت کر رہے ہوں"۔ میں نے عرض کیا "کہ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں"۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا: کہ بندوں کا اپنے پروردگار پر یہ حق ہے کہ وہ انہیں عذاب نہ دے۔"

اس حدیث کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انبیاء اور نیک بندوں کا اللہ تعالیٰ سبحانہٗ وتعالیٰ پر حق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اوپر واجب ٹھہرا دیا اور اس کی خبر بندوں کو عطا فرما دی اور

وعدہ بھی فرما دیا“ (۱: صفحہ ۲۱۴/۱)

”بعض جاہل لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ نے یوں فرمایا: ”جب تم اللہ سے دعا کرو تو میری جاہ کے ذریعے سے ہی دعا کیا کرو اس لیے کہ اللہ کے ہاں میری جاہ اور میرا رتبہ بہت عظیم ہے“

یہ حدیث بالکل جھوٹی ہے اور اس میں کوئی ایسی قابلِ اعتماد بات نہیں ہے جسے علمائے حدیث نے اپنی کسی کتاب میں نقل کیا ہو۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وجاہت اور آپ کا رتبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تمام انبیاء کی جاہ و رتبہ سے زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سیّدنا موسیٰ کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا کہ وہ اللہ کے ہاں صاحبِ وجاہت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰی فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِیْهًا۔ (الاحزاب: ۶۹)

”اے ایمان والو ان لوگوں کی طرح مت بنو جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو ایذا پہنچائی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے قول سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بری فرمایا، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ہاں وجیہ اور صاحبِ جاہ تھے“

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے:

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ۔ (آل عمران: ۴۵)

”جب فرشتوں نے یہ کہا کہ اے مریم اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی طرف سے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے اور اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے (یعنی ان کے تشریف لانے کی بشارت ہے) اور یہ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں صاحبِ وجاہت اور مقرّبین میں سے ہوں گے“

تو جب سیّدنا موسیٰ اور سیّدنا عیسیٰ علیہ السّلام دونوں اللہ عزّوجلّ کے ہاں صاحبِ وجاہت ہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ ہستی جو کہ سیّد وُلدِ آدم ہے، صاحبِ مقامِ محمود ہے، وہ ہستی جس کی ذاتِ بابرکات اور جس کی عظمت پر تمام اوّلین اور آخرین رشک کرتے ہیں، وہ ہستی جو صاحبِ کوثر ہے، اس حوضِ مورود کی مالک ہے جس کے برتن آسمان کے ستاروں کی طرح ہوں گے اور جس کا پانی دُودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا اور جسے جو پئے گا کبھی بھی پیاسا نہیں ہوگا، ایسی ہستی کس طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں صاحبِ وجاہت نہیں ہوگی؟

حضور محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم قیامت کے دن صاحبِ شفاعت ہوں گے جبکہ آدم، نوح، ابراہیم، عیسیٰ علیہم السّلام جیسے عظیم المرتبت نبی بھی شفاعت کرتے ہوئے گھبرائیں گے۔ اس وقت حضور شفاعت فرمائیں گے، وہ صاحبِ لواء ہونگے۔ سیّدنا آدم علیہ السّلام حضور کے جھنڈے تلے ہوں گے۔

تو حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم پُوری انسانیت کے سردار و آقا ہیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ بزرگ و مکرّم ہیں۔ آپ تمام انبیاء کے اِجماع کی امامت فرمانے والے ہیں۔ چنانچہ آپ کی جاہ، آپ کی شان، منزلت، وجاہت اللہ تعالیٰ کے ہاں عظیم ہے۔

لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ مخلوق کی جاہ اللہ کے ہاں اس طرح سے نہیں ہے جس طرح کہ مخلوق کی جاہ مخلوق کے سامنے ہوتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ کوئی بھی ہو اللہ تعالیٰ کے حضور اس کی اجازت کے بغیر شفاعت نہیں کر سکتا۔" [ا: ص ۱/۳۲۰]

باب ۳۸

فضیلۃ الشہادتین

[کلمہ شہادت پر ایمان لانے کی اہمیت]

صحاح ستہ کی تمام کتابوں میں سوائے صحیح بخاری کے یہ حدیث موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا"

"اسلام یہ ہے کہ تو اس بات کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے فرستادہ ہیں۔ اور یہ کہ تو نماز قائم کرے زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے اور اگر بیت اللہ تک پہنچنا تیرے بس میں ہو تو وہاں کا حج کرے۔"

اسلام کی عمارت ان پانچ ارکان پر کھڑی ہوتی ہے۔ ان میں سے چار ارکان صرف اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہ ایمان لانے کی شہادت پر قائم ہے یعنی آخر چار ارکان پہلے رکنِ اعظم پہ استوار ہیں۔ اگر رکن اعظم یعنی کلمہ شہادت موجود نہ ہو تو بقیہ چاروں ارکان یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کوئی قیمت نہیں رکھتے بالفاظ دیگر اگر کوئی شخص کلمہ شہادت پر اقرار نہ کرے اور نماز پڑھتا رہے، روزے بھی رکھتا رہے، زکوٰۃ بھی دیتا رہے، حج کو بھی پہنچ جائے۔ اس کے کسی عمل کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔

کلمہ شہادت لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ جسے عربی میں شہادتین بھی کہا جاتا ہے، کی حیثیت اسلام

میں وہ ہے جو جسم کے اندر رُوح کی ہوتی ہے۔ نیک اعمال میں سے کوئی عمل بھی کیا جائے تو اس کی قیمت کا تناسب اس کلمہ پر ایمان کے تناسُب سے ہو گا۔ اگر اس کلمہ پر ایمان نہ ہو گا یعنی اللہ تعالےٰ کی معبودیّت اور رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت پر ایمان نہ ہو گا تو کسی عمل کی قیمت نہیں ہو گی۔ اور جس قدر ایمان بڑھتا چلا جائے گا اسی قدر اخلاص میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور اسی قدر اعمال کی قیمت اور اجر میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کفّار کے نیک اعمال کی خواہ وہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہ ہو گی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (الفرقان: ۲۳)

"اور جو کچھ بھی ان کا کیا دھرا ہے اُسے لے کر ہم غبار کی طرح اُڑا دیں گے۔"

حتیٰ کہ مسلمان بھی اگر کوئی نیک اعمال کرے اور اس کے نیک اعمال کے پس منظر میں کلمۂ شہادت کی رُوح موجود نہ ہو اور اللہ کی ذات کے ساتھ اخلاص نہ ہو اور رسُول اللہ کے ساتھ اتباع کی نسبت نہ ہو تو اس عمل کی بھی کوئی حیثیت نہ ہو گی، وہ بھی غیر مقبول ہو گا۔ چنانچہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا:۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى الدُّنْيَا يُصِيْبُهَا اَوِ امْرَاَةٍ يَّنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ۔ (متفق علیہ)

"اعمال کا تعلق نیّتوں سے ہے، جس شخص نے جو بھی نیت کی اس کو اس کی نیّت کے مطابق اجر ملے گا۔ چنانچہ وہ شخص جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسُول کے لیے ہجرت کرتا ہے تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسُول کے لیے ہو گی۔ اور کوئی شخص اگر دنیا کے لیے ہجرت کرتا ہے یا کسی عورت کے لیے جس سے وہ نکاح کر رہا ہو تو اس کی ہجرت اسی چیز کی طرف ہو گی جس کی اس نے نیت کی ہے اور جس مقصد کے لیے اس نے وطن چھوڑا ہے۔"

کلمہ شہادت فی الحقیقت دو شہادتوں پر مشتمل ہے:۔

۱۔ لا الٰہ الا اللہ، یعنی اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

۲۔ محمد رسول اللہ، کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول ہیں۔

یہ دونوں شہادتیں اپنی اپنی جگہ پر علیحدہ شہادتیں ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے ہرگز جُدا نہیں کی جا سکتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لا الٰہ الا اللہ پر ایمان ایک خاص قسم کی زندگی اور خاص طرزِ سلوک کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ خاص طرز کی زندگی کس طرح سے معلوم ہو، اس کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ حسنہ ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زندگی گزارنے کا طریقہ ہے اور آپ کی سُنّت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو احکام اور شریعتِ اسلامی عطا کر کے بھیجا۔ ان احکام اور شریعت کے مطابق حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنا لا الٰہ الا اللہ کا اصل تقاضا ہے اور محمد رسول اللہ کا یہی مطلب ہے، یعنی محمد اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں، اور یہ کہ اللہ کی اطاعت اس طرح کی جائے جس طرح سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطاعت کر کے دکھائی۔ ہم زندگی اس ڈھب سے گزاریں گے جس ڈھب سے اللہ کے حکم سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی گزار کر دکھائی۔

اسی کلمہ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کلمہ طیّبہ کا لقب عطا فرمایا ہے۔ ارشادِ گرامی ہے:۔

مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا۔ (ابراہیم: ۲۴-۲۵)

"کلمہ طیبہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین گہری جمی ہوتی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے۔"

اور یہی وہ کلمہ ہے جو مختصراً ہم یوں ادا کرتے ہیں "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ"۔ اسی کلمہ کے پڑھنے سے ہی انسان دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ جب زبان سے اس کی تصدیق کر لیتا ہے اور دل سے اس پر یقین کر لیتا ہے تو وہ مومن بن جاتا ہے۔ اور یہی کلمہ دنیا میں اس کی

کامیابی اور آخرت میں اس کی نجات کے لیے کافی ہو جاتا ہے بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ ادا کیا جائے۔

یہی وہ کلمہ ہے جس پہ ایمان اور جس کے ساتھ اخلاص انسان کو کافر سے مومن، جہنمی سے جنتی اور ناکام سے کامیاب بنا دیتا ہے۔ ہاں مطلوب تو یہی ہے کہ پوری زندگی کو اس کلمہ کے رنگ میں رنگ دے۔ اللہ کے سوا کسی کو عبادت میں شریک نہ کرے اور زندگی کا ایک ایک گوشہ محمد رسول اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں گزارے۔ اللہ کے تمام احکام پر عمل کرے اور ان تمام باتوں سے باز آجائے جن سے باز آجانے کا حکم دیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کلمہ طیبہ پر مخلصانہ ایمان ہوتے ہوئے اگر زندگی میں کچھ عملی کوتاہیاں ہو جائیں تو بھی یہ کلمہ انسان کی اخروی نجات کے لیے کافی ہے۔ اس لیے کہ دین کی اصل یہی کلمہ طیبہ ہے جو اسے ظلمت سے نور کی طرف اور حزبِ شیطان سے حزب اللہ کی طرف لے آتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَنَّ عِيْسٰى عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلٰى مَا كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْعَمَلِ۔ (رواه الشيخان)

"جو شخص یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ اکیلا ہی عبادت کے لائق ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے سیدہ مریم پہ القا فرمایا اور یہ کہ جنت بھی برحق ہے اور دوزخ بھی برحق ہے، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرما دیں گے خواہ اس کے عمل کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ (بخاری و مسلم)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ حَرَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى جَسَدَهٗ عَلَى النَّارِ (اخرجه مسلم وغیرہ)

"جو شخص اس بات کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کے جسم پر آگ کو حرام فرما دیں گے"۔

ایک اور حدیث شریف ہے:

قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ اِثْنَتَانِ مُوْجِبَتَانِ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْمُوْجِبَتَانِ ؟ قَالَ" مَنْ مَاتَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ وَمَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ (اخرجہ مسلم)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دو چیزیں ایسی ہیں جو دو چیزوں کو واجب کر دیتی ہیں۔ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ یہ دو چیزیں کن دو چیزوں کو واجب کر دیتی ہیں؟ آپ نے فرمایا "وہ شخص جو اس حالت میں مرے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرا رہا ہو تو وہ آگ میں داخل ہوگا۔ اور جو شخص اس حالت میں مرے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراتا ہو تو وہ جنت میں داخل ہوگا"۔

باب ۳۹

نواقض الشہادتین

[وہ اُمور جو ایمان کے ختم ہو جانے کا باعث ہیں]

ایک غلط فہمی لوگوں میں یہ عام غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ وہ شخص جو مسلمان کے گھر پیدا ہو گیا وہ مسلمان ہی رہے گا خواہ اس کے کچھ بھی افکار، نظریات اور عقائد کیوں نہ ہوں۔ اور اسی طرح سے جس شخص نے ایک مرتبہ منہ سے کلمۂ طیّبہ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ نکال لیا تو وہ قیامت تک مومن ہی رہے گا خواہ بعد میں اس کا دل اللہ کی ذات پر ایمان سے خالی ہو جائے اور وہ عملاً اور ذہناً و فکراً محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اتباع کو ضروری نہ سمجھے وہ مومن ہی رہے گا۔ اس کے ایمان میں کبھی نہ زیادتی ہوگی نہ کمی۔ یعنی ایک مرتبہ جو شخص دائرۂ ایمان میں داخل ہو گیا اب خواہ اس کے کچھ ہی عقائد و اعمال ہوں اور زندگی کے مختلف معاملات میں اس کے خواہ کچھ ہی نظریات ہوں اب وہ مومن ہی رہے گا، ایمان میں کوئی کمی و بیشی نہیں ہوگی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایمان مختلف اسباب کے زیر اثر زیادہ بھی ہوتا ہے اور کم بھی چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا۔ (الانفال: ۲)

"جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان کے ایمان میں وہ آیات اضافہ کر دیتی ہیں"

حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا:-

جَدِّدُوا إِيمَانَكُمْ، قِيلَ يَا رَسُولَ اللهِ كَيْفَ نُجَدِّدُ إِيمَانَنَا. قَالَ أَكْثِرُوا مِنْ قَوْلِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ (مسند احمد بن حنبل ۲/۳۵۹)

"اپنے ایمان کی تجدید کرو"۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ ہم کس طرح اپنے ایمان کی تجدید کریں آپ نے ارشاد فرمایا "لا الٰہ الا اللہ" کہنے (کے ذکر) کی کثرت کیا کرو"۔

جس طرح سے بعض اسباب و عوامل ایسے ہیں جو ایمان میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں اسی طرح سے بعض اسباب و عوامل ایسے ہیں جو ایمان میں کمی کا باعث بنتے ہیں۔ اور بعض باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے ایمان بالکل ختم ہو جاتا ہے اور انسان دائرۂ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ ان باتوں کو نواقض الایمان یا نواقض الشہادتین کہتے ہیں۔ ان میں سے چند کو ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

ا۔ غیر اللہ پر اعتماد و بھروسہ

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ہمیں یہ حکم فرمایا کہ ہم صرف اسی کی ذات پر بھروسہ کریں اور اسی پہ توکّل و اعتماد رکھیں۔ اُمورِ دنیا مادّی اسباب کے بغیر بظاہر سر انجام نہیں ہو پاتے، لیکن فی الحقیقت یہ دنیا مادّی اسباب پر قائم نہیں۔ مادّی اسباب میں تاثیر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہے۔ اصل مُسبّب اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اسی پر ہی بھروسہ رکھنا چاہیے۔ مومن کو عمل کرنے کا اور اسبابِ دنیوی و مادّی سے استفادہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان اسباب پہ مطلقاً بھروسہ نہ کرے۔ مومن و کافر میں بنیادی فرق یہی ہے کہ مومن بھی مادّی اسباب کو استعمال کرتا ہے لیکن کافر مادّی اسباب پہ بھروسہ رکھتا ہے اور مومن ان اسباب پہ توکّل و اعتماد نہیں رکھتا۔ اس کا توکّل و اعتماد صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پہ ہوتا ہے۔ اسباب و عوامل پر یوں بھروسہ کر لینا کہ ان کی مستقل تاثیر اور طبیعت کا قائل ہو جائے، یہی شرک ہے۔

جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کو پیدا کیا ہے، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے تمام اسباب و عوامل کو پیدا کیا اور ان کی تاثیرات اور طبیعتیں بھی پیدا فرمائیں، تو اصل سبب تو وہ خود ہُوا۔ ہر چیز، ہر عمل اور ہر سبب کے پس پردہ تو وہی کار فرما ہے۔ اس کا ارشاد ہے:

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (النساء: ۷۸)

"کہہ دو کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی ہے"۔

کافر کا مزاج یہ ہے کہ وہ ہر چیز کی ایک مستقل تاثیر اور اس کی طبیعت کا قائل ہے بلکہ وہ تو یہی سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ زمانہ و دہر کی طرف سے ہو رہا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان کا عقیدہ موجود ہے:

وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ (الجاثیہ: ۲۴)

"ہم کو تو زمانہ ہلاک کرتا ہے"

اُردو ادب میں بھی "فلک کج رفتار" اور "دہرِ ناہنجار" کی ترکیبات اسی بات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ لوگ دہر کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔

مشرکینِ عرب میں بھی یہ رواج تھا کہ جب انہیں خلافِ توقع کوئی تکلیف پہنچتی تھی تو زمانے کی شکایت کیا کرتے تھے اور زمانے کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا:

لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَاِنَّ الدَّهْرَ هُوَ اللّٰهُ تَعَالٰى (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

"زمانہ کو گالی مت دو، زمانہ خود اللہ تعالیٰ ہی ہے"

صحیح بخاری میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آدم کا بیٹا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے اور زمانہ کو بُرا کہتا ہے۔ زمانہ مَیں ہوں، میرے ہاتھ میں تمام کام ہیں، مَیں شب و روز کا انقلاب کرتا ہوں۔"

(صحیح بخاری، تفسیر سورۃ جاثیہ و کتاب الرد علی الجہمیہ، جلد ۲، ص ۱۱۱۶)

اس سے معلوم ہُوا کہ زمانہ اور اس کے اسباب و عوامل اپنے تئیں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ تمام اسباب و عوامل کے پسِ پردہ اللہ تعالیٰ کا ہی ہاتھ کارفرما ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

کہ "زمانہ تو مَیں خود ہی ہوں۔ مَیں ہی سب کچھ کیا کرتا ہوں۔"

فلک کو کج رفتار کہنا یا دہر کو ناہنجار کہنا یا فلکِ نیلی فام کی گردش کو گالیاں دینا سب جہالت و شرک کی باتیں ہیں جن سے صرف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انسان نے بے وقوفی سے زمانہ، اس کے اسباب و عوامل کی مختلف تاثیر و طبیعت پہ یقین کر لیا ہے اور ان سب اشیاء کے پسِ پردہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ

کو بھول گیا ہے۔

دیکھیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ صلح حُدیبیہ کے موقع پر اتفاق سے رات کو بارش ہوئی صبح کو نماز کے بعد حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم صحابہؓ کو مخاطب ہوئے اور فرمایا "جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا؟" صحابہؓ نے عرض کی کہ "خدا اور اس کا رسُول زیادہ جانتا ہے۔" ارشاد ہوا "اللہ تعالیٰ نے فرمایا آج صبح میرے بندوں میں سے کچھ مومن ہو کر اُٹھے اور کچھ کافر ہو کر۔ جنہوں نے کہا کہ خدا کے فضل و رحم سے ہم پر پانی برسا وہ تو خدا پر ایمان لانے والے ہیں اور ستارہ و نچھتر کے انکار کرنے والے ہیں اور جنہوں نے یہ کہا کہ فلاں نچھتر اور ستارہ کے اثر سے پانی ہم پر برسا تو وہ خدا کا انکار کرنے والے اور اس ستارہ و نچھتر پر ایمان لانے والے ہیں۔ (بخاری، کتاب الاستسقاء)

دیکھ لیجیے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اہلِ عرب کے اس عقیدہ کو مشرکانہ عقیدہ قرار دے دیا کہ وہ بارش کے عمل کو ستارے کی طرف منسوب کیا کرتے تھے کہ جب فلاں ستارہ فلاں برج میں پہنچ جاتا ہے تو بارش ہوتی ہے۔

ایک خوبصورت حکایت ہے کہ بادشاہ محمود غزنوی اپنے وفادار غلام ایاز سے بہت محبّت کرتا تھا اور اس پر بہت اعتماد رکھتا تھا۔ حاسدینِ ایاز نے بادشاہ کو اس کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی۔ ایک دن بادشاہ نے اپنے دربار میں بہت سے انعامات و اکرامات سجا دیئے اور درباریوں کے سامنے یوں کہا کہ آج جو شخص جس چیز پر ہاتھ رکھ دے وہ اسی کی ملکیّت ہو گئی۔ سب درباری اپنی اپنی پسند کی چیز کی طرف لپکے۔ کوئی ہیرے جواہرات کی طرف، کوئی پوشاکوں کی طرف۔ ایاز نے باآوازِ بلند کہا، بادشاہ اپنے وعدے پر قائم رہنا وہ آگے کو بڑھا اور یہ کہہ کر اس نے بادشاہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

مومن اور کافر کا بنیادی فرق یہی ہے جو فرق ایاز اور بادشاہ کے دوسرے درباریوں میں نظر آتا ہے۔ کافر اسباب و اشیاء کی طرف لپکتا ہے اور مومن اسباب و اشیاء کے پیدا کرنے والے کی طرف۔

کسی نے خوب کہا:

کچھ اور مانگنا میرے مذہب میں کفر ہے
لا اپنا ہاتھ دے میرے دستِ سوال میں

اور امیر مینائی نے کہا:

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

یہی بات قرآن مجید میں بار بار کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام اسباب کا سبب ہے وہی ذوالقوۃ المتین ہے۔ قوۃ واثر سب کچھ اسی کے پاس ہے۔ اور ان اسباب کو بہم پہنچانے والا بھی وہی رزاق ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ۔ (الذاریات: ۵۸)

"بے شک اللہ تعالیٰ ہی مستقل طور پر رزق بہم پہنچانے والا اور مضبوط ذی قوت و اثر ہے۔"

صحیح ایمان نہ ہونے کی وجہ سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں کامیابی اور ناکامی اسباب پر موقوف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی واضح طور پر نفی فرمائی اور کامیابی کو اپنی طرف منسوب کیا نہ کہ کثرتِ اسباب کی طرف۔ ارشاد ہے:

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (البقرہ: ۲۴۹)

"کتنے ہی ایسے گروہ ہیں جو تعداد میں کم تھے مگر ان لوگوں پر غالب آ گئے جو تعداد میں زیادہ تھے مگر یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہوا۔"

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ (الانفال: ۱۰)

"اور نصر و فتح تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے اسی کی جانب سے آتی ہے۔"

دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسباب کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ کے اذن کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ایک غزوہ میں کامیابی کے بعد اس بات کا امکان تھا کہ مسلمانوں میں اپنے ایمان، جذبہ، شجاعت اور جنگی مہارت پہ ناز پیدا ہو چنانچہ انہیں اسباب پہ توکل و اعتماد سے بچانے کے لیے فوراً پیش بندی کر دی گئی۔ کثرتِ اسباب تو کیا ان کی شجاعت، ان کے ہتھیار، حتٰی کہ ان کی ذات کی بھی نفی کر دی گئی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۚ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ۔ (الانفال: ۱۷)

"تم لوگوں نے ان کفّار کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے قتل کیا۔ اور اے محمدؐ جس وقت تم نے کنکریاں پھینکی تھیں تو تم نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔ اس سے غرض یہ تھی کہ مومنوں کو اپنے احسانوں سے وہ اچھی طرح آزمالے۔ بیشک اللہ تعالیٰ خوب سُنتا ہے جانتا ہے۔"

تو وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اسباب و عوامل کی مستقل تاثیر کا قائل ہو اور اسباب و عوامل پہ بھروسہ کرے وہ عملاً دائرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔

۲۔ مطلقاً غیر اللہ کے لیے عمل

کلمہ طیبہ پر ایمان اُس وقت بھی ختم ہو جاتا ہے جب انسان غیر اللہ کے لیے کسی ایسے عمل میں لگ جائے جس کی اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی طرف سے اجازت نہ ہو۔ وجہ ظاہر ہے کہ وہ عمل جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کیا جاتا ہے وہ عین عبادت ہے۔ اسی طرح سے وہ عمل جو غیر اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی اجازت شامل نہ ہو وہ عین شرک ہے۔

مثلاً کوئی شخص خالصتہً قومیت ۔۔۔ یا وطنیت کے لیے یا خالصتہً انسانیت کے لیے کوئی کام کرے اور اس میں مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول نہ ہو یا یہ کام دینِ اسلامی کی عام موافقت کے دائرے میں نہ ہوں تو یہ کام عین شرک ہوں گے اور نواقضِ ایمان میں شمار ہوں گے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن نہ تو وطن سے محبت کرتا ہے نہ قوم سے، نہ انسانیت سے اور نہ

کسی اور چیز سے۔ اس کی محبت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ ہاں وطن اور انسانیت کی محبت اگر اللہ تعالیٰ کی محبت کے تابع ہو اور تقاضائے مصلحتِ دینِ حنیف ہو تو پھر یہ عین عبادت ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمائی:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (الانعام: ۱۶۲-۱۶۳)

"کہہ دیجیے کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العلمین کے لیے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔"

تو مطلب یہ ہوا کہ قومیت، وطنیت اور حبِّ انسانیت جو کہ کلمۂ طیبہ پر ایمان کے تقاضوں کے تحت نہ آتے ہوں، سب کے سب نعرہ ہائے مشرکانہ ہیں۔ اسی طرح سے ادب برائے ادب کا نعرہ یا فرض برائے فرض اور علم برائے علم کا نعرہ یہ سب کے سب خالصۃً شرک ہیں۔

حبِّ وطن، حبِّ قوم، حبِّ انسانیت، ادب، فرض اور علم اگر یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے نہیں ہیں تو غیر اللہ کی رضا کے لیے ہیں یا کسی طاغوت کی خاطر ہیں؟

انسان کی زندگی کا ہر عمل خواہ چھوٹا ہو یا بڑا خالصۃً اللہ تعالیٰ کے لیے اور اس کی رضا کی خاطر ہونا چاہیے۔ اور ہر وہ چیز جو اسے اللہ تعالیٰ کی رضا سے ہٹا کے کسی غیر کی رضا کی طرف لے جاتی ہے وہ اس کے لیے بدرجۂ صنم ہے۔ یہی بات بعض علماء نے ان الفاظ میں کہی ہے:

مَنْ شَغَلَكَ عَنِ اللّٰهِ فَهُوَ صَنَمُكَ

"جو چیز تجھے اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے وہی تیرا بُت ہے اور تو اُس کا پجاری۔"

مومن کا نعرہ یہ ہے:

اِلٰهِيْ اَنْتَ مَقْصُوْدِيْ وَرِضَاكَ مَطْلُوْبِيْ۔

"اے اللہ تو ہی میرا مقصود ہے اور تیری رضا مجھے مطلوب ہے۔"

۳۔ غیر اللہ کی اطاعت

نواقضِ ایمان میں سے یہ بھی ہے کہ انسان اللہ کی اجازت کے بغیر اس کے احکام کے برخلاف غیر اللہ کی اطاعت کرے۔ لا الٰہ الا اللہ کے معنی میں سے اہم معنی یہی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت و اطاعت کے لائق نہیں۔ دنیا میں مومن جس شخص کی بھی اطاعت کرتا ہے وہ اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تابع ہوگی حتیٰ کہ رسول اللہ کی اطاعت بھی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء: ۸۰)

"جو شخص رسول اللہ کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی"

اسی طرح سے وہ شخص یا وہ حاکم جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیتا ہے اس کی اطاعت بھی اللہ تعالیٰ کی ہی اطاعت ہوگی۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (النساء: ۵۹)

"مومنو، خدا اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرو اور جو تم میں سے صاحبِ حکومت ہیں ان کی بھی۔ اور اگر کسی بات پہ تم میں اختلاف واقع ہو جائے تو اگر خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول کے حکم کی طرف رجوع کرو۔"

اور یہ بات واضح طور پر بتا دی گئی کہ اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے دائرے سے نکل کر کسی بھی غیر اللہ کی تم نے اطاعت کی تو تم دائرۂ ایمان سے نکل جاؤ گے اور کفار میں شامل ہو گے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ۔ (آلِ عمران: ۱۰۰)

"اے اہلِ ایمان اگر تم اہلِ کتاب کے کسی فریق کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں ایمان لانے

کے بعد کافر بنا دیں گے۔"

اسی طرح سے وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ کے اوامر و نواہی کی پروا نہ کی اور نہ ان کو ضروری سمجھا بلکہ اپنے ذاتی نظریات و افکار یا اپنی خواہشات کا پابند ہو گیا تو اس میں بھی اس نے اپنی ذات کو اپنا معبود ٹھہرا لیا اور دائرہ ایمان سے خارج ہو گیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۔

(الجاثیہ: ۲۳)

"بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے؟ اور باوجود جاننے بوجھنے کے گمراہ ہو رہا ہے تو خدا نے بھی اسے گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور خدا کے سوا اس کو کون راہ پر لا سکتا ہے۔ بھلا تم کیوں نصیحت نہیں پکڑتے۔"

یہی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قاعدۂ کلیہ کے طور پر ارشاد فرما دی:

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ۔

"خالق کی نافرمانی کرتے ہوئے کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔"

جو اس قاعدۂ کلیہ سے منحرف ہو گیا تو کلمۂ طیبہ سے اس کا ایمان ختم ہوا۔

۴۔ غیر اللہ کو حاکمیت یا قانون سازی کا حق دے دینا

جو شخص کسی بھی غیر اللہ کو خواہ وہ حکومت ہو یا کسی کی شخصیت یہ حق عطا کر دے کہ وہ جس چیز کو چاہے حلال ٹھہرا دے، جس چیز کو چاہے حرام ٹھہرا دے، جس سے چاہے منع کر دے جس کی چاہے اجازت دے دے تو وہ شخص دائرۂ ایمان سے خارج ہو گیا۔ امر و نہی کا حق اور حاکمیت مطلق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہے اور اس میں کسی کو شریک نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح سے قانون بنانے کا حق بھی صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اس کا ارشادِ گرامی ہے۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف: ۵۴)

"دیکھو سب مخلوق بھی اسی کی پیدا کی ہوتی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے"

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (یوسف: ۴۰)

"یاد رکھو کہ خدا کے سوا کسی کی حکومت و حاکمیّت نہیں ہے۔ اُس نے ارشاد فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے"

اس آیت میں دو باتیں قابلِ غور ہیں:

ایک تو یہ کہ اس میں عبادت کو کسی کی حاکمیت تسلیم کرنے یا کسی کو قانون ساز تسلیم کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

دوسرا یہ کہ اکثریت کے بارے میں یہ فیصلہ دے دیا کہ یہ بے علم لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

اب وہ لوگ جو مطلقاً مغربی جمہوریّت پر یقین رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اکثریّت کو حاکمیت کا حق ہے یا اقتدارِ اعلیٰ عوام کا حق ہے تو وہ اسی زُمرے میں شامل ہوتے ہیں اور ان کا عقیدہ قرآن مجید کے اس واضح حکم سے ٹکرا جاتا ہے کہ:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف: ۴۰)

"حاکمیت اور قانون سازی کا حق تو بس اللہ تعالیٰ ہی کو ہے"

اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل ارشاد پر بھی غور کرنا چاہیے:۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (التوبہ: ۳۱)

"انہوں نے اپنے اَحبار اور رُہبان کو اللہ کے سوا اپنے رب ٹھہرا لیا"

جیسا کہ ہم پہلے تشریح کر چکے ہیں کہ وہ لوگ اپنے علماء اور احبار کو سجدے نہیں کیا کرتے تھے بلکہ جس بات کو وہ حلال ٹھہرا لیتے اسے یہ بھی حلال قرار دیتے اور جس بات کو وہ حرام قرار دیتے انہیں یہ بھی حرام قرار دیتے۔ یعنی انہوں نے بعض لوگوں کو قانون سازی کا حق دے دیا تھا اور یہی اللہ کے

سوا دوسروں کو رب ٹھہرانا ہے۔

واضح رہے کہ اسلام نظامِ شوریٰ کی اجازت دیتا ہے مگر اس میں حاکمیت صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ہوتی ہے۔ اسلام کسی بھی حالت میں اکثریتِ عوام کو حاکمیت کا حق نہیں دیتا اور نہ وہ نیک اور فاجر کو ایک ہی مقام پر لا کھڑا کرتا ہے جیسا کہ مغربی جمہوریت میں گدھا اور گھوڑا بالکل برابر ہیں۔

ہر وہ نظام جو غیر اللہ کی حاکمیت کی طرف لے جاتا ہے وہ خالص کفر ہے اس لیے کہ اس میں تشریع اور قانون سازی کا حق غیر اللہ کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے جس کو غیر اللہ حلال قرار دے دے وہ حلال اور جس کو غیر اللہ حرام قرار دے دے وہ حرام ٹھہرتا ہے اور یہ کفر صریح ہے۔

۵۔ غیر شرعی و غیر اسلامی نظام پہ رضامندی :-

وہ شخص جو غیر اسلامی قانون یا غیر اسلامی نظام میں اس طرح زندگی گزارتا ہے کہ اس کے جی میں کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی اور غیر شرعی نظام پہ وہ دل و دماغ کی ہم آہنگی کے ساتھ راضی ہے اس شخص کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور وہ کلمۂ طیبہ پر کوئی ایمان نہیں رکھتا۔

اسی طرح سے وہ شخص جو کہ اسلامی نظام میں تو زندگی گزارتا ہے لیکن دل ہی دل میں وہ شرعی قوانین کے خلاف گھٹتا رہتا ہے اور شرعی قوانین کو وہ خلافِ عقل سمجھتا ہے وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (المآئدہ : ۴۴)

"وہ لوگ جو کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی لوگ کافر ہیں"

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔ (النساء : ۶۵)

"اے محمدؐ، تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں"

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ - وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا - وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَى مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا - (النساء: ۶۰-۶۱)

"اے نبی، تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں۔ حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں۔"

تو وہ لوگ جو کہ مسلمان ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو صاحبِ ایمان کہلوانے پہ مُصر ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ غیر شرعی احکام کے نفاذ پہ راضی ہیں اور غیر اسلامی نظام مثلاً سرمایہ دارانہ نظام، اشتراکیت، بے دینی، الحاد، مادیّت وغیرہ پہ دل سے راضی ہیں وہ لوگ فی الحقیقت دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔

اسی طرح سے جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی عطا کردہ ہدایت مکمل نہیں ہے اور اس کے مقابلے میں دیگر نظام ہائے زندگی بہتر یا زیادہ مکمل نظام پیش کرتے ہیں تو وہ شخص بھی بلاشبہ کافر ہے۔

۶۔ نواقضِ ایمان میں سے یہ بات بھی ہے کہ کوئی شخص مجموعی طور پر اسلام کو پسند نہ کرے، یا اسلام کی کسی ایک چیز کو ناپسند کرے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعْسًا لَهُمْ وَأَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ - (محمد: ۸-۹)

"وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تو ان کے لیے ہلاکت ہے اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جسے اللہ نے نازل کیا ہے لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے۔"

چنانچہ کسی آیتِ قرآنی کے مضمون یا کسی صحیح حدیث کے مضمون یا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی کسی سُنّت (قول، عمل یا تقریر) کو ناپسند کرنا دائرۂ ایمان سے خارج ہونا ہے۔ اسی طرح سے جو شخص کتاب وسُنّت پہ عمل کرنے والوں کا مذاق اُڑاتے یا شعائرِ اسلام میں سے کسی چیز کو نشانۂ استہزاء بناتے وہ بھی ایمان واسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ ؟ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ۔

(التوبہ: ۶۵-۶۶)

"اگر ان سے پوچھو کہ تم کیا باتیں کر رہے ہو تو جھٹ کہہ دیں گے کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے تھے ان سے کہو" کیا تمہاری ہنسی دل لگی اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول ہی کے ساتھ تھی؟ اب بہانے نہ تراشو، تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے"؟

اسی طرح سے وہ شخص جو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ سوئے ادب سے پیش آتے وہ بھی دائرۂ ایمان سے خارج ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ۔

(الحجرات: ۲)

"اے لوگو جو ایمان لاتے ہو اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ نبی کے ساتھ اونچی آواز سے بات کیا کرو۔ جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔"

۷۔ اسلام کا ظاہر و باطن الگ الگ ماننا

یہ دعویٰ رکھنا بھی انسان کو دائرۂ ایمان سے خارج کر دیتا ہے کہ قرآن و سُنّت کا ایک باطن ہے اور ایک ظاہر۔ اور اس کا باطن اس کے ظاہر کے برعکس ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ (یوسف: ۲)

"ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم اس کو اچھی طرح سمجھ سکو۔"

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔ (القمر: ۲۲)

"ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان ذریعہ بنا دیا ہے۔ پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟"

وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ۔ (النحل: ۱۰۳)

"اور یہ صاف اور واضح زبان عربی ہے۔"

زبانِ عربی کی یہ خاصیّت ہے کہ وہ اپنے قواعد اور مفردات کے اعتبار سے بہت معروف ہے۔ اور گنجلک نہیں ہے۔ جو شخص بھی قرآن و سُنّت کا فہم حاصل کرے گا وہ عربی زبان کے انہی قواعد اور مفردات کے ذریعے سے کرے گا۔ اور جو شخص اس سے ہٹ کے قرآن و سنت کی تشریح و توضیح کرنا چاہے گا وہ غیر قرآن اور غیر سُنّت کی طرف متوجہ ہو گا۔ اور قرآن و سُنّت کے دائرے سے خارج ہو جائے گا۔

۸۔ اصل توحید سے گھبراہٹ

نواقضِ شہادتین میں سے یہ بھی ہے کہ عملاً اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک ٹھہراتے، یا اس کا دل اللہ تعالیٰ کی توحید سے گھبراتے اور اسے شرک کی کسی نوعیت میں قرار جان حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ

وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ - (الزمر: ۴۵)

"جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کڑھنے لگتے ہیں اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکایک وہ خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔"

ہم دیکھتے ہیں کہ جب بعض واقعات کی توجیہ کرتے ہوئے یوں کہا جاتے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو بعض لوگ چین بجبیں ہوتے ہیں۔ وہ یا تو دنیوی اسباب کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں یا ان واقعات کی نسبت اولیاء اللہ اور اصحابِ قبور کی طرف کرتے ہیں۔

وہ شخص جو اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان واسطے ٹھہراتے اور ان واسطوں سے براہِ راست دُعا کرے اور ان پہ بھروسہ کرے وہ اللہ سے شرک کرنے والا ہے اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

اسی طرح سے جو شخص غیر اللہ کے لیے ذبح کرے یا غیر اللہ کے لیے رکوع وسجود کرے یا بیت اللہ کے علاوہ کسی اور جگہ عبادت کا سا طواف کرے یا غیر اللہ کے لیے نذر مانے یا غیر اللہ کی قسم کھائے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ " (الانعام: ۱۶۲-۱۶۳)

"کہو میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العلمین کے لیے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔"

۹۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت سے محرومی

انسان دعوائے ایمان کے ہوتے ہوتے ایمان سے خارج ہوتا ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت سے بالکل ہی کورا ہو یا اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات افعال اور حقوق میں سے کسی کا انکار کرتا ہو۔ وہ لوگ جو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات کی طرف کوئی نقص اور خرابی محمول کریں اور اس بات کی معرفت نہ رکھتے ہوں کہ کمالِ اصلی صرف اسی کو زیبا ہے اور دنیا میں جو کچھ بھی موجود ہے اسی کے فعل کا نتیجہ ہے۔ وہ شخص بھی اللہ تعالیٰ کی معرفت سے عاری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ۔ (الحج: ۷۴)

"ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ پہچانی جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوت و عزت والا تو صرف اللہ ہی ہے"

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِیْنٌ۔ (الزخرف: ۱۵)

"(یہ سب کچھ جانتے ہوئے اور مانتے ہوتے بھی) ان لوگوں نے اس کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جزو بنا ڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلا احسان فراموش ہے"

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (المائدہ: ۷۳)

ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ تین میں سے ایک ہے"

اللہ تعالیٰ کی معرفت کا نہ ہونا ہی شرک باللہ کا اصل سبب ہے۔ اس لیے کہ انسان جب اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات اور اس کے کمال و افعال اور حقوق سے ناواقف ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ باتیں منسوب کر دیتا ہے جو اس کی ذات کے لائق نہیں ہوتیں۔ یا اللہ تعالیٰ کو مخلوق میں سے کسی کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے، یا مخلوق میں سے کسی کو اللہ تعالیٰ کا جزو ٹھہرا دیتا ہے اور غیر اللہ کو یوں پکارنے لگتا ہے گویا کہ اسے نفع و ضرر کا مالک سمجھنے لگتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّیْهِ اِلَی الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ (الرعد: ۱۴)

"اسی کو پکارنا برحق ہے۔ رہیں وہ دوسری ہستیاں جنہیں اس کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ انہیں پکارنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس سے درخواست کرے کہ میرے منہ تک پہنچ جا۔ حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں۔ پس اسی طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں ہیں مگر ایک تیر بے ہدف"

۱۰۔ رسول اللہ کی صحیح معرفت سے محرومی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح معرفت کا نہ ہونا بھی نواقضِ ایمان میں سے ہے۔ بلکہ انسان اس وقت تک دائرۂ ایمان میں داخل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ کی معرفت نصیب نہ ہو۔ لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض ایسی صفتیں جو کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں وہ ان سے سلب کر لیتے ہیں اور اپنے خیال میں ان صفات کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نامناسب خیال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں۔ اور کچھ لوگ حضور کو بشر قرار دینا ان کی شان میں گستاخی قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح سے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے علاوہ کسی اور کی تعلیم، افکار و نظریات دورِ حاضر میں زیادہ مناسب اور زیادہ کامل ہیں۔ یا کچھ لوگ ایسے ہیں جو طاغوت کے حکم کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پہ ترجیح دیتے ہیں۔ یا یوں کہتے ہیں کہ وہ صرف عربوں کے لیے یا اس دور کے لیے نبی تھے۔ کچھ لوگ دوسری طرف یوں انتہا میں گم ہو جاتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو الوہیت کے قریب کر دیتے ہیں۔ اور آپ کی بشریت اور عبدیت سے بالکل انکار کر دیتے ہیں۔ یہ سب کی سب صریح کفر کی باتیں ہیں۔ جن لوگوں میں یہ باتیں پائی جائیں وہ دائرۂ ایمان سے خارج ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ (الاحزاب: ۲۱)

"تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں بہترین نمونۂ عمل ہے۔"

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ۔ (الانبیاء: ۱۰۷)

"ہم نے تو آپ کو تمام جہانوں کے لیے سراپا رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (سباء: ۲۸)

"ہم نے آپ کو تمام کے تمام انسانوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کے

بھیجا ہے۔"

اسی طرح سے جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے علاوہ کسی دوسرے کی دعویٰ کردہ نبوت کی پیروی شروع کر دے وہ بھی دینِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خارج ہو جاتا ہے اس لیے کہ حضورِ اکرمؐ کے بعد کوئی شخص نبی نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ (الاحزاب: ۴۰)

"مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔"

۱۱۔ دین کا عملاً ترک کرنا

وہ شخص جو اللہ کے دین سے عملاً منہ موڑ لیتا ہے نہ دین کا علم حاصل کرتا ہے نہ اس پہ عمل کرتا ہے اور نہ اس کی کوئی ضرورت محسوس کرتا ہے اور اپنے مستقبل میں دین سیکھنے سکھانے یا اس پہ عمل کرنے کا کوئی پروگرام نہیں رکھتا وہ فی الواقع مسلمان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ۔ (السجدہ: ۲۲)

"اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جس کے سامنے اس کے پروردگار کی آیات کا ذکر کیا جائے اور وہ اس سے مُنہ موڑ لے۔ بے شک ہم لوگ مجرم لوگوں سے انتقام لینے والے ہیں"

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔

(الفرقان: ۳۰)

"اور (قیامت کے دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہیں گے کہ اے میرے پروردگار یہ ہیں میری قوم کے وہ لوگ جنہوں نے قرآن مجید کو چھوڑ دیا تھا"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ (النسائی، صلاۃ، ۸)

"جس شخص نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی وہ کافر ہو گیا"

اسی قسم کی وعید زکوٰۃ چھوڑنے والوں کے لیے ہے۔ چنانچہ سیدنا ابوبکر صدیق نے ان لوگوں کے ساتھ باقاعدہ جنگ کی جنہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا۔ بالکل اسی طرح کی وعید حج اور جہاد چھوڑنے والوں کے لیے بھی ہے کہ وہ بھی دائرۂ ایمان سے خارج ہو جاتے ہیں اور اس قابل ہیں کہ مسلمان ان کے ساتھ جنگ کریں۔

۱۲۔ کفّار و مشرکین سے تعاون

جو شخص مسلمانوں کے مقابلے میں مشرکین کی امداد کرتا ہے اور ان کا ساتھ دیتا ہے وہ بھی فی الحقیقت دائرۂ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس پہ دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔

(المائدہ: ۵۱)

"اور تم میں سے جو کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی انہی میں ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔"

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا۔ اَلَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا۔

(النساء: ۱۳۸-۱۳۹)

"اور جو منافق اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو رفیق بناتے ہیں ان کو مژدہ سنا دو کہ ان کے لیے دردناک عذاب تیار ہے۔ کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں حالانکہ عزت ساری کی ساری صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔"

تو ظاہر ہوا کہ مومنین کے لیے دل میں محبت کا نہ ہونا اور کفّار کے لیے دل میں محبت و عظمت کا ہونا ایمان کی نہیں بلکہ کفر کی دلیل ہے۔

۲۔ مسلمانوں کی تکفیر یا کفّار کی عدمِ تکفیر

جو شخص مشرکین کو کافر نہ قرار دے یا ان کے کفر میں شک کرے یا ان کے مذہب کو صحیح قرار

دے اور اس کے برعکس اہلِ ایمان کو کافر ٹھہرائے اور ان کے ساتھ جنگ کو جائز قرار دے وہ بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

اصولی بات یہ ہے کہ کفر کو کفر نہ قرار دینا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ اسی طرح سے ایک مومنِ صادق کو کافر قرار دینا بھی کفر ہے۔ اس لیے کہ اس میں نفسِ ایمان پہ طعن ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يَرْمِ رَجُلًا بِالْفِسْقِ أَوْ بِالْكُفْرِ إِلَّا ارْتَدَّتْ عَلَيْهِ إِنْ لَمْ يَكُنْ صَاحِبُهُ كَذٰلِكَ۔ (اخرجہ البخاری)

"کوئی شخص کسی دوسرے شخص پہ فسق یا کفر کا الزام نہ لگائے۔ اگر یہ الزام غلط ہوا تو خود الزام لگانے والے پر ہی لوٹ آئے گا۔"

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ
وَالسَّلَامُ عَلٰى خَاتَمِ الْمُرْسَلِيْنَ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ
وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ



کتابیات

۱ — ابن تیمیہ، احمد حرانی، مجموع فتاویٰ، دار العربیہ، بیروت، ۱۳۹۸ھ

۲ — آزاد، ابو الکلام مولانا، غبارِ خاطر، لاہور، مطبوعاتِ چٹان، ۱۹۶۳ء

۳ — جان کلوور مونزما، خدا موجود ہے، لاہور، مقبول اکیڈیمی، ۱۹۷۰ء

۴ — عبد المجید زندانی، کتاب التوحید (عربی)، قطر، رئاسة المحاکم الشرعیہ، ۱۹۷۷ء

۵ — غلام جیلانی برق، ڈاکٹر، عظیم کائنات کا عظیم خدا، لاہور، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، ۱۹۷۷ء

۶ — 〃 〃 〃 〃، میری آخری کتاب، لاہور، مکتبہ شاہکار، ۱۹۷۷ء

۷ — کریسی مارلیسن، اے، خدا ہمارے ساتھ ہے، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۵ء

۸ — مودودی، سید ابو الاعلیٰ، مولانا، تفہیم القرآن، لاہور، مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۷۳ء

۹ — 〃 〃 〃 〃 تفہیمات، 〃، اسلامک پبلیکیشنز، ۱۹۷۳ء

۱۰ — موریس بکائیے، بائبل، قرآن، سائنس، کراچی، ادارۃ القرآن، ۱۹۸۱ء

۱۱ — وحید الزمان خاں، الاسلام یتحدی (عربی)، بیروت، دار البحوث العلمیہ، ۱۹۸۱ء

۱۲ — ولی اللہ، امام محدث دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، کراچی، اصح المطابع، سن ندارد

۱۳ — عبد المجید زندانی، الایمان (عربی) المدینۃ المنورۃ، مکتبہ طیبہ، ۱۹۸۳ء، ۱۹۸۳ء

۱۴ — عبد الحکیم سکھروی، کیا خدا ہے، کراچی، اقبال اینڈ اقبال، ۱۹۷۴ء

۱۵ — سلیمان بن عبد اللہ، آل الشیخ، تیسیر العزیز الحمید (عربی) شہر ندارد، مکتبہ سلفیہ، سن ندارد

۱۶ — عبد الرحمٰن بن حسن آل الشیخ، ہدایۃ المستفید اردو ترجمہ فتح المجید، لاہور، انصار السنۃ المحمدیہ، سن ندارد

۱۷ سعید حوی، اللہ جل جلالہ، دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۷۹ء

۱۸ دائرۃ المعارف اردو، پنجاب یونیورسٹی ۔لاہور

19. Ferm, Vergilius — History of Philosophical Systems, Ames, IOWA, Lilve field, Adams & CO.1950

20. Halepota, A.J.Dr. — Philosophy of Shah Wali Ullah, Lahore, Sind Sagar Academy.

21. Iqbal, Muhammad, Dr. — Reconstruction of Religious Thought in Islam, Lahore, Sh.Muhammad Ashraf, 1950.





مصنّف کی دیگر تصانیف

- شاہ ولی اللہ کی مابعد الطبیعات
- مقصدِ حیات اور اس کا حصول
- وجودِ باری تعالےٰ اور توحید
- وجود اللہ سبحانہ والتوحید (عربی ترجمہ)
- نشری تقریریں
- عظمتِ شہید
- THE ENCYCLOPEDIA BRITANNICA BETWEEN IGNORANCE AND DISHONESTY.
- انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا میں اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بہتانات (اردو ترجمہ)
- دائرۃ المعارف البریطانیہ بین الجہل والتضلیل (عربی ترجمہ)
- احیائے دین کی اساس۔
- حقیقتِ دعا۔
- توبہ کی حقیقت۔
- THE PHILOSOPHY OF SIN IN ISLAM.
- HUMAN CAPITAL, A NEGLECTED RESOURCE.
- ISLAM AND THE WELFARE STATE.
- CRISIS OF IDENTITY.



